مختصر

تاریخ ادب اُردو

بعد مزید ترمیم و اضافہ

پروفیسر ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب

ایم اے ڈی لٹ

صدر شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی

آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی

عرضِ حال

اُردو پڑھتے پڑھاتے وقت اکثر یہ کمی محسوس ہوئی کہ اس زبان میں تاریخ ادب پر کوئی ایک ایسی کتاب نہیں جو اس کی ابتدائے آفرینش سے آج تک کا حال بتا سکے کوئی کتاب امیر و داغ کے واقعات تک پہنچتے پہنچتے خاموش ہو جاتی ہے اور اگر کوئی چند قدم آگے بڑھتی بھی ہے تو موجودہ دور کے نثر نگاروں کا ذکر کیا ہے شعراء کی بھی خاصی تعداد پر انفرادی حیثیت سے کوئی تبصرہ و تنقید نہیں ہو سکی اور شاید ابھی تو اس وقت تک کوئی کتاب ہی نہیں جو تاریخی لحاظ سے نثر نگاری کے سلسلہ میں موجودہ دور کے طرز تحریر وغیرہ پر روشنی ڈال سکے

اس کمی کی شکایت صرف انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے طلبا تک محدود نہ تھی ایم اے کے طلبا نے بھی بارہا کلاس کے ساتھ اسی بات کو کہا بلکہ سچ پوچھئے تو ادبی خاص طبقوں میں بھی اس قلت کا تذکرہ اکثر زبان اور قلم سے ہوتا رہا ہے اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے میں نے قلم اٹھایا میری کامیابی، ناکامیابی، کتاب کی خوبی و خرابی کا فیصلہ بالکل پڑھنے والوں کی رائے پر ہے مجھے کسی بات پر اصرار نہیں نہ کچھ کہنا ہے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جس کمی کو پورا کرنے کی میں نے کوشش کی تھی وہ پورے طور سے آپ کی خدمت میں پیش کر سکا اور اس احساس پر حسرت بھی ہے لیکن اس کی حسرت بھی رہ گئی کہ اختصار کی وجہ سے بہت سی ایسی باتوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور کر دیا گیا جن کے لکھنے کے لئے بہت جی چاہتا تھا

اُردو زبان کی تخریج اور ارتقا کے متعلق مختلف نظریئے جو مختلف ارباب قلم نے پیش کئے ان کو دیکھتے ہوئے کہا کرتا ہے کہ مجھے خود تسلی نہیں ہوئی اور سچ پوچھئے تو میں بھی تخریج کے متعلق کسی قطعی نتیجہ پر اس وقت تک نہیں پہنچا تھا جب اس کتاب کا ابتدائی حصہ پریس بھیجا گیا اگر ممکن ہو تو میری دوسری تصنیف کا انتظار فرمائیے جو اُردو زبان کی ابتدا و تخریج اور ارتقا کے لئے

عفویں ود کی شاید وہ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچنے کے لئے سہارا دے سکے یہاں اس امر پر کسی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں

اس مختصر تاریخ ادب اردو میں اختصار کا پہلو حالاتِ زندگی لکھتے وقت اور تنقید کلام کے موقع پر بھی مد نظر رہا ہے تنقید میں قریب قریب ہر جگہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظر انداز نہ ہو لیکن بات کو بڑھایا بھی نہ جائے اگر ممکن ہو تو پارہ کو جملہ میں اور جملہ کو چند لفظوں میں پر معنی طریقہ سے بیان کر دیا جائے بعض انگریزی داں طبقہ میں اردو ادب کی تاریخ و تنقیدی کتابوں پر یہ بھی اعتراض تھا کہ اردو والے تنقید کے وقت چند الفاظ چن لیتے ہیں اور ہر شاعر یا نثر نویس کے کلام پر ترتیب بدل کر وہی الفاظ لکھ دیتے ہیں گویا یہاں امتیازی خصوصیت ہے ہی نہیں یہ اعتراض نہ بالکل صحیح ہے نہ بالکل غلط، بعض کتابیں ایسی ہیں کہ جن کو پڑھ کر آپ مصنفین کی انفرادی حیثیت کا اندازہ کر سکتے ہیں لیکن بعض ایسی بھی ہیں جن سے اس قسم کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا میں نے غالباً ہر موقع پر اس کا خیال رکھا ہے کہ ہر مصنف کی امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائے

یہ کتاب اب سے دو سال پہلے شائع ہو چکی ہوتی مگر لوگوں کے حالاتِ زندگی کی فراہمی میں اتنی دقتیں پیش ہوتیں کہ شاید کتاب لکھنے میں اتنی مصیبتوں سے دوچار نہیں ہونا پڑا خود بھی خط لکھے دوسروں سے بھی لکھوائے مگر بہت کم حضرات نے اتنی زحمت گوارا کی کہ اپنے حالاتِ زندگی لکھ کر روانہ فرمائیں مجھے شاید اس کی شکایت کم ہوتی کہ حالاتِ زندگی لوگوں نے دینا پسند نہیں کئے ان کی خبر ہے ان کو اچھا ہے، دقت تو یہ ہوتی تھی کہ لوگ تحریری و زبانی برابر وعدہ کرتے رہے کہ انشاء اللہ بہت جلد سوانح عمری بھیج دوں گا مگر یہ "انشاء اللہ" بھی "وعدۂ فردائے کربلا" ثابت ہوا اور مجھے انتظار میں اس قدر زحمتیں اٹھانا پڑیں یہ تجربہ اتنا تلخ ہوتا گیا کہ آخر کار فیصلہ کرنا پڑا کہ جن حضرات کے حالاتِ زندگی بہت آسانی سے مل جاتیں انہی کی سوانح عمری لکھی جائے مگر اس سلسلہ میں ان حضرات سے ندامت کے ساتھ معافی کا خواستگار ہوں جن کو میں نے سوانح عمری بھیجنے کی زحمت نہیں دی اور کتاب میں بھی نہیں لکھ سکا

موجودہ ادبا کے کلام کی ترتیب میں کوئی التزام نہیں رکھا گیا ہر مصنف کے متعلق مواد

جمع ہوتا گیا پریس میں بھیج دیا گیا بعض ایسے شعراء کا ذکر لکھنے سے رہ گیا ہے جن کے متعلق مجھے لکھنا
چاہیئے تھا مگر افسوس ہے کہ باوجود تلاش کے اُن کا کلام اتنی مقدار میں دستیاب نہ ہو سکا کہ
رائے قائم کرنے کے لئے کافی ہوتا اگر ممکن ہوا تو آئندہ ایڈیشن میں انشاءاللہ تلافی کردی جائے گی
فی الحال معذور سمجھ کر مجھے معاف کر دیا جائے

تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ تاریخ لکھنا تنہا ایک آدمی کے بس کی بات نہیں مجھے ایسے چند
خاص احباب و کرم فرماؤں کا شرمندۂ احسان ہونا پڑا جن میں ایک ذات تو ایسی ہے کہ جن کے
ابرِ کرم کی بارش سے اکثر میری کشتِ اُمید کو سرسبز ہونے کے لئے زیرِ بارِ منت ہونا پڑتا ہے
حامد علی صاحب قبلہ میرے لئے صرف صدر شعبۂ اُردو ہی نہیں بلکہ استاد و شفیق بزرگ بھی ہیں
جن کے لئے میری رہنمائی فرض ہو یا نہ ہو مگر اُن کی طبیعت کسی حال میں یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ
اُن کے امکان میں ہو اور راہِ بہبودی و ترقی میں میرے ساتھ ادب کو لغزش ہو جائے اس کتاب
کے سلسلہ میں جب کبھی میں نے کسی امداد کی درخواست کی ہے نہایت فراخ دلی اور ہمت افزائی
کے ساتھ آپ نے توجہ فرما کر میری مشکل حل کرنے کی کوشش کی ہے آپ کی ذات اور
قابل قدر کتاب "تاریخ ادب و زبانِ اُردو" سے میں نے جو فائدہ اُٹھایا ہے اُس کا
بے حد ممنون ہوں

اسی سلسلہ میں اپنے دوست پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراق کا بھی شکریہ ادا
کرتا ہوں جن کی مغربی فن تنقید کی معلومات نے میری اس کتاب میں اصولِ تنقید کے
لحاظ سے بہت کچھ دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے موصوف نے ہر موقع پر جب کبھی میں نے تکلیف
دی ہے نہایت ہی خندہ پیشانی و کشادہ دلی کے ساتھ لبیک کہا اُن کی قیمتی رائے اور
دردسری کا اعتراف نہ کرنا میرے لئے ممکن نہیں غالباً آپ کا یہ احسان میں کبھی بھول نہ
سکوں گا

ایک بزرگ کا شکریہ ادا کر چکا ایک برابر کے دوست کی عنایتوں کا بھی ذکر کر چکا
ایک مشکل سوال میرے لئے یہ ہے کہ اپنے چھوٹوں کا شکریہ کیونکر ادا کروں اول تو دنیا
نے کوئی طریقہ اس کا مقرر نہیں کیا اگر کیا بھی تو میں نے سیکھا نہیں اور پھر دوسری دقت

نہ ہو کہ جن لوگوں کا شکریہ ادا کرنا ہے ان کی غیور طبیعت یہ بھی تو گوارا نہیں کرتی کہ میں شکریہ
ادا کروں مگر میرا ضمیر مجھے مجبور کرتا ہے کہ ان لوگوں کا کم سے کم ذکر تو کر ہی دوں۔ میرے چند
عزیز شاگرد (جن کو اب دوست بھی سمجھنا چاہیے) اس تصنیف میں ہر وقت میرا ہاتھ نہایت
خوشی کے ساتھ بٹاتے رہے۔ سید حامد حسن صاحب بلگرامی ایم اے، سید وقار عظیم صاحب ایم اے
ریسرچ اسکالر اور سید احتشام حسین صاحب بی اے جس محبت و محنت کے ساتھ اس کتاب کے
لیے جانفشانی اٹھاتے رہے وہ صرف قابلِ قدر ہی نہیں بلکہ میرے لئے مایۂ ناز بھی ہے۔ اُن
کی سعادت مندی و قابلیت اور ادبی شغف کو دیکھ کر بے ساختہ دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدا
ہر استاد کو ایسے شاگرد نصیب کرے۔ ان لوگوں نے نہ صرف پروف ہی پڑھا بلکہ مواد بھی
اکٹھا کیا اور بعض مضامین کو ترتیب بھی دیے۔ ان تمام باتوں کا احساس خود اپنی جگہ پر ایک
شکریہ ہے۔ اس میں ان کی خاطر سے اگر شکریہ یا اس قبیل کا کوئی لفظ نہ بھی استعمال کروں تو
پڑھنے والے میرا مطلب خود سمجھ لیں گے

آج اردو ادب کے ہر مورخ کو تہ دل سے اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس دلچسپ
مگر دشوار کام میں وہ اپنے پیشرو متعدد تذکرہ نویسوں اور اُن کے بعد اُردو ادب کے پہلے
مورخین و نقادوں کا ممنون احسان ہے۔ مجھے بھی فرض شناسی مجبور کرتی ہے کہ اس سلسلہ
کے اہلِ قلم کا دل سے شکریہ ادا کروں کیونکہ جس طرح ادب اپنی روایات و سرمایۂ قدیم کا
بار اٹھا کے آگے بڑھتا ہے اسی طرح تنقید و تاریخ ادب بھی اپنے پہلے کے مواد و مثال
کو پیش نظر رکھ کر ہی ترقی کیا کرتی ہے

اعجاز حسین

نشیمن، الہ آباد
۱۴ نومبر ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

حصۂ نظم

حصۂ نثر

باب ۱

(۱)

زبان کی ابتدا

دنیا کی زبانوں کے میل جول سے کبھی کبھی ایک نئی زبان پیدا ہو جاتی ہے مگر دو چار سال میں نہیں بلکہ صدیوں میں اُردو زبان بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں عربی فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے باہمی اختلاط سے اس کا وجود ظہور میں آیا

ہندوستان میں آریہ قوم تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح آئی یہاں دراویڈی قوم کا علاقہ تھا جو اُن سے بہت پہلے ہندوستان آچکے تھے آریاؤں نے دراوڑوں کو دھکیل کر پیچھے کر دیا اور اُن کو مغلوب کرکے سنہ ۱۰۰۰ قبل مسیح تا ۶۰۰ قبل مسیح شمالی ہندوستان میں پنجاب سے بنگال تک پھیل گئے ہندوستان میں پہلے ہی سے مختلف علاقوں میں مختلف بولیاں تھیں آریہ لوگ جب تک محدود علاقہ میں رہے اُن کی زبان اپنی جگہ پر قائم رہی لیکن جیسے جیسے وہ پھیلے گئے زبان میں فرق آتا گیا کچھ آب ہوا کی وجہ سے کچھ دوسری زبانوں کے میل جول سے تلفظ اور الفاظ میں رد و بدل ہوتا گیا یہاں تک کہ ان کی زبان کی مرکزی حیثیت بہت کم رہ گئی ۶ قبل مسیح میں کوشش ہوئی کہ زبان کو منظم کرکے ایک حیثیت دے دی جائے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے اصول یہ رکھا گیا کہ مقامی تعصبات سے الگ ہوکر صرف ایسے الفاظ کو ٹکسالی مانا جائے جو سب جگہ رائج ہوں اس اصول پر کاربند ہوکر لوگ ایک خاص ٹکسالی زبان استعمال کرنے لگے اور یہ زبان پاک صاف ہوکر سنسکرت کہلائی سنسکرت کو بڑا عروج ہوا مگر ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں ادبیت اتنی زیادہ آتی گئی

کہ عوام سے الگ ہو کر خاص طبقہ کی چیز ہو کر رہ گئی اور یہی سبب خاص طور سے اس کے
زوال کا بھی ہوا دوسرا سبب اس کے زوال کا یہ ہوا کہ گوتم بدھ اور مہاویر نے اپنے
اپنے اپنے مذہب کی ترویج مقامی بولیوں میں کی عوام نے ان کے عقائد اور طریقوں
کو بہت پسند کیا مذہب کا سہارا پا کر صوبائی زبانیں حیاتِ انفس اور ترقی کرنے [illegible]
کرنے لگیں ہندو مذہب کے پرستار اپنی زبان یعنی سنسکرت کی حفاظت سختی سے کرنے
لگے نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت عوام سے بالکل الگ ہو کر صرف ایک طبقہ کی زبان ہو گئی۔
ہندوستان کے عوام کی زبان شروع ہی سے ایک مخلوط زبان تھی کھوٹ سے
وقت کے مختلف خطوں میں مقامی زبانیں رائج تھیں اور وہ برابر چلتی رہیں۔ ان
زبانوں کو پراکرت کہتے ہیں ہم کو پراکرت کا پہلا نمونہ ۲۵ قبلِ مسیح اشوک کی
لاٹوں میں ملتا ہے یا پھر بدھ یا جین مت والوں کی مذہبی کتابوں میں نظر آتا ہے اسی
پراکرت کی ادبی شکل کا نام پالی ہے جس کو بدھ مذہب کے ہاتھوں فروغ ہوا
نیز اس وقت کہ جب اس پر شورسینی (متھرا اور اس کے ارد گرد کے علاقہ کی زبان)
کا اثر پڑا تھا سنسکرت کے ساتھ پراکرت کا بھی پہلو بہ پہلو ارتقا ہوا اور ہرش وردھن
اور راشٹرکوٹوں کی فتوحات کے ذریعہ سے دکن کی زبان بھی ترقی کرتی رہی

سنسکرت کی طرح بعض بعض پراکرتیں بھی کبھی کبھی ادبی حیثیت اختیار کر لیتی
تھیں کہ عوام اُن کے استعمال سے گریز کرنے لگتے تھے اور پھر ایک ملی جلی زبان کو ایک خاص
انداز میں پیش کر کے ایک نئی زبان تیار کر لیتے تھے جس میں وہ اپنا مفہوم آسانی سے ادا
کر سکیں اسی طریقہ پر ایک زبان اپ بھرنش کا بھی وجود ہوا چنانچہ جب عوام نے ادبیات
سے گھبرا کر اپنے طور پر ایک ملی جلی بولی کا استعمال شروع کیا تو اس کو اہل زبان حقارت
کی نظر سے دیکھنے لگے اور اس کا نام اپ بھرنش رکھا جس کے معنی بگڑی زبان[1] کے ہیں

---

[1] تاریخ زبان اُردو (ڈاکٹر مسعود حسین۔ سنہ ۴۵ء، صفحہ ۹۳)

اپ بھرنش عوام کی رہنمائی میں بڑھتی رہی بالآخر اس میں زندگی کے آثار دیکھ کر تعلیم یافتہ طبقہ
بھی اس کی طرف مائل ہوا ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بھی اس کا اثر لیا خاص طور پر
گجراتی، راجپوتانہ اور دوآبہ کی بولیاں اس سے زیادہ متاثر ہوئیں راجپوتوں کے سیاسی
اقتدار کی وجہ سے اس کو بھی اتنا فروغ ہوا کہ ۸۰۰ء سے لیکر ۱۰۰۰ء تک دوآبہ کی
شورسینی اپ بھرنش تمام شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی موجودہ اردو یا کھڑی بولی
(۲) اپ بھرنش [illegible] سے نکلی اس کے وجود میں وہ اپ بھرنش کار فرما ہوئی جو دلی، میرٹھ
اور ان کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھی۔ اسی زبان کی قسم وہ بھی ہوئی مغربی ہندی
بھی۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے پنجاب میں رائج تھی

۱۰۰۰ء کا زمانہ ایسا ہے کہ جس کے بعد افغانستان کے راستے سے برابر
مسلمان بادشاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوتے ان کا مرکز زیادہ تر پنجاب رہا اس سے
پہلے محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی تھی وہاں
عربی و فارسی کے الفاظ برابر استعمال ہونے لگے تھے محمود غزنوی وغیرہ کے زمانے میں
اور اس کے بعد بھی الفاظ کی رد و بدل ہوتی رہی عربی و فارسی الفاظ ہندوستان کی
زبانوں میں اور عربی و فارسی میں ہندوستانی زبانوں کے الفاظ بڑی تیزی سے بڑھتے
گئے جس کا نتیجہ نکلا کہ لوگ ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے نئی زبان کا دائرہ
وسیع تر ہو گیا یہاں تک کہ فارسی اور ترکی کے شعراء ہندوستانی زبان میں بھی شعر کہنے
لگے چنانچہ خواجہ مسعود سعد سلمان جن کا انتقال ۱۱۲۵ء اور ۱۱۳۰ء کے درمیان
ہوا ہے علاوہ ترکی و فارسی زبانوں کے ہندوستانی زبان کے بھی شاعر تھے جن کا ثبوت
محمد عوفی اور امیر خسرو کی کتابوں سے ملتا ہے مگر خواجہ مسعود سعد سلمان کے کلام کا نمونہ
دستیاب نہیں ہو سکا اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے ہندوستان کی کس زبان میں
شعر کہے ہیں لیکن قیاس یہ ہے کہ غالباً لاہوری زبان رہی ہوگی لاہور کے بجائے

دہلی کو دارالسلطنت بنانے پر اس وقت تک کے لسانیاتی اندوختہ کو بھی ترمیم کرنا پڑا
سنہ ۱۲۰۶ء میں جب قطب الدین ایبک نے دہلی کو دارالسلطنت بنایا تو یہاں
کی زبان بجائے لاہوری کے دہلوی تھی جو کئی زبانوں سے متاثر ہو کر اپنی ایک انفرادیت
مسلمانوں سے قبل راجپوتی عہد میں قائم کر چکی تھی وہ نہ تو خالص بھاشا تھی نہ خالص کھڑی
بولی بلکہ اس عہد کی قدیم اپ بھرنش سے روایات میں جکڑی ہوئی زبان تھی جس پر
راجستھانی اور برج بھاشا کا اثر نمایاں تھا

ہندوستان کی جدید بولیوں کی پیدائش صحیح معنوں میں ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔
اس لئے سولہویں صدی سے زیادہ پرانے نمونے نہیں مل سکے لیکن یہ ماننا پڑتا ہے
کہ اسی دہلوی زبان کی بنیاد پر اُردو کا وجود قائم ہوا جو زیادہ تر اپ بھرنش کا اثر لئے
ہوئے تھی پنجاب سے مسلمان فارسی آمیز پنجابی بولتے ہوئے دہلی آئے دہلی میں اور
اس کے آس پاس ان کی مڈبھیڑ کئی بولیوں سے ہوئی ہے آس پاس کے علاقوں میں
ایک طرف پرانی کھڑی بولی اور دوسری طرف پرانی ہریانی بولی جاتی تھی جو کہ کسی سلسلے
میں مشرقی پنجابی زبان جو انہیں دونوں بولیوں کے زیر اثر پیدا ہوئی تھی اس لئے
پنجابی بولنے والوں کو برج بھاشا کی بہ نسبت کھڑی بولی اور ہریانی اپنے سے زیادہ
قریب دکھائی دی [۱] [illegible] کی صوتیات اور صرف و نحو کو پنجابی سے ملتا جلتا
پایا اس قرب کی وجہ سے ان کی نظر انتخاب برج بھاشا کے بجائے انہیں بولیوں پر
پڑی جسے وہ بہت جلد بولنا سیکھ گئے دہلی بار بار ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری
جگہ آباد ہوتی تھی چنانچہ شاہ جہاں کے وقت میں دہلی کئی میل ہٹ کر شمال میں بسائی
گئی تھی جس کی آبادی آگرہ کے آنے والوں سے بھی بسی تھی ان آنے والوں کی بولی
برج بھاشا تھی اس لئے برج بھاشا کا اثر اس نئی بولی پر زیادہ پڑا نتیجہ یہ ہوا کہ

۱؎ تاریخ زبان اُردو مصنفہ ڈاکٹر مسعود حسین

کہ اُردو سے پنجابی کا اثر روز بروز کم ہوتا گیا لب و لہجہ بدلنے لگا اور ہندوستانی کا اپنا معیار اس وقت قائم ہوا جب وہ ایک طرف تبدیل۔ لٹا گڈی کے بجائے بادل لوٹا گاڑی استعمال کرنے لگی

محمود غزنوی کے زمانے سے ہندوستان کے بعض الفاظ ہم کو فارسی کے مستند شعراء کے یہاں ملنے لگتے ہیں مثلاً فردوسی نے ایک شعر میں کوتوال کا لفظ استعمال کیا ہے جو خالص ہندی لفظ ہے "کوٹ" اور "والا" سے مرکب ہے (کوٹ = قلعہ اور والا کا مطلب والی معنی مالک)۔

محمود غزنوی کے لڑکے سلطان مسعود غزنوی کے زمانہ کا فارسی شاعر منوچہری کے یہاں "لنگس" اور حکیم سنائی کے یہاں "پانی" کا لفظ شعر میں آیا ہے۔ اسی طرح پرتھوی راج کے زمانے میں بھی بہت سے لسانی شعراء کے یہاں بے شمار عربی و فارسی الفاظ ملنے لگتے ہیں لیکن الفاظ کے علاوہ جملے بہت کم ملتے ہیں کوئی ایسی چیز نہیں لکھی ملتی جو مسلسل عبارت کے ساتھ اس نئی زبان کا نمونہ پیش کر سکے صوفیوں اور سادھوؤں کے اقوال البتہ کہیں کہیں ملتے ہیں امیر خسرو کا اس زبان میں اشعار کہنا تو تسلیم کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ انہوں نے اپنی فارسی مثنویوں میں ہندی زبان، ہندی اشیاء کی دل کھول کر تعریف کی ہے اور علاوہ اس کے خود ایک جگہ لکھا بھی ہے کہ میرا ایک دیوان ہندی میں بھی ہے لیکن یہ دیوان نایاب ہے کسی نے دیکھا نہیں جو اشعار، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں ان سے منسوب کی جاتی ہیں وہ محل گفتگو ہیں کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ یہ کلام واقعی امیر خسرو کا ہے اس لئے اس کو پرانی اردو کا نمونہ سمجھنا خطرہ سے خالی نہیں بہرحال الفاظ اور فقروں کے نمونے ہمیں محمود غزنوی، پرتھوی راج وغیرہ کے مصنفین اور بزرگانِ دین کے قصص سے برابر ملتے آتے ہیں جن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک نئی زبان روز بروز نمایاں ہوتی جارہی تھی۔

اس زبان کی ترویج میں فوجیوں کا بھی بہت کچھ حصہ ہے یہ نئی زبان ابتدا میں
برج بھاشا، اور کھڑی بولی اور راجستھانی سے مل کر چلتی ہے لیکن بعد میں کھڑی بولی پر
زیادہ سے زیادہ زور دیتی ہے اس زور کا بڑا سبب فوجیوں کا ملک میں پھیلنا تھا سلاطین
دہلی کی فوج میں بھرتی انبالہ، کرنال، حصار اور دہلی کے جنوب میں میوات کے علاقہ
سے کی جاتی تھی[1] گریرسن نے انہیں اضلاع کی ہندوستانی (کھڑی بولی) کو معیاری
اور ادبی اُردو سے قریب تر بتایا ہے یہ زبان فوجیوں کی آمد و رفت سے ہندوستان
کے گوشہ گوشہ میں پھیل رہی تھی اور اس کی اہمیت و عزت تیزی سے بڑھ رہی تھی
دہلی کی مرکزیت اور اس کے تمدن کا اثر تمام ہندوستان پر ہو رہا تھا اس کا تمدن،
اس کی تہذیب سارے ملک میں وقعت سے دیکھے جاتے تھے اس کی زبان کو بھی
لوگ دلچسپی سے سننے اور بولنے کی فکر کرتے تھے ہندوستان میں گوتم بدھ ہی کے
زمانے سے مذہبی پیشواؤں نے اپنے خیالات کی اشاعت ملک کی عام فہم زبانوں
میں کی تھی، اس وقت یعنی سلاطین دہلی کے زمانے میں بھی صوفیائے کرام اور دوسرے
رنگ کے دین کا یہی رویہ رہا چنانچہ علاوہ اور لوگوں کے لسانی تحریک میں ہم کو سب
سے زیادہ مدد کبیر داس کی تحریک اور شاعری سے ملتی ہے

کبیر داس کا زمانہ ۱۴۴۰ء سے ۱۵۱۸ء تک ہے کبیر داس کے کلام میں
ملی جلی زبان ملتی ہے جس میں کھڑی بولی برج بھاشا، راجستھانی اور کبھی پنجابی
کے اثرات نمایاں ہیں غرض کہ اس نئی زبان یعنی اُردو کا ارتقا عوام کے ہاتھوں ہوتا
رہا۔ ہندوستان کی مختلف مروجہ زبانوں کو سمیٹ کر ایک نیا جامہ تیار ہو رہا تھا گویا
بقول ڈاکٹر مسعود حسین کثرت میں وحدت کا نقش اُبھر رہا تھا کبیر کے یہاں بھی
سے تمام بولیوں اور بازاری الفاظ اور محاورے مل جاتے ہیں کبیر کی تقلید لسانی گروہ بانک سے

---

[1] بحوالہ تاریخ زبان اُردو مصنفہ ڈاکٹر مسعود حسین ص ۴۳

بھی کی چنانچہ ان کے یہاں بھی فارسی و عربی الفاظ وغیرہ بہت کافی تعداد میں ملتے ہیں یہاں بھی گرامر کا ڈھانچہ وہی ملتا ہے جو کبیر کے یہاں پایا جاتا ہے کھڑی بولی کے اسماء و افعال اور ضمائر بے تکلف استعمال کئے گئے ہیں اور بعد میں اسی کی گرامر پر زور دے کر اردو کا ڈھانچہ تیار ہوا اس لئے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ اردو زبان نہ برج بھاشا سے ہی نہ پنجابی سے بلکہ مخلوط زبانوں سے متاثر ہو کر کھڑی بولی پر اس نے اپنی بنیاد قائم کی یہ نئی زبان اپنی مقبولیت کی وجہ سے برابر ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ جب بابر ہندوستان آیا تو یہ زبان ایک صورت اختیار کر چکی تھی ممکن ہے کہ اس کے ہمراہی شروع شروع اس زبان کو نہ سمجھے ہوں لیکن بابر نے اپنی دلچسپی کا ثبوت بہت جلد دیدیا اور اس نے ایک شعر اسی زبان میں کہہ دیا

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی

فقرا ہلیغہ بس بولغوسیتو پانی و روٹی

یہ زبان اپنی انفرادیت کو لے کر آگے بڑھ رہی تھی بابر کے بعد ہمایوں کے دربار میں بھی اسی کا چرچا تھا لیکن اکبر کے وقت میں اس کی ترقی کو صدمہ پہنچا کیونکہ اکبر نے اپنی حکومت کا مرکز بعض مصلحتوں سے زیادہ تر آگرہ کو رکھا جہاں برج بھاشا اور راجستھانی بولیوں کا اثر تھا اور چونکہ متھرا میں مذہب کی وجہ سے برج بھاشا کا گہرا اثر تھا اور نہ علاوہ آگرہ سے قریب تھا اس لئے اس نئی زبان کی نشوونما میں برج بھاشا اور راجستھانی سد راہ ہوئیں اسی زمانے میں شاہی محلوں میں راجپوت رانیاں تھیں دربار میں ہندی سنگیت کا دور تھا اور سنگیت کی اصطلاحات اور زبان پر برج بھاشا کا غلبہ تھا اس لئے بھی برج بھاشا کا اثر تیز ہوتا گیا چنانچہ اکبر سے جو دوہے منسوب کئے گئے ہیں وہ بھی برج بھاشا میں ہیں اور پھر اسی کے سپہ سالار عبدالرحیم خانخاناں

نے برج بھاشا میں اس پایہ کی شاعری کی کہ وہ آج بھی اس زبان کے بہت بڑے شاعر
سمجھے جاتے ہیں۔ دوسری طرف اس دور میں برج بھاشا کا یہ زور ہوا کہ کھڑی بولی جو اپنے
پاؤں پر کھڑی ہو رہی تھی کچھ دنوں کے لئے دب گئی لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کھڑی
بولی منظر سے الگ ہو گئی تھی۔ وہ اس زمانے میں بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ ثبوت
کے لئے یہ مثال کافی ہے کہ اکبر ہی کے عہد میں گنگ کوی نے ۱۵۷۲ء میں "چند چھند
برنن کی مہما" کھڑی بولی میں لکھی۔ اس کتاب کا ایک اقتباس پیش کر دینا مفید مطلب
ہوگا اس سے مثال ملاحظہ ہو[1]

"اکبر شاہ جی عام کھاس (عام خاص) میں تکھت (تخت) اوپر وراجمان ہو رہے
اور عام کھاس بھر رہا ہے جس میں تمام امراء آئے کورنش بجائے جہار کر کے اپنی
اپنی بیٹھک پر بیٹھ جایا کریں۔ اپنی اپنی مسل سے جن کی بیٹھک نہیں سو ریشم کے رسے
میں ریشم کی لومیں پکڑ کے کھڑے تاسیم (تعظیم) میں رہے۔"

اس اقتباس میں فارسی عربی اور سنسکرت کے الفاظ کے میل جول کے علاوہ گرامر
بھی قابل غور ہے۔ اب ہم زبان کی پیدائش پر غور کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھڑی
بولی متوسطی اپبھرنش سے پیدا ہوئی اور برج بھاشا کے ساتھ ساتھ اپنی ارتقائی منزل
طے کر رہی تھی بلکہ برج بھاشا سے کچھ قبل ہی وہ سلاطین دہلی کے ابتدائی عہد میں
ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اکبر کے زمانے سے اس کھڑی بولی کو صدمہ پہنچتا
ہے۔ برج بھاشا کو عروج حاصل ہوتا ہے سنسکرت کے الفاظ زیادہ آنے لگتے ہیں
تلسی داس اسی ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ جب شاہ جہاں نے آگرہ چھوڑ کر دلی
آباد کی تو دہلوی زبان کو پھر عروج ہوا کیونکہ یہاں وہی زبان رائج تھی جس کا ذکر
ہم اوپر کر چکے ہیں یعنی کھڑی بولی جس پر تھوڑا بہت اثر برج بھاشا، پنجابی، راجستھانی

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۳۲۶ بحوالہ تاریخ زبان اردو (مسعود حسین ص ۱۴۲)

کا بھی تھا لیکن بایں ہمہ کھڑی بولی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی اور عوام میں اُسی کا
غلبہ تھا اور اب شاہ جہاں کے آنے سے اس کا زور اور زیادہ ہو گیا غالباً اسی
وجہ سے اُردو کو شاہ جہاں سے زیادہ قریب سمجھ کر شاہ جہانی اُردو کہا جاتا ہے
دہلی کی فضا میں اس وقت کھڑی بولی اسا قدم جاری تھی گو برج بھاشا بھی آگرہ سے
دہلی گئی لیکن رفتہ رفتہ اس کا اثر کم ہو گیا اور کھڑی بولی کو عروج حاصل ہوتا گیا
کھڑی بولی نے اپ بھرنش کی قدیم ادبی روایات اور پنجابی اثرات کا جوا اپنے سر
سے اُتار پھینکا اس وقت کے کئی ایک ہندی لکھنے والوں کی زبان کے نمونے
ایسے ملے ہیں جن میں ہوا ہے بس کر۔ کر رہا ہے ہوتا ہے دیکھا ہیں وغیرہ کو دیکھ
کر ہی ہندوستانی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ زبان تیزی کے ساتھ مقبولیت حاصل
کر کے برج بھاشا کو بھی پیچھے ڈھکیل دیتی ہے اور نگ زیب کے زمانے میں اس
زبان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اس کا نام اُردوئے شاہی
بھی کہیں کہیں ملنے لگتا ہے۔

اب مسلمان شعراء نے عبدالرحیم خانخاناں کی طرح برج بھاشا کی شاعری
کو ترک کر کے اسی اُردوئے شاہی کو اپنانا شروع کیا برج بھاشا اور فارسی دونوں
کو اس نئی زبان نے پیچھے کر کے اپنا قدم آگے بڑھایا۔ ولی کے آنے سے بھی پہلے
یہاں اس نئی زبان نے شعر و شاعری کے لئے زمین ہموار کر دی تھی۔ یہ زبان عام
طور سے یہاں بول چال اور لکھنے پڑھنے والے حلقوں میں رائج ہو گئی تھی

شمالی ہندوستان میں تو اُردو زبان کا بیج اس طرح بویا گیا جیسا کہ آپ دیکھ
چکے ہیں مگر دکن میں کچھ اس سے مختلف طور پر اُردو کی نشو و نما میں کام ہوا
علاؤالدین خلجی کے زمانہ سے دکن پر شمال کے بادشاہوں کے حملے شروع ہو گئے
تھے آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا تھا ۱۳۲۹ء میں محمد تغلق نے شہر دہلی کو غیر

کو اپنا دارالسلطنت بنالیا یہ شہر اس کو اتنا پسند آیا کہ اُس نے حکم دے دیا کہ ہر شخص دہلی سے دکن چلا جائے شاہی حکم تھا ہر شخص مجبور تھا قریب قریب ساری آبادی دہلی کی دکن منتقل ہو گئی دہلی کے لوگ اپنے جان و مال کے ساتھ اپنی نئی زبان بھی لیتے گئے اس نئی زبان کا اثر اس تیزی سے ہوا کہ شمالی ہند بھی راہِ ترقی میں پیچھے رہ گیا دکن والوں نے اس زبان کو اپنے یہاں کی بولیوں میں شامل کر کے دکنی اُردو کا سا باب کھول دیا عوام و خواص اس میں دلچسپی لینے لگے یہاں بھی بزرگانِ دین کی مدد سے اس زبان کو فروغ حاصل ہوا ان بزرگوں نے اپنے خیالات کی اشاعت اور مذہب کی تبلیغ اسی نئی زبان میں کی جس سے نئی زبان کو مقبولیت کا اور سہارا مل گیا یہ زبان یہاں کچھ اس تیزی سے بڑھی کہ باوجود اس کے کہ شمالی ہند کے مقابلے میں یہ بہت بعد میں آئی تھی مگر وہاں سے زیادہ یہاں کامیاب ہوئی چنانچہ دکن میں اُردو کے تحریری نمونے اسی وقت سے ملنے لگتے ہیں جب شمالی ہند میں کہیں کوئی ادبی کارنامہ نہیں دکھائی دیتا دکن میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ اس زبان میں کبھی دور سے ملنے لگتا ہے چنانچہ بندہ نواز خواجہ گیسو دراز جو فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں گلبرگہ آئے ان کے تین رسالے تصوف کے متعلق اب تک موجود ہیں (۱) معراج العاشقین (۲) ہدایت نامہ (۳) رسالہ سہ بارہ زبان کا نمونہ ان کی ایک کتاب معراج العاشقین سے ملاحظہ فرمائیے۔

'اے عزیز د واصلانِ خدا سوں ملنا خدا ہونا یو دونوں بھی ہیں تو بات بہر سوں معراج کو خبر دے کر بندے کو سرفراز کر'۔

اسی دور میں ان کے علاوہ ان کے پوتے عبداللہ حسینی بھی اہلِ قلم تھے انھوں نے بھی نشاط العشق کا دکنی ترجمہ لکھا ہے اور اس کی شرح بھی لکھی ہے

اسی دور کا ایک اور مشہور شاعر نظامی بھی ہے جو سلطان احمد شاہ ثالث بہمنی

کے زمانے میں سلطان کا درباری شاعر تھا اس کی مثنوی کدم راؤ پدم اس کی یادگار ہے
بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ سلطنتیں ہوگئیں مگر اس وہاں کی
اشاعت کا سلسلہ برابر جاری رہا ہر عہد میں ہم کو ممتاز شعراء اور نثر نگار نظر آتے ہیں
چنانچہ فہرست اتنی لمبی چوڑی ہے کہ سب کا ذکر کرنا اس جگہ ناممکن ہے۔ ہم صرف خاص
خاص ادیبوں کا ذکر یہاں کریں گے تاکہ آپ کو دکن کی ادبی خدمات کا کچھ اندازہ
ہو سکے

شاہ میراں جی

اپنے وقت کے زبردست صوفی تھے اُن کا انتقال سنہ ۹۰۲ھ میں ہوا آپ کے
مریدوں کا حلقہ نہایت وسیع تھا وعظ و نصیحت میں عموماً دکنی زبان استعمال کرتے تھے
جو عام طور سے یہاں بولی اور سمجھی جاتی تھی کئی ایک تصانیف آپ کی یادگار ہیں جن میں
سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں۔ ان کی نثر کی کتابوں کا ذکر حصہ نثر میں آئے گا یہاں
ان کی نظموں کے تین مجموعوں کا ذکر کیا جاتا ہے

خوش نامہ:- ۱۱۷ شعر کی ایک مثنوی ہے (۲) خوش نغز ۲۷ شعر کی چھوٹی
سی مثنوی ہے (۳) شہادت التحقیق میراں جی کی سب سے زیادہ اہم اور طویل نظم
ہے اس میں ۵۶۳ شعر ہیں تصوف سے متعلق ہے اسلوب بیان اور زبان نہایت سادہ
اور سلیس ہیں

شاہ میراں جی کی نظموں کا موضوع تصوف ہے "ان کے کارنامے اگرچہ ادبی حیثیت
سے زیادہ اہم نہیں لیکن لسانی نقطۂ نظر سے بے حد وقعت حاصل ہے"[1]

---

[1] اُردو شہ پارے

شاہ بُرہان الدین جانم

شاہ میراں جی کے فرزند اور خلیفہ تھے باپ کی طرح صوفی اور صاحب علم تھے
۹۹۰ھ میں انتقال ہوا کئی ایک تصنیفات ان کی یادگار ہیں جن میں سے خاص خاص
حسب ذیل ہیں
وصیت الہادی ایک مثنوی ہے جس کا موضوع تصوف ہے

رمز الواصلین }
بشارت الذکر } ان دونوں میں تصوف کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے

ارشاد نامہ :- اس میں ڈھائی ہزار اشعار ہیں صوفیانہ اصطلاحات کو وضاحت کے
ساتھ بیان کیا گیا ہے نظم کا زیادہ حصہ مکالمہ کی صورت میں ہے۔

شاہ برہان الدین جانم کی کتابوں کا موضوع زیادہ تر تصوف ہے لیکن کبھی کبھی انھوں
نے دوہرے اور غزلیں بھی کہی ہیں اس لئے اپنے باپ سے زیادہ با مذاق شاعر سمجھے جاسکتے
ان طرز بیان کے لحاظ سے بھی ان کے کلام میں میراں جی کے کلام سے زیادہ سادگی
ہے حتی الوسع فارسی اور عربی الفاظ کو استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے[1]

نُصرتی

محمد نصرت نام اور نُصرتی تخلص تھا اورنگ زیب نے جب بیجاپور فتح کیا تھا
(۱۰۹۷ھ) تو یہ موجود تھے نصرتی کا باپ اپنے وقت کے لوگوں میں بہت باوقار و با اثر تھا

---

[1] دکن میں اُردو (بار سوم) ص ۱۴۷

چنانچہ نصرتی کی تعلیم و تربیت شاہی محل میں ولی عہد سلطنت علی عادل شاہ کے ساتھ ہوئی
جب علی عادل شاہ بادشاہ ہوا تو نصرتی کو ملک الشعرا کا خطاب عطا ہوا

نصرتی کی تین تصنیفوں کا پتہ چلتا ہے

گلشن عشق :۔ اس میں کنور منوہر اور مدھو مالتی کا قصہ نظم کیا گیا ہے

علی نامہ علی عادل شاہ کے واقعات کے علاوہ چند قصائد بھی اس میں شامل ہیں

تاریخ اسکندری

نصرتی کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے نصیر الدین صاحب ہاشمی فرماتے ہیں کہ "نصرتی کی مثنویاں اور قصائد کے دیکھنے سے اس کی قادر الکلامی کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے گلشن عشق میں، انسانی جذبات اور خیالات کی جس عمدگی سے ترجمانی کی گئی ہے اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی اس کے کلام کی رنگینی اور تشبیہ و استعارات کی ندرت واقعی قابل داد ہے[1]"

ہاشمی

سید میراں نام تھا ہاشمی تخلص بعض تذکروں میں ان کا سنہ انتقال ۱۶۸۸ء اور بعض میں ۱۶۹۷ء ہے[2] مادرزاد اندھے تھے

ہاشمی نے غزلوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے چنانچہ ان کا ایک دیوان غزلوں کا بھی ہے اس کے علاوہ ہاشمی نے مرثیہ بھی کہا ہے

ان کی ایک مثنوی یوسف زلیخا بہت مشہور ہے جس کو مصنف "دکن میں اردو" نے دیکھا ہے یہ کتاب ۱۶۹۹ء میں ختم ہوئی اس کا ایک نسخہ حرم کے کتب خانہ

---

[1] دکن میں اردو   [2] اردو شہ پارے

ہیں اور ایک اعلیٰ حیدر حسین دہلوی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے

سیوا

یہ ایک خاص پایہ کے شاعر تھے ان کا وطن گلبرگہ تھا ۱۶۸۰ء میں انھوں نے فارسی روضۃ الشہدا کا اردو زبان میں ترجمہ کیا مرثیہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے جس نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے اسی دور میں ایک اور شاعر رام راؤ تھے، جو مرثیہ گو تھے اور شاہی امرا میں داخل تھے

قطب شاہی دور

سلطان قلی قطب شاہ اس خاندان کا پہلا بادشاہ تھا ۹۱۶ھ میں اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اس کے بعد اس کو قتل کر کے اس کا بیٹا جمشید تخت پر بیٹھا اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سبحان جو ابھی نابالغ تھا تخت پر بٹھا یا گیا ان بادشاہوں کو سیاست اور حکومت نے مہلت نہ دی کہ اردو کی طرف التفات کرے اور کوئی کارنامہ اپنی یادگار میں چھوڑ جائے حالانکہ پہلا بادشاہ یعنی سلطان قلی قطب شاہ نہایت ہی علم دوست اور قابل آدمی تھا مگر ابھی تک یہ پتہ نہیں چلا کہ اس وقت کسی نے اردو نظم پر طبع آزمائی کی ہو

اردو کا پتہ اس خاندان کے چوتھے بادشاہ یعنی ابراہیم قلی قطب شاہ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے جس نے تیس سال تک نہایت شد و مد کے ساتھ سلطنت کی یہ بادشاہ علم پروری اور خوش اخلاقی میں شہنشاہ اکبر سے کم نہ تھا ہندوؤں سے

اُسے بھی اُنس تھا اکثر بہا یت ممتاز عہدوں پر ہندو مامور تھے اس کے دربار میں اہل کمال کا مجمع رہتا اور لوگ ادبی شغل میں مصروف رہتے اس زمانہ میں اُردو کی خاطر خواہ ترقی ہوئی

محمد قلی قطب شاہ

قطب شاہی حاکموں میں محمد قلی قطب شاہ غالباً سب سے زیادہ اور بلند پایہ بادشاہ گزرا ہے اس کا دورِ حکومت ۳۱ سال تک یعنی ۹۸۸ھ سے ۱۰۲۰ھ تک رہا اس کے دورِ حکومت میں سلطنت کو ہر طرح کا فروغ ہوا وہ خود ایک زبردست شاعر تھا اس کے کلام کا ذخیرہ بہایت وافر ہے جس کو اس کے بھتیجے اور جانشین سلطان محمد قطب شاہ نے اس کے مرنے کے بعد ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا اور ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر زور کی حدید ترتیب سے ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد نے شائع کر دیا ہے

محمد قلی قطب شاہ کا اسلوبِ بیان نہایت سادہ اور عبارت سلیس ہے اس کی شاعری مقامی خصوصیات سے مملو ہے ہندوستان کے رسم و رواج اور تہواروں پر اس نے کافی نظمیں کہیں یہاں کے میووں ترکاریوں پرندوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا اس کے کلام پر ہندی شاعری کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے اس کی غزلوں میں لطافت اور عاشقانہ عنصر بہت کافی ہے۔

کلیات قلی قطب شاہ میں ہم کو مثنوی قصیدہ ترجیع بند مرثیے۔ غزل سب ہی اصنافِ سخن ملتے ہیں جن کے مطالعہ سے اس کی قادر الکلامی اور شاعرانہ صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

وجہی

وجہی ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوئے اس قطب شاہ کا زمانہ حکومت سنہ ۹۵ھ ہجری سے سنہ ۹۸ھ ہجری تک ہے انھوں نے بچپن ہی سے شاعری شروع کر دی تھی اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ آخر وقت تک اپنے دور کے بڑے کامیاب شاعر سمجھے جانے لگے وجہی نے غالباً کسی اُستاد کے سامنے زانوئے ادب نہ تہہ کیا وجہی کی دو کتابیں قطب مشتری اور سب رس بہت مشہور ہیں قطب مشتری ایک مثنوی ہے جس میں بادشاہ قطب کی تعریف اور اس کے عشق کی داستان بڑی خوبی سے قلمبند کی گئی ہے مثنوی سنہ ۱۸ھ ہجری میں کہی گئی چنانچہ وجہی کا کہنا ہے کہ

تمام اس کیا دس بارا میں   سنہ ایک ہزار ہور اٹھارا میں

انجمن ترقی اُردو نے اس مثنوی کو شائع کر دیا ہے یہ مثنوی دکن کی بلند پایہ مثنویوں کے ہم پلہ نہیں لیکن اس لحاظ سے کہ بادشاہ وقت کی محبت کی کہانی ہے ایک طرح سے تاریخی حیثیت رکھتی ہے اس کے علاوہ اس مثنوی سے اس زمانہ کی طرز معاشرت و تمدن کا اچھا خاصا اندازہ ہو جاتا ہے اس مثنوی کی ضخامت تقریباً دو ہزار اشعار کی ہے اس مثنوی کے علاوہ وجہی نے غزل اور رباعی پر بھی طبع آزمائی کی ہے

سب رس وجہی کی بڑی اہم کتاب ہے جس میں دل کے پیرایہ میں تصوف کے مسائل نہایت خوبی سے ایک قصہ کے پیرایہ میں قلمبند کیے گئے ہیں انسانی جذبات کی کشمکش اس کتاب میں نہایت خوبی سے پیش کی گئی ہے اُردو میں غالباً نثر نگاری میں سب سے پہلی تصنیف ہے یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے نصیر الدین ہاشمی کی رائے ہے کہ یہ کتاب غالباً وجیہ الدین گجراتی کی تالیف کا ترجمہ ہے جس کو وجہی نے سنہ ۱۰۴۵ھ ہجری میں مرتب کیا

محمد قطب شاہ

سلطان محمد علی قطب شاہ کا بھتیجا تھا سنہ ۱۰۲۰ھ سے لے کر سنہ ۱۰۳۵ھ تک اس نے بادشاہت کی چچا کی طرح یہ خود بھی بڑا علم دوست اور اہل کمال کا سرپرست تھا خود بھی شعر کہتا تھا سبا بچہ دو دیوان اب تک موجود ہیں ایک فارسی میں ہے اور ایک اردو میں
محمد قطب شاہ کے کلام میں بھی لطافت و سادگی کافی ہے اس نے بھی رباعی و غزل وغیرہ پر طبع آزمائی کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے

شوقی

ان کا نام حسن تھا اور شوقی تخلص۔ ان کی بھی دو کتابیں اب تک موجود ہیں پہلی ایک رزمیہ مثنوی ہے اس کا نام ظفر نامہ نظام شاہ ہے جو ایک مشہور جنگ کی تاریخ ہے یہ جنگ وائی وجیا نگر رام راج اور دکن کے مسلمانوں میں ہوئی تھی اس مثنوی سے اس وقت کے تاریخی اور معاشرتی حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے
ان کی دوسری کتاب کا نام "میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ" ہے یہ مثنوی ایک عاشقانہ انداز میں ہے جس میں بادشاہ وقت یعنی محمد عادل شاہ کی شادی کا تذکرہ ہے

عبداللہ قطب شاہ

اس نے تقریباً پچاس سال تک حکمرانی کی یعنی سنہ ۱۰۳۵ھ سے سنہ ۱۰۸۳ھ تک حکومت

کا سلسلہ جاری رہا اس کے زمانہ میں اُردو ادب کا آفتاب دکن میں نصف النہار تک پہنچ گیا تھا یہ بادشاہ نہایت زبردست عالم اور شاعر تھا اس کا بھی کلام اس خاندان کے اور بادشاہوں کی طرح فارسی اور دکھنی زبان میں موجود ہے اس کا تخلص عبداللہ تھا اس کا کلام زبان کے لحاظ سے اس کے پیشرو محمد قطب شاہ سے زیادہ صاف ہے لیکن تخیل میں محمد قلی قطب شاہ کی شاعری سے کم رتبہ ہے امیر خسرو کی طرح کبھی کبھی عبداللہ کے کلام میں بھی فارسی عبارت اُردو کے ساتھ دست و گریباں نظر آتی ہے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو

گفتم کہ اے پری توں ہے فتنۂ زمانہ
گفتا کہ راست گفتی لے گھس بھرے سحانا
گفتم کہ در جہاں یا لیلیٰ ہوا ئی ہے توں
گفتا کہ من چہ مجنوں پائیں ہو تجھ دوانا

غواصی

یہ بھی سلطان محمد قطب شاہ کے وقت میں ایک ممتاز شاعر تھے ان کی دو کتابیں مشہور ہیں ایک کا نام "سیف الملوک و بدیع الجمال" ہے یہ مثنوی ۱۰۳۵ھ میں لکھی گئی اس میں تخمیناً دو ہزار اشعار ہیں اور دوسری مثنوی کا نام "طوطی نامہ" ہے اس میں ۱۲ ہزار اشعار ہیں یہ ۱۰۴۹ھ میں ختم ہوئی

غواصی نے غزل اور مرثیے بھی لکھے ہیں ان کے کلام میں ہندی الفاظ زیادہ پائے جاتے ہیں کلام سادہ اور تصنع سے پاک ہے مگر کافی دلکش ہے

ابن نشاطی

ابن نشاطی بھی اس دور کے مشہور شاعر ہیں ابتدا میں یہ نثر نویس تھے رفتہ رفتہ نظم میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے جو ان کے حیاتِ جاودانی کا باعث ہوئی "پھول بن" ان کی وہ مثنوی ہے جس پر ان کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے یہ تصنیف ۱۰۶۶ھ کی ہے زبان بیان کے لحاظ سے یہ نہایت قابل قدر مثنوی ہے رسوم و طرز معاشرت کو جا بجا بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے

ابوالحسن تاناشاہ

تاناشاہ نے قریب سترہ سال تک بادشاہت کی ۱۰۹۸ھ میں اس کے ساتھ قطب شاہی خاندان کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا وہ خود بھی شاعر تھا اور اس کے عہد میں اردو کے اور بھی شاعر تھے لیکن تاناشاہ کا کلام کسی کتاب کی صورت میں ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ محی الدین قادری زور تحریر فرماتے ہیں کہ اس کی معزولی اور قید کی تکالیف نے اس کی شاعری کو نہ تو ابھرنے ہی دیا اور نہ اس کی کچھ شہرت ہی ہوئی۔[1]

فائز

تاناشاہ کے دور کے شاعر ہیں ان کو ادب سے فطری شغف تھا ان کی ایک مثنوی

---

[1] اردو شہ پارے صہ ۱۱۶

"رضوان شاہ وروح افزا" نہایت دلچسپ اور دلکش ہے ان کے کلام میں ہندی کے بجائے فارسی الفاظ اور ترکیبیں کافی تعداد میں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تانا شاہ کے عہد حکومت میں فارسی کا دخل دکنی زبان میں کافی ہو گیا تھا۔

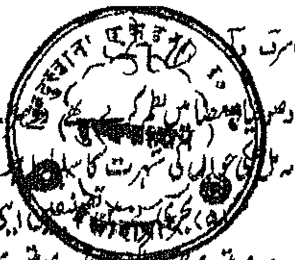
بحری

ان کا نام قاضی محمود تھا چونکہ باپ کا نام بحرالدین تھا اسی وجہ سے بحری تخلص کیا بحری کے سوانح حیات پردہ راز میں ہیں باوجود تحقیق و جستجو کے ابھی تک ان کی زندگی کے متعلق ان حالات سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہو سکا جو ان کی تصانیف "من لگن" وغیرہ کے دیباچے سے اخذ کئے جا سکتے ہیں

(۲) نصرت آباد کے نواح میں موضع گوگی کے رہنے والے تھے ۱۰۸۴ھ میں بیجاپور جاسے بیجاپور کی تباہی پر حیدرآباد کا رخ کرنا پڑا

(۳) بحری ولی کے ہمعصر تھے ان دونوں کے کلام میں زبان و بیان کی مشابہت پائی جاتی ہے بحری نے سنسکرت الفاظ ولی سے زیادہ استعمال کئے ہیں بحری روش دل صوفی بزرگ تھے اس لئے تصوف کی اصطلاحات ان کے یہاں بکثرت ہیں۔

(۴) بحری نے اپنے اشعار میں اعتراف کیا ہے کہ وہ فن شاعری اور اصطلاحات سخن سے واقف نہ تھے کسی استاد فن عالم یا شاعر سے استفادہ نہ کیا تھا لیکن پھر بھی بقول ڈاکٹر حفیظ سید صاحب وہ شاعرانہ حیثیت سے کسی طرح بھی ولی و نصرتی سے کم نہ تھے اس کے باوجود بھی وہ غیر معروف رہے حفیظ سید صاحب نے اس کی دو وجہیں بتائی ہیں اول تو بحری نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ گوگی میں گزارا جہاں وہ شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک خدا رسیدہ بزرگ کی حیثیت سے مشہور تھے وہ زیادہ تر مذہبی



دستیاب [illegible] میں نظر کرنے سے یہ کہ اور مشہور شعرا کی طرح ان کو شاہی سرپرستی نہ ملی [illegible] ان کی شہرت کا [illegible]

[illegible] اپنی یادگار چھوڑی ہیں ایک دیوان غزلیات، دوسری مثنوی [illegible] تیسری مثنوی جنگ نامہ۔

اشرف

اشرف اپنے وقت کے نہایت مشہور شاعر ہیں ان کی ایک مثنوی جس کا نام "جنگ نامہ" ہے اور جس میں حضرت علی کی لڑائیوں کا ذکر ہے برٹش میوزیم میں موجود ہے مصنف نے اس کا سنہ تصنیف ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۳ء کتاب کے خاتمہ پر بیان کیا ہے

اشرف نے مرثیے بھی کہے ہیں جن میں جذبات اور فطرت نگاری کو نہایت خوبی سے مد نظر رکھا ہے

اگن سوں ماتم شہ کے جلا ہے تن بدن میرا

برنگ برق تحریر سوز دل ہے ہر سخن میرا

ہوس گلگشت رضوان کی کرے کیوں عندلیب دل

محبت کی گلی میں شاہ دیں کے ہے وطن میرا

ولی

ولی اورنگ آباد کے رہنے والے تھے ان کا انتقال ۱۱۱۹ھ ہجری میں ہوا یہ اپنے وقت کے سب سے زیادہ مشہور شاعر تھے ایک زمانہ میں خیال تھا کہ یہ اردو کے

پہلے شاعر ہیں جن کا کلام دیوان کی صورت میں مل سکا ہے لیکن یہ خیال اب غلط ثابت ہو گیا اس لئے کہ محمد قلی قطب شاہ کا کلیات بھی مل گیا ہے اور چھپ بھی گیا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ تقریباً سو سال پہلے ولی کے مرا ہے اس لئے فی الحال اولیت کا سہرا اسی کے سر ہے

ولی اپنے دور کے سب سے زیادہ مشہور شاعر ہوئے ہیں ان کا احسان صرف دکن تک محدود نہ تھا بلکہ شمالی ہند کو بھی ان کی ذات سے فائدہ پہنچا ولی کو سیر و سیاحت کا کافی شوق تھا چنانچہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں دکن سے دہلی آئے تھے سورت اور احمد آباد بھی گئے تھے

کلیات ولی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی قریب قریب اُردو کے ہر صنف شاعری پر قادر تھے غزل، قصیدہ، رباعی، مستزاد، قطعہ، ترجیع بند، مثنوی کے علاوہ کچھ چیزوں پر اور بھی ولی نے طبع آزمائی کی ہے جس کے متعلق عبدالحق صاحب لکھتے ہیں "کہ قدیم زمانے میں بعض اصناف سخن ایسی رائج تھیں جو اب نہیں جیسے ثلاثی چار در چار بازگشت اور قریب قریب ہر صنف شاعری کو ولی نے نہایت خوبی اور کامیابی سے نباہا ہے۔

غزلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کے یہاں تغزل کے علاوہ اخلاقی مضامین وغیرہ موجود ہیں گو باتیں عموماً سیدھی سادی ہوتی ہیں مگر جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں وہاں تخیل کی گہرائی قابل دید ہوتی ہے خاص کر ان مقامات پر جہاں تصوف کے نکات بیان کرتے ہیں چونکہ خود صوفی مشرب تھے اور برسوں خانقاہوں میں رہ کر درس معرفت حاصل کر چکے تھے اس لئے معنویت کے ساتھ پر لطف طریقے سے رموز و حقائق قلم بند کرتے ہیں جس سے غزل میں ایک حال سی آجاتی ہے ولی کی زبان عموماً صاف و شیریں ہے مگر اپنے اور نامانوس الفاظ کے استعمال سے کہیں کہیں اُلجھن

ضرور ہوتی ہے لیکن اس کا شکوہ بیکار ہے بلکہ قابل قدر بات تو یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اتنے پرانے زمانے میں تھے انھوں نے فارسی کی خوبصورت ترکیبوں اور ہندی اور فارسی کے منتخب الفاظ کی آمیزش سے اپنے کلام کو اس طرح آراستہ کیا ہے کہ شگفتگی اور صفائی ہر جگہ نمایاں ہے یہاں تک کہ بعض اشعار پر دھوکا ہوتا ہے کہ شاعر آج کے کہے ہوئے ہیں

ولی کی غزلوں میں خارجی پہلو زیادہ ہے لیکن برجستگی اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے بیان میں مزہ کافی رہتا ہے چونکہ صاحبِ معرفت تھے لہٰذا دل کے سوز و گداز کا اثر کلام میں بھی نمایاں ہے اور سادگی بیان کی وجہ سے تاثیر دو بالا ہو جاتی ہے

ان کی تشبیہات و استعارات میں جدت ہے اور غالباً اس جدت کے لئے انھیں دقت بھی نہ اٹھانی پڑی ہوگی اس لئے کہ زبان ابتدائی حالت میں تھی جہاں سے چاہتے ہوں گے نئی چیزیں لے آتے رہے ہوں گے معشوق کی بعض اداؤں کا خیال کر کے اس کو بانکے پٹھان کہہ دیا ہے۔ اس کی مثال اردو شاعری میں کم ملے گی اور یہیں سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صاحبِ کمال معمولی سی چیز کو موقع سے ملا کر غیر معمولی بات پیدا کر دیتا ہے۔

ولی کے قصائد پر نظر ڈالنے سے حیرت ہوتی ہے کہ اس عہد میں جب زبان ابتدائی حالت میں تھی کیونکر انھوں نے اتنے زوردار قصیدے کہے ہوں گے جتنی خوبیاں قصیدے میں ہونی چاہئیں وہ سب ہی موجود ہیں شوکتِ الفاظ بھی ہے زور بھی ہے اور مشکل زمینوں کے ہوتے ہوئے روانی بھی بہت ہے ان کے قصائد میں محاکات عمدہ اور جدتِ ادا کے نمونے موجود ہیں ولی نے دلی میں آکر یہاں کی زبان کا اتنا اثر لیا کہ دکھنی زبان اور محاورات کو کم کر کے دہلی کی زبان اور

محاوروں کو اپنے کلام میں جگہ دینا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی الفاظ اور مقامی
اثرات جو اُردو زبان میں در آئے تھے وہ کم ہونے لگے اور فارسی الفاظ تخیل زیادہ
زور کے ساتھ اُردو میں داخل ہونے لگے چونکہ دہلی کے اس دور کے شعراء دکنی کے
کلام سے متاثر تھے اس لئے انھوں نے بھی یہی رنگ اپنی شاعری کو دیا نتیجہ یہ
ہوا کہ طرزِ تخیل اور طرزِ بیان دونوں میں فارسی کا اثر غالب ہوگیا ولی کے آنے
سے پہلے ہی شمالی ہند میں اُردو زبان اور شعر کا چرچا عام ہو گیا تھا یہاں بزمِ سخن
پہلے ہی سج چکی تھی ولی کی آمد نے اس بزم میں تازگی پیدا کر دی دکنی اُردو شعرا
کے ذکر کے بعد ضروری ہے کہ شمالی ہند کے اُردو ادیبوں کا بھی تذکرہ کیا جائے
چنانچہ اب یہاں سے ہم شمالی ہند کے شعرا کا تذکرہ پیش کریں گے

دکن کی ابتدائی خدمات

دکن میں زبان نے جس طرح ترقی کی اس کا مختصر ذکر کر دیا گیا اس کی تفصیل میں زیادہ پڑنا تحصیل حاصل ہے زبان سے ادب کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو ہمیں دکن کی جو ادبی خدمات نظر آتی ہیں ان کا اعتراف نہ کرنا ادبی ناانصافی ہوگی لیکن اس مختصر کتاب میں دکن کے سارے شاعروں اور ادیبوں کا مفصل ذکر بھی قریب قریب غیر ممکن تھا اس لیے ہم نے چند مخصوص شعرا کو لے کر ان کی ادبی خدمات کا مختصر ذکر کیا اس کے بعد اب یہ زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی تبصرہ کے طور پر ان اصناف شاعری کا ذکر کر دیں جن کی دکن میں ترقی ہوئی

اُردو میں شروع سے اب تک جن اصناف کا عموماً رواج رہا ہے ان میں غزل، قصیدہ مثنوی اور مرثیہ زیادہ نمایاں ہیں غزل ایسی چیز ہے جس پر قریب قریب ہر شاعر نے طبع آزمائی کی قصیدہ کم لوگوں نے کہا مثنویاں کافی تعداد میں لکھی گئیں مرثیوں کی رفتہ رفتہ کافی ضخامت ہوگئی یہ مان لینے کے بعد کہ غزل اُردو کے قریب قریب ہر شاعر نے کہی اور اُس میں فارسی کے شاعروں کی تقلید بھی کی، دکن کی غزلوں پر کوئی تفصیلی تبصرہ بیکار ہے اس لیے کہ ان میں ہمیں کوئی خاص بات نہیں ملی سوائے اس کے کہ دکنی دور کی غزلوں پر مقامی تخیل زیادہ نمایاں ہے قصیدہ نگاری کی دکن میں بھی کمی ہے صرف نصرتیؔ ایک ایسا شاعر ہے جسے ایک بلند پایہ قصیدہ گو کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے محض ایک شاعر کی وجہ سے قصیدہ نگاری کی کسی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں

صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ دکن میں قصیدوں کی بھی مہتم بالشان داغ بیل پڑ چکی تھی
دو خاص چیزیں جو اس سے زیادہ توجہ کی محتاج ہیں مثنوی اور مرثیہ ہیں ان کا
ذکر اس لیے ضروری ہے کہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو جائے کہ شمال میں آنے سے پہلے
ان دو چیزوں نے دکن میں کتنی ترقی کر لی تھی

مثنوی جس طرح شمال کے شاعروں میں سے کوئی ایک بھی ایسا مشکل سے ہوگا
جس نے غزل نہ کہی ہو اسی طرح دکن کے شاعروں میں مشکل ہی سے کوئی ایسا شاعر ملے گا
جس نے مثنوی نہ لکھی ہو یہی وجہ ہے کہ دکن کی مثنویوں میں ہر قسم کی مثنویاں موجود ہیں
ان میں ایسی مثنویاں بھی ہیں جن کا صرف مذہب سے تعلق ہے اور صوفیانہ مسائل سے
پُر ہیں مثال کے لیے میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم کی مثنویاں
پیش کی جا سکتی ہیں ان میں ایسی مثنویاں بھی ہیں جن میں صرف حسن و عشق کے قصے اور
واردات قلب کی داستانیں دہرائی گئی ہیں ایسی مثنویاں ایک دو نہیں پچاسوں ہیں
مثال کے لیے غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال جنیدی کی ماہ پیکر طبعی کی
بہرام و گل اندام فائز کی رضوان شاہ و روح افزا عاجز کی قصہ لال گوہر
شہ حسنیہ مثنویاں ہیں

یہی زمانہ ہے جس میں مختلف زبانوں کی بہترین مثنویاں اُردو کے قالب میں ڈھالی
گئیں یوسف زلیخا فارسی کی مشہور مثنوی ہے ہاشمی اور امین نے اُسے اُردو کا جامہ
پہنایا اسی عہد میں مثنویوں کی شکل میں سوانح عمریاں لکھی گئیں اور اُن سے تاریخ
کا کام لیا گیا اس حیثیت سے نصرت کا علی نامہ اور مومن کا اسرارِ عشق بھی بہت
مشہور ہیں نام کی مثنویاں ہیں لیکن حقیقت میں وہ بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں
ہیں اسے بھی چھوڑیے یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ مثنوی کی ایک خاص خوبی یہ ہے
کہ وہ اپنے زمانے کے رسم و رواج اور طور طریق کی مکمل تصویر پیش کر کے ہمارے سامنے

آیئے تاکہ جو کچھ ہم نے یہاں دیکھا ہے وہ سُن لیں، دکن کی مثنویوں میں کافی مثنویاں ایسی ہیں جو اس حیثیت سے بھی مکمل کہی جا سکتی ہیں۔ نصرتی کا علی نامہ ان میں سب سے نمایاں ہے ابن نشاطی کی مشہور مثنوی پھول بن گو ایک عشقیہ افسانہ ہے سلاست، روانی اور دوسرے فنی محاسن سے قطع نظر کر کے اسے اگر ہم صرف اسی نظر سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ مثنوی اپنے زمانے کی طرز معاشرت، رسم و رواج اور سیاسی و سماجی حالات کا ایک بہترین مرقع ہے بعض مثنویاں ہمیں ایسی بھی ملیں گی جن سے ہم بہترین اخلاقی درس حاصل کر سکتے ہیں

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ کچھ زیادہ حیرت افزا نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ ادب جس دور سے گزر رہا تھا اس وقت اس نے کوئی مستقل شکل نہیں اختیار کی تھی اس لئے ہر مصنف نے اپنی مخصوص ذہنیت کے مطابق مختلف قسم کی مثنویاں لکھیں اور ذخیرۂ ادب کو مالا مال کیا اور مثنویوں کا یہ دور آئندہ آنے والے زمانے کے لئے بھی ایک مفید سبق بن گیا لیکن ان حیثیتوں کے علاوہ جو چیز ہماری نظر کو اور زیادہ متحیر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں مثنویوں کے بیچ بیچ میں ہمیں ایسے بیانیہ ٹکڑے مل جاتے ہیں جو مثنوی سے علیحدہ کرنے کے بعد ہمارے لئے مستقل نظموں کا کام دیتے ہیں جو چیز اب صدیوں کے بعد ترقی کی شاہراہ سے گزر رہی ہے وہ اُردو کی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں شروع ہو چکی تھی۔ ان بیانیہ ٹکڑوں میں سے بعض ایسے ہیں جو کسی منظر کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں بعض ایسے ہیں جن میں کسی مخصوص مادی چیز کا تفصیلی لیکن شاعرانہ ذکر کیا گیا ہے بعض میں کسی خاص رسم کو اپنا موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے

موضوع اور مواد کے لحاظ سے ہم نے دیکھا کہ دکن کی مثنویوں میں مذہبی، فلسفیانہ، عاشقانہ، کنایہ، رزمیہ اور بزمیہ سب طرح کی مثنویاں ہیں ان میں سے کچھ طبع زاد

ہیں اور کچھ ترجمے بعض میں کردار نگاری کے اچھے نمونے ہیں اور بعض میں جذبات کی فطری تصویریں کسی میں مناظرِ قدرت کی جھلک ہے اور کسی میں انسانی نقش و نگار کے فنی نمونے اس کے علاوہ جو چیز ہمیں زیادہ مسحور کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان مثنویوں میں سے بعض کی زبان اتنی صاف ہے کہ کچھ شعر صرف ایک آدھ لفظ بدل دینے کے بعد ہمارے زمانے کے کہے ہوئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور بعض بغیر کسی تبدیلی کے بہت صاف اور رواں ہیں دو ایک نمونے دیکھ کر اس کا اندازہ کیجیے ؎

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی　　عطا کر مجھ کو یاقوتِ معانی
سخن کے در کا مجھ کو جوہری کر　　سخن سنجوں کو میرا مشتری کر [1]

غزالوں کی طرح سرگرم رم تھا　　بیاباں اُن کو گلزارِ ارم تھا

کروں اُس دشت کی کیونکر صفت کو　　زباں پر کس طرح ڈالوں لغت کو
وہاں کی ریت سیہے کی کنی تھی　　وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی
وہاں کی گرد تھی بادل کی دارو　　وہاں کی خاک تھی دوزخ کی بالو
وہاں کی باد تھی سو زیادہ صرصر　　وہاں کی کنکری تھی مثلِ اخگر

دیا اُسے سمند باد و سا و دل　　شجاعت کی ہے صف کا کرسی نشیں

طمع اہلِ عزت کوں کرتی ہے خوار　　کرے جگ میں بے قول دلے اعتبار
طمع نام و ناموس کا کال ہے　　طمع سکھ کو جیوں کے جنجال ہے [2]

---

[1] مثنوی لال و گوہر عاجز　　[2] علی نامہ نصرتی

مرثیہ:- مرثیہ اُردو شاعری کی وہ صنف ہے جس کی بدولت ہماری شاعری آج دنیا کی ہر شاعری کی آسانی سے ہم پلہ کہی جا سکتی ہے انیس نے اس صنف کو جتنی ترقی دی اتنی اُردو کی ساری زندگی میں بھی نہیں ہوئی تھی اب تک عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جن چیزوں کی انتہا انیس کے مراثی میں پائی جاتی ہے اس کی ابتدا بھی شمال ہی میں ہوئی تھی لیکن موجودہ تحقیق کچھ اور کہتی ہے۔ اس کے نزدیک تو جن چیزوں کی مثال ہم مرثیہ گوئیوں میں ابتدائی سلسلوں کے ساتھ موجود ہیں ان کی داغ بیل دکن میں پڑ چکی تھی ہم اپنے اس بیان کو مختلف مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے

کسی صنف سخن میں کسی قسم کا کمال پیدا کرنے سے پہلے شاعر جس چیز کی طرف سب سے پہلے توجہ کرتا ہے وہ ادبیت ہے دکن کے مرثیوں کے بالکل ابتدائی دور میں مرثیہ گوئی بالکل ایک مذہبی چیز سمجھی جاتی تھی اس لئے اس میں پڑھنے والوں کو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی لیکن غزل کے زمانے سے اس روش میں تبدیلی ہوئی اور سب کے دل پر غزل کے ان مصرعوں کا اثر پڑا کہ ع

تمام مضمون مرثیہ کہے سوں جیسا بنا بھولا

جو لوگ غزل کی کل ہی مرثیہ کہتے تھے انھوں نے اسے مختلف طریقوں سے اس کی حیثیت بدلنے کی کوشش کی کہیں رنگینی کو جگہ دی اور کہیں تغزل کو ہی صرف مطلب بیان کو مثلاً ؎

آج غم کا کیا میں آہوں کے گل　　　انکھ دل جاک میں چمن کے گل

غم زدہ سب داغ حیراں ہیں لالہ[۱]　　　نرگس و لالہ یاسمن کے گل

۱؎ رہ گئی

ماہِ محرم نیں دیکھو حسینا ہوا مال آتہا — تارے گگن سے گونا کے سہرا حوستہ کوں ملایا
گنگنا ستم کا ماند ھکر درد دکھ کا اُبٹنا کوں لگا کے — حیرت کی جوکی پہ اوپر ابجھواں سوں تن نہلا ما

روقی اور سیوا ن کے مرثیوں کے یہ شعر تشبیہ، تغزل اور رنگینی کی اچھی مثالیں ہیں

دکنی مرثیہ کا دوسرا اہم خصوصیت جذبات نگاری ہے فطرت انسانی کا جتنا گہرا مشاہدہ انہوں نے کیا اس کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں دکنی کے مرثیوں کو دیکھ کر یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ ان میں جذبات نگاری کی اچھی مثالیں موجود ہیں حضرت شہربانو کے جذبات ہاشم نے یوں نظم کیا ہے

تجھ بن سونی کا کر نمس اللہ لگا موں کھو دیکھیں
تجھ کو ڈھونڈ ڈھونڈوں دہیں مدینے سونا تیرا پالنا
دکھ کی کیسا بھو سا ل، غم کی دھوپ ہالوں میں
کس مجھ کو کھر ہوں، سونا تیرا پالنا

غلامی کے مراثی میں جذبات نگاری کی ایک مثال ملاحظہ ہو

اب میں حمزہ لادوں کسے کیا لی لگاوں کیسے
دودھ پلاؤں کسے ہے ہے فلک کیا کیا
نکلی میں جب از وطن کیسی ہوئی تھی شگن
گم ہوئے سارے رتن ہے ہے فلک کیا کیا

اُردو کے مرثیوں میں فطرتِ انسانی کی جو مصوری کی گئی ہے وہ ہندستان کے ماحول

؎ سیدن

سے زیادہ متاثر ہے۔ انیس کے کلام پر اعتراض کرنے والے اس چیز کو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی مثال کی ایجاد ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ دکن کے مرثیوں کو دیکھنے سے ایسی مثالیں مل جائیں گی جن میں خود ہماری ملکی فطرت جلوہ گر ہے مثال کے لئے ہاشم کے ایک مرثیہ کا ٹکڑا پیش ہے ۔

باسے اصغر کے ہیں ملاتی رہی   سونا یہ پالنا جھلاتی رہی
تھا رس کا ٹھ کا تجھے ارماں   لال جانا پر اسُلاتی رہی
قاسم آ ہے جب بھانے کو   ہیں تماشا تجھے دکھاتی رہی

مرثیہ کا ایک خاص جز و سیرت نگاری ہے سیرت نگاری کے بیان کا بہتر طریقہ مکالمے ہیں مصنف اگر خود اپنے لفظوں میں کردار کی سیرت بیان کر دے تو اُسے اپنی لطافت کی کمی سمجھنا چاہیئے دکنی مرثیوں میں جہاں سادہ سیرت نگاری کی مثالیں موجود ہیں وہاں کہیں کہیں مکالموں کے ذریعہ سے بھی اس کا پتا چلتا ہے ایک مثال لکھی جاتی ہے جس سے سیرت نگاری کا اندازہ ہو جانے کے علاوہ ایک خاص بات یہ ہوگی کہ مکالموں کا انداز بھی معلوم ہو جائے کا حضرت قاسم لڑائی کو جاتے ہیں

علو بے بس اُٹھ کے رن کوں چلا تب کہی دلہن
دامن پکڑ کے لاج سوں انکھواں بھرے جس
مت چھوڑ کر سدھارو تم اس حال میں ہمیں
تم بن رہے گا ہائے یہ سونا کھوں سرا

حضرت قاسم جواب دیتے ہیں ؂
مجھ کوں نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار
تیرے فراق ساتھ میں جاتا ہوں بے قرار
میں کیا کروں علاج نہیں حکم کردگار
حق سے کہا ہے رن میں مقرر رہن مرا

صرف دو بندوں سے مکالمے کے حسن و سیرت نگاری کی بلندی اور ادب کی لطافت اور محاکات کی معتبری کا کس قدر سامان ہو جاتی ہے محاکات کے لئے یہ مصرعہ۔

دامن پکڑ کے لاج سوں انکھواں لٹکتے ہیں

ہم آج بھی اچھی سے اچھی مثالوں کے ساتھ ہر موقعہ پر پیش کر سکتے ہیں

روایات نظم کرنے کی ابتدا بھی دکن میں ہو چکی تھی لیکن اس کی بالکل غیر مکمل مثالیں ملتی ہیں۔ اشرف کے ایک مرثیہ کا ٹکڑا انتخاب مثال کے لئے لکھا جاتا ہے۔

پانچ برس کی جب سالی تھی		مالے اصغر کوں جھلاتی تھی
جب وو لالا رادہ نیند بھر سوتا		وو دودھ پینے کو میں جگاتی تھی

حسن سیرت کی مثالیں مختصر طور پر پیش کی گئیں ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اشرف روحی لطیف سید ہاشم علامی امامی اور رحیم کے مرثیوں میں جذبات سیرت مکالمہ محاکات روایات سب چیزیں ابتدائی شکل میں موجود ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے شاعر (۳) استاد سے کسی طرح کم مثالیں نہیں ہیں۔

جہاں دکن کے متعلق اب تک عام طور پر یہ خیال تھا کہ اس کے ابتدائی دوروں میں ادب کی کچھ خدمت نہیں ہوئی اس کا ہم احسان ماننے پر مجبور ہیں کہ اس نے غزل، قصیدہ اور مثنوی اور مرثیہ کو ایک ایسے راستے پر لگا دیا جس کے زیادہ اچھے نمونے شمال میں آ کر ملے

دکن میں اردو ادب کے ابتدائی مراحل پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے شعرا اور ادب کا بھی جائزہ لیا جائے

(۲)

شمالی ہند

برہمنؔ

برہمن کی جنم بھوم میں اختلاف ہے کوئی لاہور بتاتا ہے کوئی آگرہ۔ حسرت موہانی
رسالہ اردوئے معلیٰ ماہ اگست ۱۹۰۸ء میں لکھتے ہیں کہ برہمن اکبرآباد کے رہنے والے تھے
[illegible] سے بھی اُن کا وطن اکبرآباد ہی معلوم ہوتا ہے غالباً لاہور میں قیام کرنے
کی وجہ سے بعض لوگ ان کو لاہوری سمجھتے ہیں جس کی تردید خود برہمن کی ایک عبارت
سے ہو جاتی ہے

خان بہادر[۱] مرزا سلطان احمد صاحب نے رسالہ زمانہ کانپور جولائی ۱۹۲۱ء
برہمن کے متعلق لکھا ہے کہ شاہانِ مغلیہ کی سلطنت میں چندر بھان برہمن لاہوری ملقب
بہ خواجہ چندر بھان گو لاہور کے دفتر میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز تھا "انشائے چہار چمن"
اس کی تصنیفات میں سے ہے چندر بھان کو نظم کا بہت شوق تھا مرقع کتاب میں لکھتا ہے کہ

" این نیازمند دارالسلطنت لاہور کہ مسقط الراس است آشنا شد
در ایام جوانی کہ در حالات بہ قسمت [illegible] "

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ برہمن کا اصلی وطن لاہور تھا مگر بسلسلہ ملازمت

۱؎ بحوالہ بہار گلشن کشمیر حصہ اول۔

وہ لاہور آئے تھے۔ بہر حال یہ یقینی امر ہے کہ برہمن اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے شاہجہاں کے وقت میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھے۔ بعضوں نے دارا شکوہ کا منشی لکھا ہے اور بعضوں نے شاہجہاں کا خاص منشی بتایا ہے۔ بہار گلشن کشمیر میں ایک جگہ[1] لکھا ہے کہ سنہ ۱۰۶۶ھ میں سعد اللہ خاں شیرازی وزیر سلطنت شاہجہانی نے انتقال کیا۔ اس وقت شاہجہاں کی مردم شناس نظر نے چندر بھان کو انتخاب کیا اور "خطاب رائے رایاں" سے مشرف کر کے قلمدان وزارت آپ کے سپرد کیا۔ فارسی میں کئی ایک تصانیف آپ سے یادگار رہیں۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ دارا شکوہ کے قتل کے بعد برہمن تارک الدنیا ہو کر بنارس چلے گئے اور وہاں اپنی عمر کے بقیہ دن صرف کر کے سنہ ۱۰۷۳ھ میں راہیِ ملک بقا ہوئے۔

سرشتہ مہربانی اسی رسالے میں جس کا ذکر ابھی آ چکا ہے رقمطراز ہیں کہ "اورنگ زیب شاہ عالمگیر کے زمانے میں ان پر زیر عتاب رہے، نذر شاہی منشی دلی رہے اور ان کا لقب سدا ست بناں رہتا رہا۔ آخر عمر میں نوکری سے استعفا دے کر بنارس میں سکونت اختیار کی اور سنہ ۱۰۸۳ھ میں انتقال کیا"[2] کلام کا نمونہ بہت کم وہ بہت ہی مشہور کا ہے جو مل سکا ہے ملاحظہ ہو۔

خدا نے کس شہر اندر ہم کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے
جو بالک کے بازار میں رونق ہوئے تو کس طرح یاراں
نہ دوبارہ ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے

---

[1] ضمیمہ جلد اول ص ۴۶۳
[2] تماشہ جاوید

پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کس سیں
نہ تسبی ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
پیا کے نام عاشق کوں قتل یا عجب دیکھے ہوں
نہ برچھی ہے نہ کرچھے ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے
رتن واسطے اشنان کے پھرتا ہے یگیا سیں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

فائز دہلوی

حال ہی میں ان کا دیوان پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی نے مرتب کر کے ثابت کر دیا کہ ولی کے زمانے میں شمالی ہند میں بھی اُردو کے شعرا موجود تھے جن میں فائز کی حیثیت صاحب دیوان ہونے کی وجہ سے ممتاز ہے۔ فائز کا دیوان ۱۱۲۷ھ میں یعنی فرخ سیر کی سلطنت کے پانچویں سال میں مرتب ہو چکا تھا۔ وہ ولی کے ہم عصر تھے۔

فائز کے خاندانی حالات زیادہ نہیں معلوم۔ ان کا نام صدرالدین محمد تھا اور ان کے والد کا نام محمد خلیل تھا جو زبردست خاں کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے آبا و اجداد اپنے وقت کے بادشاہوں کے یہاں ممتاز عہدوں پر مامور تھے۔ چنانچہ ان کے والد زبردست خاں عالمگیری عہد کے بیالیسویں سال میں ناظم اودھ مقرر ہوئے تھے اور بعد میں کبھی بہار کے صوبے دار رہے اور کبھی اجمیر کے۔

فائز کے وطن کا پتہ قطعی طور پر معلوم نہیں لیکن جس انداز سے انھوں نے اپنے کلام میں دہلی کا ذکر کیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ دہلی کے باشندے تھے

وہ نہایت ذی علم اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے نثر و نظم فارسی و اردو دونوں میں ان کا قلم یکساں رواں تھا چنانچہ ان کی اردو و فارسی کی جن تصنیفات کا اب تک پتہ لگایا جاسکا ہے ان کی تعداد انیس (۱۹) ہے۔

آرزو کا اردو دیوان ضخیم نہیں ہے صرف مشتمل ۳۲ غزلیں ہیں لیکن نظمیں تعداد میں اس سے بہت زیادہ ہیں جو سب کی سب مثنوی کی شکل کی ہیں جس طرح وہ دہلی کے پہلے اردو غزل گو ہیں اسی طرح پہلے نظم گو بھی ہیں

آرزو کے کلام میں غور و فکر کے عناصر نہیں پائے جاتے وہ سیدھی سادی باتوں کو نظم کرتے چلے جاتے ہیں ان کے کلام میں ایہام بہت کم ہے البتہ اور تشبیہات کافی ہیں ان کی غزلوں کا عام موضوع ظاہری حسن ہے یا مجازی محبت کلام میں معاملی خصوصیات بہت ہیں سوز و گداز اور دسری جوش و حرارت کم ہے لیکن محبوب کی اداؤں کے بیان اور ان کی خست کے اظہار میں کبھی کبھی کلام میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔

آبرو

ان کا نام نجم الدین تھا شاہ مبارک لقب اور آبرو تخلص تھا سلسلۂ نسب شاہ محمد غوث گوالیاری سے ملتا ہے تاریخ ولادت کا پتہ نہیں چلتا گوالیار میں پیدا ہوئے تھے لیکن بچپن ہی میں دہلی چلے آئے جہاں تعلیم و شعر گوئی حاصل کی سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے اور ان ہی سے مشورہ شعر و سخن کرتے تھے

تھوڑے عرصہ تک نارنول میں بھی رہے نہایت خلیق و متواضع آدمی تھے ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۱ء) میں پچاس برس کی عمر سے متجاوز ہو کر وفات پائی نہایت کہنہ مشق شاعر تھے اس وقت ہر ایک ان کو استاد زمانہ

۱؎ ماخوذ از تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو سکسینہ مترجمہ مرزا محمد عسکری

سمجھتا ہوا

کلام میں صفائی ضرور ہے مگر رعایت لفظی کا اس قدر چسکا ہے کہ تخیل میں وسعت نہیں پیدا ہوتی۔ الفاظ سادے اور ملائم ہیں لیکن زمانہ حال کے لحاظ سے بہت سے ایسے ہیں جو تقریباً متروک ہیں۔ چند اشعار نمونے کے لیے ملاحظہ ہوں

رحم اس مرد کی کھاتے ہیں قسم رہ دل کی
تاب لاوے جو کوئی عشق کے جھوکا جھوڑوں کی

قدرداں سب کے کہتے ہیں اسے دل مردہ
ساور سے چھوڑ کے جو چارہ کرے گردوں کی

گاشتر کاٹی ہے مرے دل کی ی اکھاں نے
وہ پلک ہیں بہ کتری ہے مگر چیرروں کی

لب پر سرِ یا یہ سرخی کے ہیں خطِ سیاہ
ڈار چھوٹی ہے مٹھائی پہ شکر خوروں کی

پلکیں سورج منیں جوں خط شعاع کے شعلے
دیکھ انکھوں منیں یہ لال جھلک ڈوروں کی

نادری سکہ ہے جوں برمیں سجن پوشہ دار
عقل حیران ہیں سبھی دیکھ کے چھب مردوں کی

آبرو کوں نہیں کم ظرف کی صحبت کا دماغ
کس کو برداشت ہے ہر وقت کے کمزوروں کی

ناجی

ان کا نام سید محمد شاکر تھا ناجی تخلص کرتے تھے محمد شاہ کے ایک وزیر عمدۃ الملک امیر خاں سے جو خود بھی شاعر تھے اور شاعر پرور بھی تھے یہ ان کے یہاں ملازم تھے جس وقت نادر شاہ نے ہندوستان پر چڑھائی کی اس وقت (۱۷۳۹ء میں) اس قلم کے سپاہی نے میدان جنگ میں بھی قدم رکھا اور فوج کے ساتھ تباہی میں شریک دار رہا اس وقت کے حالات جو کچھ لکھے ہیں وہ تاریخی لحاظ سے بھی حرف بحرف صحیح معلوم ہوتے ہیں آدمی منصف مزاج تھے لشکر اور دربار کی جو حالت تھی اس کو بے دھڑک لکھ دیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں محمد شاہی لشکریوں کی کیفیت بیان کرتے ہیں

لڑے ہوتے نو برس میں اُن کو بیتے تھے
دعا کے زور سے دائی و دا کے جیتے تھے
تمرا میں گھر کی نکالی مرے سے پیتے تھے
نگار و نقش سے ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہیکلیاں بازو اُپر طلا کے نال

ناجی کی طبیعت میں شوخی اور تیزی بہت کافی تھی چنانچہ کلام میں بھی یہ رنگ نمایاں ہے میر تقی میر نے لکھا ہے کہ طبیعت کا جھکاؤ ہزل کی طرف زیادہ تھا اپنے مذاق آمیز کلام سے لوگوں کو ہنساتے اور خود بہت ہنساتے رہتے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

دیکھ رہا ترے کمر کی طرف، بھر گیا مانی اسی گھر کی طرف
جن نے دیکھے ترے لب شیریں نظر اُن کی نہیں شکر کی طرف
ہے محال اُن کا دام میں آنا دل جوان سب سا تکا زر کی طرف

تیرے رخسار کی صفائی دیکھ   ختم دانا نہیں ہنر کی طرف

حشر میں پاک باز رہے ناجی
بدعمل جائیں گے سقر کی طرف

اپنے ہمعصروں کی طرح رعایت لفظی ناجی کو بھی بہت مرغوب ہے۔ تھوڑا بہت جو کچھ کلام دستیاب ہوا ہے اس میں قدم قدم پر اس رنگ کا نمونہ نظر آتا ہے مثلاً

رنگ تیرا گندمی دیکھ اور بدن مخمل سا صاف
ہوش کھو کر آدمی بھولے ہیں اپنے خورد و خواب

اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں   عارضی میری زندگانی ہے
انا الحق لو لب لگتا ہے اس کے زخم کا سل
کٹاری آبدار اس شوخ کی منصور جانی ہے

مضمون

شیخ شرف الدین نام تھا اور مضمون تخلص کرتے تھے۔ اکبر آباد جس وطن تھا مگر دلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ تمام عمر زینت المساجد میں بسر کی۔ سلسلۂ نسب کئی واسطوں سے شیخ فرید الدین شکر گنج سے ملتا ہے جس کا اشارہ انہوں نے خود بھی اپنے کلام میں کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

کریں کیوں نہ شکرلبوں کو مرید   کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید

اس زمانہ میں سراج الدین آرزو مسلم الثبوت استاد تھے گو وہ مضمون سے عمر میں

چھپتے تھے مگر "بزرگی بعقل است نہ بسال" کے مقولہ کو مد نظر رکھ کر یہ اپنا کلام آرزو کو اصلاح کے لیے دکھاتے تھے مضمون خود ایسے صاحب فن اور باکمال شاعر تھے کہ ان کے مرنے کے بعد سودا نے اظہار افسوس اور اقرار کمال ان الفاظ میں کیا

بہائیں اُٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی — گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو مستانہ

کلام اس وقت کے عام پسند رنگ یعنی صنعت مراعاۃ النظیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو کہیں کہیں کلام ابتذال کی حد تک پہنچ جاتا ہے مضمون کا انتقال ۱۱۴۵ھ میں ہوا۔

کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج	ہوا منصور سے یہ نکتہ حل آج
نہیں ہیں ہونٹھ تیرے پان سے سرخ	ہوا ہے خون میرا آکے لب پر
کیا سمجھ بلبل نے باندھا کہ چمن میں آشیاں	ایک تو گل نے دغا اور تس پہ جور باغباں
میکدہ میں گر سرا پا فعل نامعقول ہے	مدرسہ دیکھا تو واں بھی فاعل و مفعول ہے

جلا کتی ہیں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

یک رنگ

علام مصطفےٰ خاں نام اور یک رنگ تخلص تھا مرزا جان جاناں مظہر کو کلام دکھاتے تھے محمد حسین آزاد فرماتے ہیں "بزرگوں سے سنا اور تذکروں میں بھی دیکھا بڑے مشاق تھے اور اپنے وقت میں سب انہیں خوش فکر اور باکمال مانتے تھے اور لطف یہ ہے کہ تخلص کی طرح عالم آشنائی میں بھی یک رنگ دیکھتا ہے۔" امرائے محمد شاہی میں تھے

اور بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے تاریخ وفات وولادت کا پتہ نہیں چلتا کلام کا نمونہ یہ ہے :-

یک رنگ پاس اور سخن کچھ نہیں بساط
رکھتا ہوں دو ہیں جو کہو تو ندر کر دوں
اُس زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال
یک رنگ کے سخن میں خلاف ایک مو نہیں
نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
دل سے صبر و قرار جاتا ہے

کلام علوئے تخیل سے خالی نہیں مگر استعارات کی بھرمار اس زمانہ کے لوگوں کی طبیعت کو خوش نہیں کرسکی ان کا ایک دیوان یادگار ہے جو لوگوں کو مذاقِ طبیعت کے لحاظ سے مجاز وحقیقت دونوں کا مزا دیتا ہے

آرزو

سراج الدین علی خاں کے متعلق ہر تذکرہ نویس نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی قابلیت اور علمیت کا سکہ ہر دل پر جما ہوا تھا ان کے کلام سے اُن کی قابلیت اور علمی تبحر کا پتا چلتا ہے سب تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ انھیں علم معقول ومنقول ہر چیز پر عبور تھا لیکن ان سب باتوں سے زیادہ جس چیز کی تعریف کی جاتی ہے وہ ان کے ذاتی محاسن اور اخلاق وعادات ہیں اُن کی شیریں زبانی اور علم مجلس کا ہر شخص کا معترف ہے

اُن کے متعلق مجموعہ نغز میں حکیم قدرت اللہ خاں قاسم سے دو ایک لطیفے لکھے ہیں جس سے ان کی قابلیت اور شاعرانہ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آزاد نے بھی عالگیر

لطیفے اسی تذکرے سے لیے ہیں

(۱) لطیفہ :- ایک دن کہیں مشاعرہ ہو رہا تھا سودا نے حاجی محمد جان قدسی کے چند شعر اس طرح ترجمہ کرکے پڑھے گویا مضمون خود ان کا ہے بہت سے لوگوں کو معلوم ہو گیا مگر سودا کی ہجو گوئی کے خوف سے لوگوں نے خاموشی اختیار کی خان آرزو ضبط نہ کر سکے نہایت لطف سے یہ شعر پڑھا ؎

شعر سودا حدیث قدسی ہے — لکھ رکھیں چاہیئے فلک یہ ملک

مرزا بے اختیار ہو گئے اٹھ کر خان آرزو کے گلے ملے بات گئی گزری ہوئی

(۲) لطیفہ :- ایک دن ایک نوجوان خان آرزو کے سامنے سے ہو کر گزرے۔ جب یہ بچے تھے تو خان آرزو سے ربط تھا انھوں نے سلام تک نہ کیا آرزو نے فوراً یہ شعر کہا ؎

یہ شان یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا
کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے

آرزو کا اردو کلام کہیں نہیں ملتا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے اردو میں بہت کم کہا تھا ان کے چند شعر مجموعۂ نغز سے لکھے جاتے ہیں [1]

کھول کر بند قبا کو ملک دل غارت کیا
کیا حصارِ قلب دلبر نے کھلے بندوں کیا

آتا ہے ہر سحر اٹھ تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

---

[1] مجموعۂ نغز مطبوعہ دارالاشاعت پنجاب ص ۲۵ و ص ۲۶

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

اور زلفِ سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

اس شعر کو آرزو سے منسوب کرنے میں کچھ تکلف ہوتا ہے البتہ مرزا سودا نے
اسے دوسرے طریقے سے بیان کیا ہے اور غالباً وہی صحیح ہے ۔ ع

اس زلفِ سیہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے
آئینہ کے گلشن میں گھٹا جھوم پڑی ہے

عمدۃ الملک امیر خاں انجام

ان کا تخلص انجام تھا باپ ان کے امرائے عالمگیری میں سے تھے ، جو ایک زمانہ میں عالمگیر کی طرف سے کابل کے صوبہ دار تھے انجام محمد شاہی دور میں الہ آباد کے صوبہ دار تھے طبیعت میں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی بہت تھی شاعر اچھے تھے فارسی اردو دونوں میں شعر کہتے تھے ان کا ایک خاص احسان اردو پر یہ ہے کہ اس زبان کی ترقی کے لئے اپنی نگرانی میں ایک انجمن بھی قائم کی جس میں وقت کے فصحا و زبان داں شریک ہوتے الفاظ و محاورات پر بحث ہوتی اور بڑے رگڑے جھگڑوں اور چھان بین کے بعد اس انجمن کے دفتر میں الفاظ و محاورات درج ہوتے اور پھر سارے ہند میں اس کی نقل بھیجی جاتی اور دیگر امرا اسی امیر کی تقلید کو فخر مانتے "[1]

---

[1] خطبہ صدارت نواب نصیر حسین خیال

علمی لیاقت کے لحاظ سے بہت کم شاعر اس قابلیت کے گزرے ہوں گے وہ صرف عربی اور فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے بلکہ سنسکرت اور بھاشا کے بھی اُستاد سمجھے جاتے تھے افسوس ہے کہ محمد شاہ کے ہاتھ سے انجام کا انجام اچھا نہ ہوا ایوانِ شاہی میں ۱۱۵۹ھ قتل کر دیئے گئے۔ گھر بھی ضبط ہوا اور ظلم یہ ہوا کہ ان کا نادر کتب خانہ بھی برباد ہوا، جس کے ساتھ قیامت یہ ہوئی کہ ان کا کلام بھی تلف ہو گیا۔ جو کچھ باقی رہ گیا اُس میں سے چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ زبان کی لطافت اسلوبِ بیان اور محاورات کے صرف میں ان کا کوئی معاصر مشکل سے دکھائی دیتا ہے۔

کیوں ملایا خیر میں مجھ سے یہ نادانی ہوئی
دخترِ رز بزم میں آ اس شرم سے پانی ہوئی

کل محیطِ عشق کے صدموں سے پائی کسی نجات
کشتیِ دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی

ٹک تو فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

مُنہ ترا تکتے ہیں سب اقلیمِ حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاسِ مملکت
شکر ہے تڑپے نہ زیرِ خنجرِ جلاد ہم

بعض اشعار ان کے اب تک لوگوں کی زبان پر جاری ہیں مثلاً

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانہ کو ہم
پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم

کیوں ہمیں لیتا ہماری لو خبر اے بے خبر
کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد و غم کھانے کو ہم

دور کی خصوصیات

جس دور شاعری کے مختلف شاعروں کا ذکر کیا گیا اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ولی کے علاوہ اس میں کوئی ایسا شاعر مشکل سے تھا جس نے زبان اور ادب کی کوئی خاص خدمت کی ہو۔ ولی کے بعد اس دور کے شعرا نے شاعری کو زیادہ ترقی نہیں دی بلکہ اگر بنظر انصاف سے دیکھا جائے تو بجائے ترقی کے یہ دور انحطاط اور زوال کا تھا۔ ولی نے اب تک بھاشا کے الفاظ کے علاوہ خاص چیز جو اردو میں لانے کی کوشش کی تھی وہ بھاشا کی شاعری کے جذبات تھے اردو کی عاشقانہ شاعری میں خاص طور پر ان خصوصیات کا اثر پڑا۔ ولی کے وہ شعر جو بھاشا کے جذبات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں بہت خوب ہیں ایک آدھ شعر سے اس کا اندازہ کیجیے ؎

براگی جو کہاتے ہیں انھیں گھر بار کرنا کیا
ہوئی جو گن جو گئی پی کی اسے سنسار کرنا کیا

ترے بن مجکوں اے ساجن نہ یو گھر بار کرنا کیا
اگر تو نا چہے مجکوں تو یو سنسار کرنا کیا

سلونے سانولے پیتم ترے موتی کی جھلکاں نے
کیا عقد ثریا کوں خراب آہستہ آہستہ

ولی کے بعد اس دور کے شاعروں نے ہندی کی تقلید تو کی لیکن جو چیز ہندی میں سب سے اچھی تھی اُسے چھوڑ دیا جذبات نگاری اور اس کے اندار کی پرواہ نہ کی

بلکہ ہر بات میں فارسی کی تقلید کرنے لگے اور لطف یہ کہ اس کے باوجود بھی زبان کو صاف کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی حالانکہ فارسی سے لئے مگر الفاظ وہی بھاشا کے استعمال کرتے رہے غیر مانوس متروکات اسی طرح کام میں لاتے رہے اور یہ کام آئندہ والوں کے لئے چھوڑ دیا اس میں شک بھی نہیں کہ دوسرے دور کے شاعروں نے اس کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا

اس دور کی تیسری خصوصیت ایہام گوئی ہے جو ہندی کے دوہروں سے آئی اس ہی چیز نے ہماری شاعری میں خرابیاں پیدا کرنی شروع کر دیں بے تکلفی اور سادگی کی جگہ ایہام نے لے لی اور سیدھی سادی بات کو دو معنی بنانے کی فکر میں شاعروں نے اثر و لطف کا سرمایہ اپنے ہاتھوں سے کھو دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ آنے والوں نے اصلاح زبان کی طرف بہت توجہ کی لیکن اظہار کمال کے شوق میں ایہام گوئی کے پھندے سے وہ بھی نہ چھوٹ سکے

اس کے باوجود بھی اس دور کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں ان شاعروں نے تکلف اور ایہام کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا وہاں کلام میں بے حد لطف اور اثر پیدا ہو گیا ہے سیدھے سادے جذبات آسان سے آسان الفاظ میں بیان کر دیئے ہیں اس لئے وہ پڑھنے والے پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثلاً

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیئے

کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گزری سو جگ بیتا

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوگی اس دلِ بے قرار کی صورت

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

میرا پیغام وصل اے قاصد
کہیو سب سے اسے جدا کر کے

اس کے علاوہ اس دور کے شاعروں کے یہاں تصوف کا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے اس لئے کہ فطرتاً اس دور کے شعراء صوفی تھے اور اس عہد کی فضا میں تصوف چھایا ہوا تھا

(۳)

حاتم

ظہور الدین نام تھا اور حاتم تخلص مضمون ناجی اور آبرو کے ہمعصر تھے باپ
کا نام فخر الدین تھا ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے جیسا کہ ان کے نام (ظہور) کے اعداد سے
ظاہر ہوتا ہے اصل وطن شاہجہاں آباد ہے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

دل یہاں پھرتا ہے حاتم کا نجف اشرف کے بیچ
گو وطن ظاہر میں اس کا شاہجہاں آباد ہے

ابتدا میں سپاہی پیشہ تھے جس کی بدولت نواب امیر خاں محمد شاہی کی سرکار میں
ملازمت حاصل کی میر بادل علی شاہ کے تکیہ میں اکثر فقیر جمع ہوا کرتے تھے یہ بھی وہاں
جاتے اور برابر اپنا وقت گزارتے صحبت نے اثر کیا اور خود بھی ایک آزاد مست فقیر ہو گئے
شاعری کا چسکا بچپن ہی سے تھا پہلے رمز تخلص کرتے تھے بعد میں حاتم ہو گئے قابلیت
کا یہ حال کہ زمانے نے ان کو نہ صرف دہلی اسکول کا بانی قرار دیا بلکہ حکمت اُستاد بھی
تھا اُن کے شاگردوں کی فہرست پر جب نظر پڑتی ہے تو اس خیال کی ایک حد تک تائید
بھی ہوتی ہے جس کا شاگرد سودا ایسا استاد ہو اس کو حکمت استاد کہنا کیا غلط ہے، صرف سودا
ہی ان کے شاگرد نہ تھے بلکہ اور بھی ممتاز شعرا ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے
سعادت یار خاں رنگین، تاباں لالہ مکند رائے فارغ وغیرہ حاتم کی خدمت میں اصلاح سخن
کے لیے حاضر ہوتے اور فخر کرتے ضخامت کے لحاظ سے حاتم کا کلام بہت بڑا ہے

جس میں قصائد رباعیات غزلیات سب ہی کچھ ہیں
آخر عمر میں اس ضخیم کلیات سے ایک چھوٹا دیوان مرتب کیا جس کا نام دیوان زادہ رکھا جس کے متعلق آزاد لکھتے ہیں کہ" وہ صاحبزادہ بھی پانچ ہزار سے زیادہ کا مال بغل میں دبائے بیٹھا ہے۔"
اس دیوان زادہ میں حاتم نے چند الفاظ ترک کر دیئے ہیں جو ان کے دیوان قدیم میں پائے جاتے ہیں مثلاً ور پر اور وغیرہ کیونکہ یہ الفاظ اردو میں غیر مانوس نظر آنے لگے ان الفاظ کے استعمال سے بھی گریز کیا ہے جو اصلاً عربی تھے لیکن تلفظ اور ہجے کے لحاظ سے ہندی ہو گئے تھے مثلاً تسبیح کو تسبی و صحیح کو صحی لکھنا حاتم نے یہ صحیح نہیں سمجھا
تیسری اصلاح بھی ان کی قابلِ قدر رہی ہے عربی و فارسی کے حروف جو اردو میں ٹوٹے تھے ان کو بھی نامناسب سمجھ کر ترک کر دیا مثلاً سکیا نہ کو نکا نہ دیوانہ کو دوانا ۔ حاتم کے نزدیک اُردو میں لکھنا معتوب ہے مگر ان اصلاحات پر عرصہ تک عمل درآمد نہ ہوا یہاں تک کہ میرنے خود" دوانہ" وغیرہ استعمال کیا ہے لیکن ناسخ کے وقت میں ان اصلاحات پر پوری توجہ ہوئی
حاتم نے ہندی کے بھی ثقیل الفاظ اردو میں استعمال کرنے سے گریز کیا ہے ۔ مثلاً ادھر کندھر وغیرہ ترک کر دیا مختصر یہ کہ حاتم نے فصاحت اور زبان کی صفائی کو بہت زیادہ مدنظر رکھا یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں روزمرّہ اور فصاحت اوروں سے زیادہ ہے ہاں ضرور ہے کہ کبھی کبھی زائد الفاظ شعر میں استعمال کرتے ہیں ۔
حاتم کا انتقال ۹۶ برس کی عمر میں ماہ رمضان ۱۲۰۷ھ میں ہوا اور دِلّی دروازہ کے باہر دفن ہوئے مصحفی کو اس سال وفات سے اختلاف ہے وہ ۱۱۹۷ھ میں ان کا مرنا بتاتے ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے۔

اے خرد مند و مبارک ہو تمہیں فرزانگی   ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو اور دیوانگی

حاتمؔ

بے مروت بے وفا بے دید بے بے آشنا　　آشناؤں سے نہ کر بے رخی وجہ بیگانگی
ملک دل آباد کیوں کر ہا ہے حاتم کا خراب　　اے مری بستی اجڑ آئی ہے تجھے ویرانگی

زندگی درد سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا

ہجر کی زندگی سے موت بھلی
کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

نواب عمدۃ الملک امیر خاں بہادر کی فرمائش سے حاتم نے ایک مثنوی قہوہ کی تعریف میں لکھی تھی یہ مثنوی اس لئے قابل قدر ہے کہ شمال میں اس سے پہلے کوئی مسلسل نظم نہیں ملتی اس حیثیت سے حاتم کو اولیت کا مرتبہ حاصل ہے[1]

فغاںؔ

اشرف علی خاں نام فغاں تخلص تھا احمد شاہ بادشاہ دہلی کے 'کوکا' تھے طبیعت میں ظرافت اور مزاح فطرت سے لے کر آئے تھے چنانچہ بادشاہ کی طرف سے "ظریف الملک کوکا خاں بہادر" کا خطاب تھا ابتدائے عمر سے شعر کہنے کا شوق ہوا مشق سخن نے ان کی کرسی اُردو کے ممتاز شعرا کے برابر رکھ دی ہے
میر تقی میر نے انہیں قزلباش خاں امید کا شاگرد لکھا ہے مصحفی انہیں ندیم کا شاگرد

---

[1] مضمون ڈاکٹر زور ہندوستانی جنوری سنہ ۱۹۳۲ء

بتاتے ہیں اور فغاں نے بھی ایک آدھ جگہ اس کو تسلیم کیا ہے ایک جگہ کہتے ہیں۔

دشتِ جنوں میں کیوں نہ پھروں میں برہنہ پا
اب تو فغاں ندیمؔ مرا رہنما ہوا

اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے مختلف دنوں میں دونوں کے شاگرد رہے ہوں کیونکہ اس شعر میں "اب تو" سے حال ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اُستاد کے شاگرد رہے ہوں

احمد شاہ درانی کے حملوں نے دلی اور اہلِ دلی دونوں کو تباہ و برباد کر دیا فغاں نے بھی دلی کو خیرباد کہہ کر مرشد آباد کی راہ لی۔ وہاں ان کے چچا ایرج خاں صاحبِ اقتدار تھے کچھ دن ان کے پاس رہے پھر وہاں سے فیض آباد آئے گو دلی اُجڑ چکی تھی مگر بقول آزاد "دلی کا آدمی کہیں جاتا تھا تو لوگ اس کو ایسا سمجھتے تھے گویا پیرزادے آئے بلکہ اس کی نشست برخاست کو سلیقہ اور اطوار کا دستور العمل سمجھتے تھے" چنانچہ ان کو بھی نواب شجاع الدولہ نے بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رکھا لیکن نازک مزاجی نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ ایک دن نواب کے ہاتھ سے فغاں کا ہاتھ چل گیا یہ آگ بگولہ ہو کر عظیم آباد چلے گئے وہاں راجہ شتاب رائے نے بہت قدر کی یہاں تک کہ فغاں نے ساری عمر وہیں بسر کر دی سنہ ۱۱۸۶ھ مطابق سنہ ۱۷۷۲ء میں اس دنیا سے انتقال کیا کلام کا نمونہ یہ ہے۔

صنم بتا تو جدائی کا مجھ کو کیا نہ ہوا
ہزار شکر کہ تو بُت ہوا خدا نہ ہوا
کباب ہو گیا آخر کو کچھ بُرا نہ ہوا
عجب نہ دل سے چلا تو بھی بے مزا نہ ہوا

شگفتگی سے ہے غنچہ کے تئیں پریشانی
بھلا ہوا کسی کا فرتو جھ سے دانہ ہوا

موا نہ میں حیا آخر کو یہم لبسمل ہو
غضب ہوا مرے قاتل کا مدعا نہ ہوا

نپٹ ہوا ہوں نصیحت بہت ہوا ہے خراب
ترے طفیل اے خانہ خراب کیا نہ ہوا

طرف سے اپنی تو نیکی میں ہے مزا صاحب
مری بلا سے دعا آں کا اگر بھلا نہ ہوا

مظہر جانجاناں

نام مرزا جانجاناں تھا اور تخلص مظہر تھا والد کا نام مرزا جان تھا جو عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے سلسلۂ نسب محمد ابن حنیفہ سے ملتا ہے جو حضرت علی کے بیٹے تھے ماں بیجاپور کے ایک شریف گھرانے سے تھیں

۱۱۱۱ھ میں جب شاہ عالمگیر دکن میں فوج لئے پڑا تھا تو خبر آئی کہ مرزا جان کے بیٹا بمقام کالا باغ علاقہ مالوہ میں پیدا ہوا جب عالمگیر کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ :
"پسر جان پدر می باشد" باپ مرزا جان ہے ہم نے لڑکے کا نام "جان جاناں" رکھا افسوس کہ مرزا جان جاناں کو سایۂ پدری سے عنفوان شباب ہی میں محروم ہونا پڑا۔ ابھی یہ صرف اٹھارہ برس کے تھے کہ مرزا جان انتقال کر گئے مگر شفقت خداوندی راہ نما ہوئی مرزا جان جاناں نے ۳۰ برس کی عمر تک مدرسوں اور خانقاہوں

ہیں جا رہ کسب کسبی کی اہل علم سے حدیث اور فقہ حاصل کیا اُس زمانہ میں ہر طرف تصوف کا چرچا تھا ان کا بھی رجحان تصوف کی طرف ہوا چنانچہ ہزاروں ہندو، مسلمان اُن کے مرید ہوئے تصوف کے لئے قناعت و استغنا لازمی ہے ان کے مزاج میں یہ باتیں روز ازل سے خمیر ہو گئی تھیں اُمرا اور بادشاہوں کی بھی نذر قبول نہ کرتے تھے جب تک جئے فقیرانہ زندگی بسر کی۔ دس محرم ۱۱۹۵ھ کو ایک شخص کے ہاتھ سے قتل ہو کر راہی ملک بقا ہوئے سودا نے تاریخ کہی۔

مرزا کا ہوا جو قاتل ایک مرتد شوم

اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم

تاریخ از روئے درد یہ سُن کے کہی

سودا نے کہ ہائے جان جاناں مظلوم

۱۱ ھ ۹۵

اُن کی بزرگی کا یہ عالم تھا کہ بڑوں بڑوں نے ان کے آگے سر جھکایا میر تقی میر اور شیخ علی حزیں جو ہر شخص کو اپنے سے کمتر جانتے تھے انھیں نہایت پُر تعظیم لفظوں میں یاد کرتے ہیں

مرزا مظہر کے شاگردوں میں چند مشہور اُستاد گزرے ہیں انعام اللہ خاں یقین میر محمد باقر حزیں بساون لال بیدار خواجہ احسن اللہ خاں بیان۔

مرزا مظہر کا ایک دیوان فارسی میں ہے اُردو میں بھی دیوان ہے مگر ناتمام و نایاب

مرزا مظہر کے کلام میں علاوہ اور باتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی نمایاں ہے کہ انھوں نے ایہام سے بہت گریز کیا ہے اور بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ مرزا مظہر پہلے شخص ہیں جنھوں نے صنعت ایہام کے طوفان سے زبان

کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کلام میں درد و کیف بہت کافی ہے زبان نہایت پاک اور ستہ ہے دہلی کے خاص محاورات نہایت خوبی سے نظم کرتے ہیں کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

چلی سب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

میرا جی جلتا ہے اس بلبل بے کس کی غربت پر
کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

الٰہی کب کسو کے میش رنج انتظار آوے
ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

دور کی خصوصیات اس دور میں جو اس وقت زیر بحث ہے اُردو کی خاطر خواہ خدمت کی گئی اس سے پہلے اُردو شاعری میں ایہام گوئی کا کافی غلبہ ہو گیا تھا جس کے جال میں شعرا ایسے پھنس گئے تھے کہ دوسرے میدان میں قدم اٹھانا دشوار ہو گیا تھا مگر اس کو آپ اعجاز کہئے یا اُردو کی طبیعت کی مناسبت سے تعبیر کیجئے کہ کوئی بدعت یا دھبہ اپنے دامن پر بہت زیادہ دنوں تک نہیں دیکھ سکتی زبان کی عمر میں ۵۰ ۶۰ سال زیادہ نہیں ہوتے مگر کسی دور کو لے لیجئے آپ دیکھیں گے کہ اتنی ہی مدت میں ایسے عیوب جن پر زمانے نے حرف زنی کی ہو اُردو نے عمداً اُسے دامن سے دور کر دیا ہے

ایہام گوئی بھی زیادہ دنوں تک اپنا طلسم قائم نہ رکھ سکی لوگوں کو احساس ہوا اور اصلاح پر کمربستہ ہو گئے حاتم اور مظہر دونوں زبردست مصلح تھے حاتم نے ثقیل الفاظ اور عیوب قافیہ کو رفع کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا شاہ مبارک آبرو وغیرہ کے رنگ میں جو دیوان لکھا تھا اُسے منتخب کر کے دیوان زادہ تیار کیا جس کا ذکر اُن کے تذکرہ میں آ چکا ہے شاہ مبارک آبرو کے یہاں سین اور صاد کے قوافی بھی رائج تھے حروف کا دبنا معمولی بات تھی مگر حاتم نے سب کو ناجائز قرار دیا ایہام گوئی کی روک تھام مرزا مظہر نے کی اور نہایت شد و مد کے ساتھ اس خار دار جھاڑی سے اُردو کے بوستان ادب کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔

کسی بانی اصلاح کو مشکل سے یہ کامیابی ہوتی ہے کہ اپنی زندگی ہی میں اپنی کوششوں کو پوری طرح بار آور دیکھے حاتم اور مرزا مظہر دونوں کی اصلاحیں میر و سودا کے ہاتھوں سے پایۂ تکمیل کو پہنچیں لیکن سہرا ان ہی حضرات کو نصیب ہے کہ ابتدا ان ہی کے دم سے ہوئی زمانہ کو رغبت کے بجائے الفاظ کی جراحتوں اور ایہام گوئی وغیرہ سے تنفر پیدا ہو گیا چنانچہ سودا نے جب شاہ مبارک آبرو وغیرہ کے رنگ میں طبع آزمائی کی ہے تو ایک مقام پر گھبرا کر کہتے ہیں:-

حتّاک کا یسر ہی مسیحا سے کم نہیں
پیر مژدہ ہوئے مردہ تو دیوے ہے وہ جلا

نہیں چھوڑتا ہے اشک مرا دامن دکسار
یہ طفلِ بد سرشت ہے گہوارہ سے پلا

ساکی نہیں حدا سے ہی گریہ سکل زشت
ممکن نہیں کمہار کا ماٹی کرے گلا

غم سے حسراں کے خونِ جگر چھٹ اب لے نسیم
غنچے گلوں کے کچھ نہیں کھاے انھیں کھلا

اسلوب شعر کہنے کا سمرا نہیں ہے یہ
مضمونِ د آرزد کا یہ سودا ہے سلسلا

اس دور کے شعرا کا بیان سیدھا سادا اور بڑی حد تک نیچرل ہے جو جی پر گذرتی ہے بھدے اور مریدار الفاظ میں کہہ جاتے ہیں

(۴)

سودا

ان کا نام مرزا محمد رفیع تھا ان کے باپ کا نام مرزا محمد شفیع تھا میرزا شفیع تجارت کے سلسلے میں ہندوستان آئے اور یہیں رہ گئے تجارت نے ان کو دولت مند فارغ البال کر دیا تھا اتنا زیادہ اعزاز تھا کہ نعمت خان عالی کی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی سودا اسی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ سودا کے سالِ ولادت میں اختلاف ہے لیکن گمان غالب ہے کہ وہ ۱۱۰۹ھ اور ۱۱۲۴ھ کے درمیان پیدا ہوئے اور دہلی میں تعلیم و تربیت پائی باپ کے مرنے کے بعد جب ترکہ کی دولت اڑا چکے تو گذر اوقات کے لئے فوج میں سپاہی ہو گئے مگر جلد ہی اس ملازمت سے دست بردار ہو گئے خاندانی اعزاز اور اپنی قابلیت کی وجہ سے بادشاہوں اور اُمراء کا تقرب حاصل ہو گیا

اپنا کلام پہلے سلیمان قلی خاں وداد کو دکھایا پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے سودا نے پہلے فارسی میں شعر کہنا شروع کیا اور اس میں وہ درجۂ کمال حاصل کیا کہ بڑے بڑے استادوں سے خراج تحسین وصول کیا یہاں تک کہ شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے جب تک ہو سکا دہلی کو مادرِ وطن سمجھ کر وہیں رہے مگر ایک زمانہ آ گیا کہ دلی کو خیرباد کہنا ہی پڑا

سودا کے سرپرستوں کی بھی حالت دگرگوں ہوئی ناچار دل پر صبر کا پتھر رکھ کر دہلی کو خیرباد کہا اور فرخ آباد میں نواب بنگش کے یہاں آ کر قیام کیا کوئی سترہ سال

تک یہاں آسودگی سے بسر کی اس کے بعد شجاع آباد آ کر شجاع الدولہ کے دربار میں عزت حاصل کی اور باقی عمر لکھنؤ میں گزار دی ستر برس کی عمر میں یعنی ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا

شاہ حاتم زندہ تھے سودا کے انتقال کی خبر سن کر بہت روئے کہا افسوس ہمارا پہلوان سخن مر گیا

سودا ایسا دل و دماغ لے کر آئے تھے کہ اُردو کے بہت کم شاعروں کو ایسی نعمتیں ملی ہوں گی طبیعت کی ہمہ گیری اور جولانی شاعری کے حسن میدان میں ایسا رنگ دکھاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کو ہر صنف سخن پر قدرت حاصل ہے اُردو کے اکثر اصناف شاعری پر انھوں نے کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے قصائد اور ہجو میں وہ نام پیدا کیا کہ آج تک کوئی جواب نہ ہو سکا

غزل میں ان کا خاص رنگ یہ ہے کہ "کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے جیسے آگ کے شعلے میں گرمی و روشنی" الفاظ اپنی جگہ پر اس طرح جما دیتے ہیں کہ اگر ایک لفظ بھی شعر میں اِدھر کا اُدھر رکھ دیجئے تو سارا شعر بے لطف ہو جاتا ہے جب تک آپ الفاظ کی ترتیب اصلی طریقہ پر نہ دیجئے گا پورا لطف شعر کا نہیں حاصل ہو سکتا سودا کے شعر میں بندش نہایت چست ہے معنوں اور درد کا بھی حصہ کچھ کم نہیں ہے تاثیر حسن کی چاشنی اُردو غزل کے لئے ضروری سمجھی گئی اس میں بھی سودا نہایت ممتاز رتبہ رکھتے ہیں اُن کے یہاں تشبیہ اور استعارے بھی کبھی دیسی چیزوں سے پیدا کئے جاتے ہیں جو خاص لطف دے جاتے ہیں

سودا کے کلام میں ہندوستان کے رنگ و بو کا بھی کافی حصہ ہے یعنی فارسی شعرا کی تقلید میں ہندوستان کے رسوم، اشخاص وغیرہ کو نظر انداز نہیں کیا ان کا بھی نام آتا ہے ساون سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں کرشن اور دوسرے مقدس لوگوں کا بھی حوالہ جا بجا

له آب حیات۔

کلام میں دیے ہیں یہ صحیح ہے کہ ہندی کے ثقیل الفاظ انھوں نے نکال ڈالے مگر اُن کے بدل بھی پیش کیے یعنی فارسی کے محاورات کے ترجمے اردو میں نظم کیے۔ مثلاً بوکردن سے، بوکرنا یعنی سونگھنا چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں :-

دیکھوں نہ کبھی گُل کو ترے مُنھ کے میں ہوتے
سنبل کے سوا زلف تری بُو نہ کروں میں

سوداؔ کا زمانہ شعرا سا ایسا تھا کہ ہندی کے ملائم الفاظ کو ترک کرنا گناہ سمجھتے تھے ان کو برابر استعمال کرتے رہے۔ یہ بہت۔ راتی وغیرہ آپ کو اکثر اُن کے کلام میں مل جائیں گے ان کی اس روش کو اگر درد دبانتح ترک نہ کرتے تو موجودہ اردو ادب کو مضمون نگاری وغیرہ میں بہت کچھ سہولت حاصل ہو جاتی سوداؔ نے رباعی، مرثیے، غزلیں تھوڑے تو بھی کہے ہیں لیکن اُن کے قصائد ہر چیز پر بھاری ہیں۔ ناانصافی ہوگی کہ اگر ان کے قصائد کی خصوصیات بیان کیے بغیر ان کا تذکرہ ختم کیا جائے مختصر طور پر ان کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱ زمین مشکل منتخب کرتے ہیں لیکن منتخب الفاظ سے دلاویز بنادیتے ہیں
۲ قصیدے کی شان کو پوری طرح قائم رکھتے ہیں یعنی متانت، پختگی، زورِ الفاظ، مضمون آفرینی، علو تخیل جتنا ان کے قصائد میں ہیں وہ کسی اور کے یہاں نہیں ملتے۔
۳ استعارے اور تشبیہوں کے صرف میں جدت و ندرت سے کام لیتے ہیں
۴ سوداؔ کے قصائد میں محاکاتی شاعری نہایت خوبی کے ساتھ موجود ہے جو اردو کے دوسرے قصیدہ کہنے والوں کو بہت کم نصیب ہوئی
۵ سوداؔ کے قصائد میں مدح اور ہجو کے علاوہ تاریخی واقعات بھی ہیں
۶ سوداؔ کی جدت پسند طبیعت نے بہاریہ تمہید کو پامال سمجھ کر نئے عنوان بھی پیش کیے ہیں

سودا

یہ وہ خصوصیات اُن کے قصائد کی ہیں جو سودا کو نہ صرف اُردو کے شعرا سے ممتاز کر دیتی ہیں بلکہ ان کو فارسی کے بہترین قصیدہ گو کے برابر رکھتی ہیں
یہی حال ہجو کا بھی ہے غالباً مرزا سودا پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہجو کو اس قدر شدو مد کے ساتھ اُردو میں نظم کیا ہجو کا استعمال اگر اچھی طرح کیا جائے تو کارآمد باتیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں، مذاق اُڑا کر عیوب دور کئے جا سکتے ہیں، ذاتیات کو الگ کر کے عالمگیر اصلاحات بیان کی جا سکتی ہیں برائیوں کو چھوڑ کر سودا کے یہاں حسبِ ذیل خوبیاں ہیں
(۱) ان کی ہجو میں اس زمانہ کے تنزل کا بھی نقشہ نظر آتا ہے۔ شرفائے و امراء کی ردی حالت، غریبوں کی مفلسی، دہلی کے کوتوال کا ظلم یہ سب مناظر آپ کو ہجو کے میدان میں مل جائیں گے
(۲) پاکیزہ تمسخر اور شائستہ مذاق کا ایک اچھا ذخیرہ ان کی ہجو میں پایا جاتا ہے
(۳) ان کے کمال اور الفاظ پر حاکمانہ تصرف کا اندازہ ہوتا ہے اچھے برے خیالات کو ان کی جگہ پر موزوں الفاظ میں جس کے ساتھ نظم کر دینا سودا کا خاص کارنامہ ہے
(۴) سودا کے مزاج کی شگفتگی اور اُفتادِ طبیعت کا پتہ ان کی ہجوؤں سے ملتا ہے یہ رنگ آخر وقت تک قائم رہا ہے اور لطف یہ کہ اگر کوئی ان پر ہجو کہتا تو بہت خوش ہو کر داد دیتے

سب کچھ لکھنے کے بعد سودا کے مرثیوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے مرثیہ تاریخ ادب کا ایک ایسا اہم جزو بن گیا ہے کہ ہمیں اس کی ابتدا اور ترقی کا مطالعہ ہر اعتبار سے کارآمد معلوم ہوتا ہے سودا نے یہاں بھی اپنی جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے اب تک مرثیوں کی شکل غزل یا ایسی ہی دو ایک شکلوں تک محدود تھی انھوں نے اسے مربع، مخمس، مسدس، مستزاد وغیرہ تمام شکلوں میں پیش کیا انھوں نے مرثیہ کو مذہبی واقعے ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ مرقع نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری وغیرہ کا اضافہ کر کے ادب کے لئے بھی ایک خاص چیز بنا دی۔ اس عہد میں بہت سے مرثیہ نگار تھے

لیکن سودا کی حیثیت مرثیہ نگاری میں بھی ان کے ہمعصروں سے ممتاز ہے
کہا جاتا ہے کہ مرثیہ کو مسدس کی شکل میں پہلی بار پیش کرنے کا فخر سودا کو حاصل ہے لیکن یہ خیال بحث طلب ہے سودا کے زمانے ہی میں کئی ایک مرثیہ گو جیسے مثلاً میر تقی میر افسردہ وغیرہ اور ان سبھوں کے مرثیے مسدس کی شکل میں پائے جاتے ہیں اس لئے قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ پہل کس شاعر نے کی، البتہ سودا کی جدت پسندی کو مد نظر رکھتے ہوئے قیاس یہی کہتا ہے کہ ممکن ہے سودا ہی نے پہلے پہل مرثیہ کو مسدس کی شکل دی ہو

درد

ان کا نام سید خواجہ میر اور تخلص درد تھا ان کے والد کا نام خواجہ محمد ناصر تھا اور عندلیب تخلص کرتے تھے فارسی کے اچھے شاعر تھے سلسلۂ نسب خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی سے ملتا ہے خواجہ میر درد دلی میں پیدا ہوئے اور والد کے اثر سے شاعری اور تصوف کے وارث ہوئے ۔
تصوف و تالیف کا شوق بچپن ہی سے تھا چنانچہ ایک رسالہ پندرہ برس کے سن میں احکام الصلوٰۃ لکھا ۔ انتیس برس کی عمر میں واردات درد لکھا ، ایک اور رسالہ لکھا گئی تصنیفات درد کی یادگار ہیں اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ایک دیوان ہے آزاد ان کے کلام کے متعلق فرماتے ہیں "خواجہ میر درد صاحب کی غزل سات شعر نو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے ہیں گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوتی"۔ ان کی شاعری کا مرتبہ بہت بلند ہے اور تصوف کی "شمع الحقائق"

کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ درد اور کسک میں سوز و گداز میں درد کی غزلیں میر کی
غزلوں کے دوش بدوش ہیں فرق یہ ہے کہ میر کے یہاں ایک خستگی اور گھلی ہوئی افسردگی ہے
اور درد دامنے کو لئے دستے رہتے ہیں

ان خوبیوں کے علاوہ میر درد کا پایہ تصوف کے اعتبار سے غالباً اردو کے کسی
شاعر سے کم نہیں اکثر دقیق مسائل کو نہایت مزے اور اختصار کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ ہم
نے اپنی کتاب[1] میں درد کے تصوف پر کافی بحث کی ہے یہاں موقع نہیں کہ اس موضوع
پر زیادہ گفتگو کی جائے مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ بقول آزاد کے "تصوف جیسا انہوں
نے کہا اردو میں آج تک کسی نے نہیں کہا" گو ان کا اردو کا دیوان مختصر سا ہے لیکن
نفاست اور سادگی کے ساتھ خیالات میں بلندی اور جذبات[2] ہوتی ہر جگہ آپ کو ملے گا۔
الفاظ ... اور ... استعمال کرتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو الفاظ اور محاورے
اس زمانہ میں مروج تھے انہیں درد نے ترک کیا ہے کہیں کہیں ثقیل الفاظ ضرور ملتے
ہیں مگر وہ اس خوبی سے کھپائے گئے ہیں کہ اشعار ناخوشگوار نہیں ہوتے

یہ درد کی ایک ایسی خوبی قابل غور ہے کہ ان کے یہاں عشق حقیقی کا جلوہ ایسا
غالب ہے کہ مجازی تصور کو کہیں جگہ نہیں ملتی روحانیت سے خیالات کو اس طرح پاک
پاکیزہ کیا ہے جس طرح صابن سے کپڑے کا میل دور کیا جاتا ہے ان کی واسطہ اور رنگ
نے ہمیشہ دل کے دل میں گھر کر لیا تھا خواجہ میر درد کا انتقال ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ
م ۱۷۸۵ء کو ہوا ۶۶ برس کی عمر تھی دہلی میں دفن کئے گئے ان کا مزار اب تک
زیارت گاہ خاص و عام ہے

۱۔ آئینہ مسرت ... اردو شاعری میں تصوف

سوز

سوز تخلص، سید محمد میر نام، بزرگوں کا وطن بخارا تھا۔ سوز دہلی میں پیدا ہوئے، اور
وہیں نشو و نما ہوئی۔ شاہ عالم کے زمانہ میں جب دلی پر تباہی آئی تو فقیری لے کر لکھنؤ چلے گئے
یہاں بھی زمانہ نے ٹکنے نہ دیا سنہ ۱۲۱۲ھ میں مرشد آباد گئے وہاں سے پھر لکھنؤ کی خاک
دامن گیر ہو کر اسی طرف لائی۔ صاحب کمال کا جوہر اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتا اس
بار میر سوز لکھنؤ آئے تو کافی قدر ہوئی۔ نواب آصف الدولہ شاگرد ہوئے مگر افسوس
کہ زیادہ دن تک لکھنؤ میں نہ رہنے پائے تھے کہ سنہ ۱۲۱۳ھ میں اس دنیا سے کوچ کر گئے
اور وہیں پیوند خاک ہوئے

سوز کا کلام تصنع اور تکلفات سے پاک ہے۔ غزل کے لیے شیریں زبان جان ہے
وہ ان کے یہاں کافی موجود ہے۔ محاورات کا صرف اس خوبی سے ہے کہ باتوں باتوں میں
شعر بلند ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں خاص بات یہ ہے کہ اضافت، تشبیہ، استعارے
اور ترکیبیں بہت کم ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر سوز کا رجحان فارسی کی
رنگینی کے بجائے ہندی کی سادگی اور خداداد حسن کی طرف تھا۔ آزاد نے سچ کہا تھا
کہ "اگر ان انداز پر زبان رہتی اور خوب سیان کا مادہ اس میں زیادہ ہوتا
تو آج ہمیں اس قدر دشواری نہ ہوتی۔ اب دوسری مشکلیں ہیں، اول یہ کہ
رنگین استعارات اور مبالغہ کے خیالات گویا مثل تکیہ کلام کے زبانوں
پر چڑھ گئے ہیں یہ عادت چھڑانی چاہیے پھر اس میں نئے انداز اور سادے
خیالات کو داخل کرنا چاہیے"

حسن

میر غلام حسن نام اور حسن تخلص بزرگوں کا وطن ہرات تھا مگر یہ خاص دہلی کے رہنے
والے تھے وہیں پیدا بھی ہوئے تھے دہلی کی حالت جب دگرگوں ہوئی تو یہ اپنے والد
میر غلام حسین ضاحک کے ساتھ فیض آباد آئے جو اس وقت اودھ کا دارالسلطنت تھا
لیکن جب آصف الدولہ نے لکھنؤ آباد کیا تو یہ بھی لکھنؤ چلے آئے

شاعری خاندان میں بزرگوں کے وقت سے چلی آ رہی تھی خود ان کے والد میر ضاحک
بڑے پایہ کے شاعر تھے چنانچہ میر حسن نے ابتدا میں ان ہی سے اصلاح لی بعد میں میر درد
کو کلام دکھانے لگے جب دلی چھوڑ کر لکھنؤ گئے تو میر ضیاء الدین ضیاؔ کے شاگرد ہوئے
مگر ان کا رنگ کچھ زیادہ پسند نہ آیا لہذا میرؔ اور سوداؔ کے تتبع میں شعر کہنا شروع کیا
دیوان چھپ گیا ہے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درد کی صفائی محاورے کا لطف خاص
چیزیں ہیں جو ان کے یہاں نمایاں ہیں میر حسن کے یہاں محاورے کا لطف اور تغزل
قائل وجد ہے ان کو بھی تناسب لفظی کا خاص چسکا ہے غزلوں کے علاوہ قصائد بھی کہے
ہیں لیکن غزل کے سامنے پھیکے نظر آتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ میر حسن کی حیات جاودانی
کا راز نہ غزل ہے نہ قصیدہ بلکہ مثنوی جس کو اس آب و تاب کے ساتھ اردو کے دربار
میں انھوں نے پیش کیا کہ اگلے پچھلے شعرا کو سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ اردو میں نہ اس سے
پہلے کوئی اس پایہ کی مثنوی ہوئی ہے نہ آئندہ امید ہے اس لیے کہ جس ماحول میں
مثنویاں تیار ہوتی تھیں وہ مدت ہوئی کہ ختم ہو گیا فارسی ہو یا اردو دونوں زبانوں
کی قریب قریب تمام مثنویاں کسی صلہ کی امید پر لکھی گئیں ہیں۔ اب سوائے زمانی سرپرستی
کے اور کسی صلہ کی امید تو کیا بلکہ قبول سمجھنے یہ بھی امید نہیں کہ توجہ سے لوگ پڑھ لیں گے

یوں تو میر حسن نے کئی مثنویاں لکھیں لیکن ان کا بہترین کارنامہ "سحر البیان" ہے جس میں بے نظیر اور بدر منیر کا افسانہ ہے مولانا آزاد فرماتے ہیں "زمانے نے اس کی سحر البیانی پر تمام شعرا اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوا لیا" حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کی تنقید پر پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے جس کا یہاں موقع ہے نہ گنجائش لیکن بغیر اسا تسلیم کئے بھی نہیں مانتا کہ یہ مثنوی اپنے زمانہ کی معاشرتی زندگی کا آئینہ ہے جس سے اس زمانہ کے رسم و رواج تمدن وغیرہ پر کافی روشنی پڑتی ہے بیان اور طرز ادا کا لطف یہ عمدہ ہے کہ آج تک اسی رغبت کے ساتھ یہ مثنوی پڑھی جاتی ہے جو شاید اس کے زمانہ میں رہی ہو زبان اس دور اندیشی اور پاکیزگی کے ساتھ نظم کی گئی ہے کہ ڈیڑھ سو برس گزرنے کے بعد بھی بہت کم فرق معلوم ہوتا ہے میر حسن جذبات کی پوری ترجمانی کرتے ہیں بڑے بوڑھے عورت مرد بادشاہ فقیر سب کا ذکر اس مثنوی میں آیا ہے مگر ہر شخص کا خیال اور بیان حفظ مراتب و کردار نگاری کے لحاظ سے نہایت خوبی سے دکھلائے گئے ہیں یہ مثنوی اس قدر دلچسپ اور مقبول عام ہے کہ اس کے اکثر اشعار ضرب المثل ہو گئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ مبالغہ ہاتھ سے جانے نہیں پایا اور منظر و واقعہ نگاری اس خوبی کے ساتھ ہے کہ واقعوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے کلام کا نمونہ دینا بیکار ہے اس لئے کہ مثنوی سحر البیان ہر جگہ مل سکتی ہے

میر حسن کا انتقال سنہ ۱۷۸۶ء میں ہوا مصحفی نے "شاعر شیریں سخن" سے مادہ وفات نکالا

میر

میر آگرہ میں پیدا ہوئے والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر دس سال کی تھی

میر

والد کے انتقال کے بعد دہلی چلے آئے یہاں اپنے سوتیلے بھائی کے خالو سراج الدین خان آرزو کے یہاں کچھ دن رہے تحصیل علم جاری تھی مگر خالو کے برتاؤ سے میر کو بڑی تکلیفیں پہنچائیں اور دہلی سے پھر اکبر آباد چلے گئے کچھ دنوں قیام کرکے پھر مستقل دہلی واپس آگئے

میر کی شاعری کا عروج دہلی میں ہوا لوگ ان کے کلام کو دور دراز شہروں میں تحفہ لے جاتے تھے دہلی نے ان کی قدر بہت کی شاہ عالم کے دربار اور امراء کی محفل میں ان کا جوہر کمال بڑے بڑوں سے داد تحسین و تکریم لیتا لیکن بقول آزاد "خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے اور وہاں تو خود خزانہ سلطنت خالی پڑا تھا" اس لئے میر نے سینہ پر صبر کی سل رکھ کر سب دوستوں کے ساتھ آرزو، سودا اور سوز کی طرح دلی کو الوداع کہا اور ۱۱۹۷ھ (۱۷۸۲ء) میں لکھنؤ پہنچے لکھنؤ میں غیر معمولی التفات اور اعزاز کے ساتھ میر کی آؤ بھگت کی گئی نواب آصف الدولہ نے میر کے لئے دو سو روپیہ ماہانہ مقرر کر دیئے۔

میر صاحب نہایت قلندرانہ اور درویشانہ رنگ کے تھے۔ ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ کرتے تھے بات کم کرتے اور وہ بھی آہستہ آواز میں نرمی اور ملائمیت تھی مزاج میں قناعت اور غیرت ضرورت سے زیادہ تھی۔ بد مزاجی بھی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی نتیجہ یہ تھا کہ فاقے کرتے تھے دکھ اٹھاتے تھے مگر بقول آزاد اسی بد دماغی کے سایہ میں دنیا اور اہل دنیا سے بیزار بیٹھے رہتے تھے ان کی لازوال دولت یعنی سرمایۂ شعر و سخن نے ہفت اقلیم کی سلطنت کو ہیچ سمجھا۔ ان کی استادی کا اقرار نہ صرف ان کے ہم عصروں نے کیا بلکہ زمانے نے اس کو تسلیم کیا کہ اردو شاعری میں اس سے زبردست غزل گو نہ کوئی پیدا ہوا ہے نہ ہوگا جس بات کے وہ استاد تھے اتنے ہی پرگو بھی تھے ان کے کلام کا ذخیرہ بہت وافر ہے ایک دیوان فارسی

کا ہے اور چھ دیوان اردو کے ہیں بہت سی مثنویاں و قصائد بھی ان سے یادگار ہیں
ایک مختصر سا رسالہ فیض میر اور ایک اردو شعرا کا تذکرہ نکات الشعرا بھی موجود ہے
اردو کے دیوان میں علاوہ غزلوں کے رباعی، مخمس، مستزاد، ترجیع بند، ترکیب بند،
مسدس وغیرہ سب ہی کچھ ہیں واسوخت دو ہیں اور کچھ شک نہیں کہ لاحوا اسی
آزاد نے میر صاحب کو اردو میں واسوخت کا موجد قرار دیا ہے

یوں تو میر صاحب نے مختلف اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل
میں ان کا پایہ ہر شاعر سے ممتاز ہے جس کا اعتراف اردو کے مسلم الثبوت اساتذہ
مختلف اوقات میں کر چکے ہیں حقیقت یہ ہے کہ تغزل جس کا بانی اور خوش اسلوبی سے
میر صاحب نے نبھایا ہے وہ ان ہی کے حصہ کی بات ہو گئی ہے اور یہی چیز ہے جس کی
بدولت ان کی انفرادیت قائم و برقرار ہے میر کے یہاں بقول مصنف کاشف الحقائق
"سوز و گداز، خستگی، بشریت، رنگینی، ملاحت، پیری، شوخی وغیرہ کی کیفیتیں بدرجہ
کثیر پائی جاتی ہیں" اگر اس کے ساتھ ان کا خلوص بھی شامل کر لیجئے تو آسانی سے یہ
راز معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا مقابلہ تاثیر و تغزل میں کوئی دوسرا کیوں نہیں کر سکتا
اس کے علاوہ ایک اور زبردست خوبی یہ ہے کہ وہ عشق کے واردات کو اس حسن سے
بیان کرتے ہیں کہ لوگ آپ بیتی میں جگ بیتی کا مزہ پاتے ہیں۔

ان کے اشعار میں سادگی اور صفائی اتنی زیادہ ہے کہ بلا غور و فکر اشعار
ذہن میں سما جاتے ہیں اور دل میں نشتر کی طرح اتر جاتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ہر خاص و عام
محظوظ ہوتا ہے غزل میں جذبات پر اگر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں
میں اس دل کے واردات ہیں جس پر عشق کا پورا وار ہو چکا ہے میر صاحب کی زندگی
پتہ دیتی ہے کہ عین شباب میں کسی کی نگاہِ ناز کے گھائل ہو گئے تھے جس کی وجہ سے
طبیعت میں سوز و گداز اس طرح اپنا کام کر رہے تھے جیسے رگوں میں لہو۔ میر کا

درد و اضطراب اپنے ساتھ ایک خاص سکون و کیف لے کر آتا ہے سُننے والے سنتے ہیں اور بجائے کرب کے اپنے دل میں ایک اشتیاق پاتے ہیں

قصیدہ میں میر صاحب سودا سے بہت پیچھے ہیں اس لئے کہ ان پر درد اور یاس کا غلبہ ہے جو قصیدہ کے لئے ایک بڑی حد تک کارآمد نہیں اس میں شکوہ الفاظ، مضامین کی بلند پردازی اور طبیعت کی شگفتگی نہایت ضروری سامان ہیں یہاں طبیعت اس کی عادی تھی کہ ملائم الفاظ ہوں سامنے کے مضامین ہوں جس کو پژمردگی اور غم کے سانچے میں ڈھال کر شعر کا جامہ پہنا دیا جائے قصیدہ میں مدح کا حصہ خاص ہوتا ہے ان کی خوددار طبیعت کب گوارا کر سکتی تھی کہ اس میدان میں وہ زمین آسمان کے قلابے ملائیں

مثنوی اس صنف شاعری میں میر صاحب کو بہت کچھ کامیابی ہوئی۔ یہاں بھی عشق کے واردات نہایت عمدہ طریقہ سے بیان کرتے ہیں لیکن منظر نگاری رامی دسترس نہیں اور پھر بقول مصنف "کاشف الحقائق" آپ کی مثنویوں میں خارجی مضامین گویا نادار رہیں کہیں آپ صحرا، جنگل، جبال، خزاں، بہار وغیرہ جملہ خوش آیند مضامین بیان نہیں فرماتے ہیں، کردار ایسی جگہ پر موزوں نظر آتے ہیں اور بڑی خوبی سے جگہ پاتے ہیں ان کی مثنویوں نے وہ رنگ جمایا کہ اکثر شعرا نے ان کے قدم پر قدم رکھنے کی کوشش کی

میر صاحب کے کلام پر جو رائے آزاد نے دی ہے ہمارے نزدیک وہ مختصر طور پر بہترین تنقید ہے جس کو نقل کرنے پر ہم مجبور ہیں "میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں دل کے خیالات کو جو کہ سب طبیعتوں کے مطابق ہیں محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔ اسی

واسطے اس میں پستی اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہے وہ گویا اُردو کے سعدی ہیں[1]"

میر کا انتقال ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں لکھنؤ میں ہوا اور وہیں مزار بھی ہے مگر افسوس کہ سنگ مزار بھی نہیں کہ صحیح اندازہ کیا جاسکے کہ کونسی قبر ہے میر درد نے سچ کہا ہے

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

یقین

انعام اللہ خاں نام یقینؔ تخلص ان کے والد کا نام شیخ اظہر الدین تھا۔ یہ معزز خاندانِ شاہانِ مغلیہ سے متوسل تھے انعام اللہ خاں دہلی میں پیدا ہوئے ان کے حالات زندگی اب تک لاعلمی کے پردے میں پنہاں ہیں حال میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے ان کا دیوان حیدر آباد سے شائع کیا ہو باوجود جدوجہد کے میرزا صاحب کو بھی مکمل حالات زندگی نہیں معلوم ہوسکے تذکروں سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ یہ ایک خوب صورت خوش اخلاق آدمی تھے۔ افیون کھاتے تھے چنانچہ اپنے اشعار میں جابجا افیون کی تعریف کرتے ہیں ایک جگہ کہتے ہیں

نہیں مار سیاہ زلف کے کاٹے سے کیا ہوئے کہ ہم اک عمر سے عادی ہیں حالِ لب کی افیوں کے

---

[1] آبِ حیات صفحہ ۲۱۲

یقین میرزا مظہر جانِ جاناں سے اصلاحِ سخن لیتے تھے بعض تذکرہ نویسوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یقین خود شعر نہ کہہ سکتے تھے بلکہ ان کا دیوان میرزا مظہر کا کہا ہوا ہے مگر یہ محض خیال ہی خیال ہے حقیقت یہ ہے کہ یقین خود نہایت اچھے شاعر تھے، ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اگر کچھ اور جیتے رہتے تو اُردو شاعری میں ایک کارنمایاں کرتے مگر افسوس کہ پچیس برس کے سن ہی میں مار ڈالے گئے ان کے قتل ہونے کی مختلف وجہیں بتائی جاتی ہیں جن کے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ نے نہایت مدلل گفتگو کی ہے مگر پھر بھی قتل ایک رازِ سربستہ ہی رہ گیا جس کے سلسلہ میں ہم ایک اقتباس مرزا صاحب کا پیش کرکے اس غمناک واقعہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں "ان تذکروں کی کہی نہ پوچھو ایک نے کچھ لکھا دوسرے نے اس سے روایت لی مگر اپنی طرف سے تھوڑا بہت کچھ اور بڑھا دیا تیسرے نے اس کا ترجمہ کرکے رنگ ہی بدل دیا اس لئے میں یقین کے قتل کے متعلق صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے والد نے ان کو کسی ایسی وجہ سے قتل کیا جس کا سمجھنا اب ناممکن ہے کیونکہ یہ راز صرف چند لوگوں کو معلوم تھا اور وہ ان کے ساتھ دفن ہو گیا"[1] غرض یقین کا انتقال ۱۱۶۹ھ میں ۲۵ سال کی عمر میں ہوا

یقین کی زبان نہایت صاف و شستہ ہے متروک الفاظ ان کے یہاں بہت کم پائے جاتے ہیں ان کے کلام کی شوخی اور طرزِ ادا شعر میں بانکپن سا پیدا کر دیتی ہے یقین بحریں نہایت شگفتہ منتخب کیے ہیں اور کمال یہ ہے کہ ایک قافیہ کو مختلف پہلوؤں سے مختلف ردیفوں میں جگہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے معنویت میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے مرزا فرحت اللہ بیگ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ دیوان بھر میں ایک جگہ بھی نہیں ہے کہ دو جگہ ایک ہی قافیہ سے ایک ہی مضمون ادا کیا ہو۔

---

[1] دیباچہ دیوان یقین ص۲۱

یقین کا دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر درد کی طرح یقین کہتے تھے
لیکن یہ التزام خاص طور پر دلچسپ ہے کہ دیوان بھر میں ایک سو سر غزلیں ہیں
اور سب پانچ پانچ شعر کی ہیں کلام میں مزا اور نمک ہر جگہ ہے گو کہیں کہیں پر
صنعت ایہام بھی ہے لیکن اس زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے یہ امر بھی قابل گرفت
نہیں معلوم ہوتا تعقید سے کلام میں کھٹک ضرور پیدا ہوتی ہے مگر یہ اس زمانہ
کے شعرا روا رکھتے تھے یقین کے یہاں جوش و ولولہ خاص طور نمایاں ہیں
یقین نے فارسی شعرا کے خیالات لے کر کہیں کہیں نظم کئے ہیں لیکن ہمارے نزدیک
یہ سرقہ نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین نے محض
ترجمہ نہیں کیا بلکہ مضمون میں وسعت اور جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے

دور کی خصوصیات

اس دور کی خصوصیات میں چند باتیں قابل غور و داد ہیں
زبان کی صفائی ابھی ایسی نہ ہوئی تھی کہ اس میں خیالات کو پوری طرح سادگی کے
ساتھ ادا کر سکتے اس دور کے شعرا نے اس بات کا احساس کیا اور پوری طرح سے
اس اصلاح کے لئے کمربستہ ہوگئے چنانچہ فارسی کی ترکیبیں جو بقول آزاد "مصری
کی ڈلیوں کی طرح دودھ کے ساتھ منہ میں آتی تھیں انھیں گھلا یا بعض فارسی کی ترکیبوں
اور محاوروں کو اردو کے سانچہ میں ڈھال کر ایرانی سے ہندوستانی کر لیا" جتنے محاورے
فارسی کے اس دور میں اردو میں کر ہماری زبان میں آئے ہیں شاید اتنے کبھی نہیں
آئے آزاد نے ایک فہرست آب حیات کے دیباچہ میں دی ہے جو قابل مطالعہ ہے
اس زبان کی صفائی اور معیار کے قائم رکھنے کے لئے خواجہ میر درد نے اپنے
مکان پر ایک ماہانہ مشاعرہ مقرر کیا جس میں شعر و زبان کے حسن و قبح پر نظر ڈالی جاتی تھی

بعد میں یہ مشاعرہ میر صاحب کے یہاں ہونے لگا اس انجمن کو قائم رکھنے کی فکر عرصہ تک بزرگان سخن کو رہی۔

ہندی کے ثقیل الفاظ جو اب تک روڑے بن کر شاہ راہ ادب میں مخل ہوتے تھے اُن سے بھی زمینِ شعر کو پاک کر کے ہموار راستہ بنا لیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور کے شعرا کے کلام میں نفاست اور خیالات میں صفائی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ فارسی کی مانوس ترکیبیں اور ہندی کے نا خوش گوار الفاظ بہت کم ہو گئے تھے

اس دور کے شعرائے سنگ لاخ زمینیں اور پیچ در پیچ استعاروں سے بہت کچھ گریز کیا ہے تاکہ خیالات الفاظ کے ساتھ ہی دلوں میں اُتر جائیں جو تاثیر اور درد اس زمانہ میں شعرا کو نصیب ہوئی وہ نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کسی دور میں نظر آتی ہے آزاد کو اس زمانہ کا ملال ہے کہ "اس ترقی میں طبیعت کی بلند پروازی سے اوپر کی طرف توجہ نہ کیا کاش آگے قدم بڑھاتے تاکہ حسن و عشق کے محدود صحن سے نکل جاتے اور ان میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے کہ نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے نہ عجائب و لطائف کا شمار ہے "حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کی نظر فارسی شاعری پر تھی جس کے دامن پر ابھی وسعت نہ تھی جتنی مغربی زبانوں میں ہے۔ اگر وہ میدان بھی پیش نظر ہوتے تو اس دور کے شعرا کی قابلیت اور جدت ضرور اُن دوسرے میدانوں میں بھی اپنا رنگ دکھائے بغیر نہ رہتی

اس دور کے شعرا کا کارنامہ ایک اور لحاظ سے بھی قابل فخر و ستائش ہے مثنوی اور قصیدے میں وہ کام کیا کہ جو اب تک مشکل سے ہوا تھا گو یہ تو نہیں کہ اس سے پہلے ان چیزوں پر طبع آزمائی نہ کی گئی ہو لیکن جس طرح میر اور سودا نے ان اصناف شاعری کو اعلیٰ درجہ دیا کہ دونوں معراج کمال کو پہنچ گئے

غزل کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں اس دور میں اس صنف شاعری کی جو ترقی ہوئی

وہ ہر آنے والے عہد کے لیے باعثِ رشک رہی اس طرح بہ آسانی سے کہا
جا سکتا ہے کہ اردو کی دنیا میں اس وقت وہ لوگ جامہ فرسائی کر رہے تھے جن کا
نظیر مثنوی، قصیدہ اور غزل میں آج تک کوئی نہ ہو سکا

اس عہد کا کارنامہ یہیں نہیں ختم ہوتا بلکہ کچھ اور بھی باتیں ہیں مرثیہ اب تک
مسدس کی شکل میں نہ تھا اسی زمانے میں لوگوں نے مرثیہ کو بھی مسدس میں کہہ کر خیال
اور مضمون میں وسعت پیدا کر دی میر صاحب نے اردو میں ایک اور صنفِ شاعری
کا اضافہ کیا یعنی واسوخت کہہ کر اردو اور اپنے رام کو ملمد کیا مگر ہاں ان پھولوں
کے ساتھ کچھ خار بھی آ گئے مرزا سودا نے ہجو گوئی میں بھی کمال پیدا کیا جس کا عملہ اچھا
نہ تھا کیونکہ اس کی سرحد کبھی ابتذال اور فحش گوئی سے مل جاتی ہے

(۵)

جرأت

ان کا اصلی نام یحییٰ امان تھا مگر زمانے نے قلندر بخش کے نام سے مشہور کیا، ان کے باپ کا نام حافظ امان تھا ان کے بزرگوار مغلیہ خاندان کے دربار سے وابستہ تھے چنانچہ امان شاہی خطاب اکبر کا عطیہ تھا

دلی کی جب حالت خراب ہوئی تو جرأت فیض آباد آگئے اور یہاں پڑھ لکھ کر جوان ہوئے نواب محبت خان کے ملازم ہوئے ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ آئے، اور شاہ عالم ثانی کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی حاصل کی عرصہ تک یہاں قیام رہا اور یہیں ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں پیوند خاک ہوئے

جرأت شاعری میں جعفر علی خان حسرت کے شاگرد تھے جو فارسی کے ایک مشاق اور اُردو کے بھی اچھے شاعر تھے جرأت کو موسیقی سے فطری شغف تھا علم نجوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے طبیعت اتنی شگفتہ پائی تھی کہ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے تھے لیکن بعض ان میں آتشباری کے پھول کی طرح بھی ہوتے تھے جس سے کبھی کبھی لوگ تلملا اُٹھتے تھے۔ اُس زمانہ کے دربار اور محفلوں کے لئے جرأت کا وجود ایک بڑی حد تک پُرلطف خیال کیا جاتا تھا انشاء اللہ خان سے صحبت گرم رہتی تھی عین جوانی میں آنکھوں سے محروم ہوگئے تھے جس کی وجہ سے کبھی کبھی اُن حریفوں کو مضحکہ اُڑانے کا موقع ملتا تھا

جرأت اور انشاء دو ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں مسلسل غزلوں کا خاص التزام ہے معاملہ بندی جرأت کا طرۂ امتیاز ہے رندی، سرمستی اور جوش مستی کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچ کر جرأت نے اپنے لئے ایک رنگ الگ قائم کر لیا تھا۔

چھیڑ، خود رفتگی، کیف اور جذبات میں ایک لطیف شوخی پیدا کر دینا جرأت ہی ایسے استاد کا کام تھا اگر اس پہلو کو ابتذال سے بچا لیا جائے تو شاعری لطف احساسات محبت کی ترجمان نظر آنے لگی، مصحفی کے یہاں بھی اس کی جھلک پائی جاتی ہے اور موجودہ دور میں حسرت موہانی کے کلام میں بھی کبھی کبھی جرأت کے رنگ تغزل کے پہلو نظر آجاتے ہیں لوگوں کی تقلید اور پیروی سے یہ اندازہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ جرأت نے اپنے رنگ کو مقبولیت کے درجہ تک پہنچا دیا تھا

جرأت کے باکمال شاعر ہونے میں کلام نہیں انھوں نے اکثر اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے غزل، رباعی، مخمس، واسوخت جو سب کچھ ہے البتہ قصیدہ سے دیوان خالی ہے جہاں تک زبان کا تعلق ہے اس میں صفائی سادگی خاص طور سے قابل دید ہے محاورات کی سلاست اور خوش مزاجی کا شمار ہ پڑھنے والے کو اپنی طرف پوری طرح مائل کرتے ہیں لیکن انھیں کی باتیں ہیں جو کلام میں [illegible] ہے۔ درد شوخی اور بانکپن البتہ زیادہ ہے بے جا نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ کہیں کہیں شوخی حد سے زیادہ ہو گئی ہے ان کا کلام حسن و عشق کے اکثر اردو ادب کا مرقع ہے ربائیوں میں معشوق کے اعضا کا ذکر بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں دلدار، کم یار [illegible] ہے، اس لئے یہاں نمونہ کلام دیا جانا ہوگا

میں تڑپ کے سنگ تربت بصد اضطراب اٹھتا
مری قبر پر وہ آکر جو ٹھہرا [illegible] اٹھتا

مرے تو سوال سن کر وہ رہا خموش بیٹھا
نہیں یہ بھی کہیے کی جا کہ ملا جواب اُلٹا

جو رکھے ہے تحت داڑوں وہ چھپی سی کل ہو مفلس
کرے ہے یہ آنسو دریا قدحِ حباب اُلٹا

شبِ وصل یہ قلق تھا کہ وہ سو گیا تو منھ سے
نہ ذرہ بھی ہیں دوپٹہ زرہِ حجاب اُلٹا

نہیں ہے خیال اس کا کہ جو آیا خواب میں وہ
تو زباں پہ اُس کی ڈر سے نہ وہ ہم نے خواب اُلٹا

اسی در تک آؤں گا میں کہ نہیں ہے دل کہے میں
مجھے پھیر نے عشق ہو زرہِ عتاب اُلٹا

طلب اس سے کل جو مے کی تو گرا ہوا زمیں پر
مجھے شوخ نے دکھا کر قدحِ شراب اُلٹا

جو کنارِ مقصد اپنی لگے یہ کے ناؤ گاہے
تو ہوا تھپیڑ مارے لگے بہنے آب اُلٹا

کبھی مدرسہ میں پڑھنے مرے شعر جو لگا وہ
تو ہوائے دل ہی جرأت ورقِ کتاب اُلٹا

جرأت زیادہ لکھے پڑھے آدمی نہ تھے زبان عربی اور معمولی علوم و فنون سے ناواقف تھے، مگر شاعری سے دلچسپی دیوانگی کی حد تک تھی، ان کے کلام میں ایسے سارے رجحانات ملا کرتے ہیں جو ایک عیش پرست اور زوال پذیر عہد کے تقاضے ہیں مگر یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ جرأت کی شاعری میں صحت مند جنسی اشارے زیادہ نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خارجی بیانات کے دلدادہ ہیں۔

انشاء

سید انشاء اللہ خاں نام اور انشاءؔ تخلص حکیم میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے تھے بزرگوں کا اصل وطن نجف اشرف تھا خاندانی پیشہ طبابت تھا اس فن میں یہ خاندان نہایت ممتاز تھا جس کی وجہ سے شاہانِ مغلیہ کے دربار تک رسائی تھی دلی کے زوال پر میر ماشاء اللہ خاں کو مرشد آباد جانا پڑا اور انشاء اللہ خاں وہیں پیدا ہوئے باپ نے انشاء اللہ خاں کی تعلیم و تربیت میں بڑی جانفشانی کی، مختلف علوم و فنون کا ماہر کر دیا

شاہ عالم ثانی کے وقت میں انشاء اللہ خاں مرشد آباد سے دلی آئے اُن کی قابلیت اور شعر گوئی کی بدولت یہاں کافی احترام ہوا۔ انشاءؔ زورِ طبیعت اور شگفتگی مزاج سے تمام دربار پر چھا گئے یہاں تک کہ دربار کے دوسرے شعرا ایسا رنگ اُکھڑتے دیکھ کر انشاءؔ سے کبیدہ خاطر ہونے لگے اور یہ چشمک زنی بزمِ سخن کو کبھی کبھی رزم کا میدان بنا دیتی تھی اگر ایک حریف دوسرے پر تیغِ زبان سے حملہ آور ہوتا دوسرا تیرِ مذمت و ہجو سے زخمی کرنے کی کوشش کرتا مگر انشاء اللہ خاں سب پر بھاری پڑتے تھے ممکن تھا کہ یہ صحبتیں کچھ عرصہ تک گرم رہتیں کیونکہ پڑھے لکھے لوگوں کی لڑائی تھی لیکن شاہ عالم کا خزانہ خالی تھا انشاء کی ضرورت کے مطابق خرچ وفا نہ کرتا لاچار دلی چھوڑ کر وہ لکھنؤ چلے آئے

لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کا دربار دہلی کے شعرا کا پناہ گاہ تھا باپ کے دربار سے انشاء اللہ خاں کو آتے ہوئے دیکھ کر مرزا سلیمان شکوہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا قدر دانی اور خاطر اس حد تک کی کہ اپنا استاد بنا لیا حالانکہ اس سے پہلے مصحفیؔ اُن کے استاد تھے

اصلاح لیتے تھے کچھ دنوں تک انشاء یہاں رہے لیکن حوصلہ مندی کے لئے یہ دربار بھی ناکافی نظر آیا رفتہ رفتہ نواب سعادت علی خاں کے یہاں پہنچ گئے اور وہاں نواب کے مزاج میں اتنا دخل ہوا کہ تمام لکھنؤ میں انشاء اللہ خاں کا طوطی بولنے لگا اپنے مزاج اور پُرلطف طبیعت سے نواب کو ایسا گرویدہ کر لیا تھا کہ جس کو جو چاہتے دلادیتے

ایک عام مقولہ ہے کہ "زیادہ میٹھے میں کیڑا پڑجاتا ہے" انشاء اللہ خاں کی دوستی بھی اسی کی مصداق ہوئی نواب سعادت علی خاں فطرتاً نہایت متین اور سنجیدہ مزاج تھے انشاء کی ظرافت اور تمسخر ایسے مزاج کے آدمی کے لئے ایک نہ ایک دن ناگوار ضرور ہونا چاہیئے تھا مگر ابھی تک نواب کا یہ حال تھا کہ انشاء اللہ کی جدائی کسی وقت گوارا نہ ہوئی یہاں تک کہ ایک دن انشاء اللہ خاں کو جب گھر پر نہ پایا تو یہ حکم دیا کہ آج سے بجز ہمارے دربار کے اور کہیں نہ جانا کیجئے۔ اس قید نے زنجیر نے انشاء اللہ کے لئے وہی کام کیا جو کسی کے لئے طوق وسلاسل کرتے ہیں کچھ دنوں میں شکر رنجی بہت بڑھ گئی دربار سے تنخواہ بھی بند ہوگئی نتیجہ یہ ہوا کہ انشاء کے یہاں فقر و فاقہ کا دور دورہ ہوگیا اور وہی انشاء جس کے دروازے پر ہاتھی جھولا کرتے تھے اور مال و دولت بہرہ دیا کرتے تھے وہی اس عالم میں ۱۸۱۷ء میں اس دنیا سے سدھارے کہ خدا دشمن کو بھی وہ دن نہ دکھائے

آب حیات میں ایک نہایت دردناک تصویر انشاء کی آخری حالت کی آزاد نے سعادت یار خاں رنگین کی روایت کی بناء پر اتاری ہے "میں (سعادت یار خاں) اندر گیا دیکھا کہ ایک کونے میں (انشاء) بیٹھے ہیں گھٹنوں پر سر دھرا ہے آگے راکھ کے ڈھیر ہیں ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے یا تو وہ شان و شکوہ کہ جھمگٹ دیکھتے تھے وہ گرمجوشی اور چہلیوں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں یا یہ حالت دیکھی بے اختیار دل بھر آیا میں بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور دیر تک رویا جب جی ہلکا ہوا

تو میں نے پکارا کہ سید انشاؔ۔ سید انشاؔ نے سر اُٹھا کر اس نظر حسرت سے دیکھا جو کہتی
تھی کہ کیا کروں آنکھ میں آنسو بہیں میں نے کہا کیا حال ہے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر
کہا شکر ہے پھر اس طرح سر کو گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اُٹھایا"

انشاؔ کی قابلیت اور ان کا کلام اس پایہ کے ہیں کہ شاید اُردو کے اور شعراء
میں مشکل سے کسی کو یہ طرۂ امتیاز حاصل ہو اور افسوس یہ کہ اُن کی ہمہ گیر طبیعت کسی میدان
میں بند نہ تھی جس طرف اشہب قلم جھک پڑتا میدان کو روند ڈالتا کاش ایسے عالی دماغ شخص
کو کوئی ایسی سوسائٹی مل جاتی جو اس سے ڈراما یا ایسی ہی کوئی اور کارآمد چیز لکھا لیتی تو اُردو
میں انشاؔ کی بدولت شاید ایسا کارنامہ مہیا ہو جاتا جس کی نظیر مشکل سے ملتی

انشاؔ کے کلیات میں قریب قریب تمام اصناف شاعری موجود ہے علاوہ نظم کے
نثر میں بھی ایک تصنیف یادگار ہے جس کا نام دریائے لطافت ہے یہ اُردو قواعد کی پہلی
کتاب ہے جس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۸۰۱ء ہے جس کی زبان فارسی ہے۔ لیکن دوسری کتاب
کی زبان اُردو ہے جس کا نام 'رانی کیتکی' کی کہانی ہے اس میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ عربی
فارسی کا ایک لفظ بھی نہ آنے پائے یہ خالص اُردو کا ایک اچھا نمونہ ہے ان کا کلام
دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان پر قدرت اور محاورں پر حکومت کافی حاصل ہے
یہی نہیں کہ صرف اُردو، فارسی کے ماہر ہوں بلکہ کئی زبانوں سے واقف تھے چنانچہ ایک
قصیدہ لکھا ہے جو سات زبانوں میں ہے ایک قصیدہ اور ہے جو بے نقط ہے

انشاؔ کا کلام اُن کے ماحول کا آئینہ ہے یعنی ظرافت ہجو شوخی وغیرہ دیکھ کر
اُن زمانے کے ہاں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اُن کا دماغ ایک ایسا ذخیرہ تھا جو ملا کا دیا
کے اُن کے سامنے ایک لمحہ میں ہر چیز پیش کر دیتا تھا۔ کبھی کبھی کسی لفظ یا محاورے کی صحت
پر اُن سے سند مانگی جاتی تو لغت اور اساتذہ کے کلام سے فوراً نمونہ پیش کر دیتے۔
سوداؔ کی طرح انشاؔ کا رجحان فارسی، عربی کے علاوہ ہندی کی طرف بھی تھا

اس معاملہ میں یقیناً وہ سودا سے بڑھے ہوئے تھے یہ ہی نہیں کہ ہندی کے نرم اور لطیف الفاظ استعمال کرتے ہوں بلکہ اس معاملہ میں اس قدر شغف تھا کہ بحر اور اصناف شاعری کا نام عربی سے بدل کر ہندی میں کرنا چاہتے تھے چنانچہ مثلث کا نام تکڑا اور مربع کا نام چوکڑا رکھا تھا مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن۔ مفاعیلن کی جگہ پری خانم پری خانم پری خانم پری خانم فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن کی جگہ جب لگن۔ جیت لگن جیت لگن جیت لگن رائج کیا اسی طرح منطق کی اصطلاحیں ہندی میں پیدا کیں۔

یہ صحیح ہے کہ اُن کے کلام میں بے اعتدالی بہت ہے لیکن بقول آزاد "کچھ جہالت کے سبب سے نہیں بلکہ عمداً بھی" ان کی غزلوں میں داخلی پہلو بہت کم ہے ٹھٹھول اور کبھی کبھی عورتوں کا لب و لہجہ یہاں بھی نمایاں ہے البتہ علوئے تخیل کی کمی کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔

مصحفی

مصحفی تخلص غلام ہمدانی نام باپ کا نام ولی محمد تھا ان کا خاندان امروہہ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا ۱۱۹۰ھ میں کہ مصحفی کا عالم شباب تھا دلی میں آکر مشق سخن اور تحصیل علم میں منہمک ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد قابلیت اور شاعری نے ان کو بلندی پر پہنچا دیا لیکن دہلی پر ادبار کا دور دورہ تھا لکھنؤ میں سخاوت کی گنگا بہہ رہی تھی جس نے مصحفی کو بھی اپنی طرف مائل کیا دلی کو خیرباد کہہ کر آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ آئے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے اُن کے فن کی کافی قدر کی گئی یہاں تک کہ زمانے نے بحیثیت استاد تسلیم کر لیا آزاد کا خیال ہے کہ مصحفی کا انتقال ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) میں ۸ برس کے سن میں ہوا لیکن شیفتہ کو اختلاف ہے گلشن بے خار میں لکھتے ہیں کہ

۱۲۴۰ھ میں ان کا انتقال ہوا
مصحفی کے صاحب کمال ہونے کا ثبوت یہی کیا کم ہے کہ جس پایہ کے شاگرد اُن کو ملے وہ خود اپنے وقت کے مستند استاد تھے مثلاً آتش خلیق ضمیر اسیر وغیرہ گو مصحفی متین اور سنجیدہ مزاج تھے لیکن سید انشاء کی ظرافت نے ان کو بھی جواب دینے پر مجبور کیا اس وجہ سے ان کے کلام کا ایک حصہ سید انشاء کے رنگ کا ہے لیکن اس معرکہ میں انشاء سے پیچھے ہیں دیوان کی تعداد میں آٹھ ہیں جس سے اُن کی پرگوئی کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے اور لطیفہ یہ ہے کہ ہزاروں شعر قیمت لے کر بیچ ڈالتے تھے جن کو لوگ اپنے نام سے مشاعروں میں پڑھتے تھے طبیعت ہمہ گیر تھی مختلف اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے کہا جاتا ہے کہ ان کا کوئی خاص رنگ نہیں کبھی میر سوز کا انداز ہے کبھی میر کی تقلید ہے اور کہیں سودا کا ڈھنگ ہے لیکن یہ صحیح نہیں مضمون کے اعتبار سے ان کی امتیازی خصوصیت "نشاط بساط" اور "رنگ رندی" کو نہایت پُرکیف و رنگین طریقے سے بیان کر دیا ہے قصیدے نہایت اچھے ہیں شاندار الفاظ دل پسند ترکیبیں مشکل زمینیں خیال میں رفعت سب کچھ ہے لیکن سودا کا جوش و خروش کم پایا جاتا ہے ان کی ایک مثنوی "بحر المحبت" بہت مشہور ہے

مصحفی کی علمی قابلیت کا پتہ نہیں چلتا مگر خود اُن کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی سے بخوبی آگاہ تھے چنانچہ ایک دیوان بھی ان کا فارسی میں ہے مصحفی کا نام اُردو کی دنیا میں یوں بھی قابل قدر ہے لیکن تذکروں کی وجہ سے ان کی شہرت میں چار چاند لگ جاتے ہیں دو تذکرے انھوں نے اُردو فارسی شعرا کے متعلق لکھے ہیں اُردو کے شعرا کا تذکرہ محمد شاہ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے اور مصحفی کے ہمعصروں تک سلسلہ چلا آتا ہے

مصحفی نے اُردو زبان کی اصلاح میں کافی حصہ لیا بہت سے الفاظ اور

عیوب مثلاً شتر گربہ وغیرہ نکال ڈالے لیکن ایسے الفاظ رائج بھی کر دیے جو مقامی ہیں
مثلاً سپاٹ، پوٹ اسی طریقہ سے ملکی خصوصیتوں کے مضمون بھی لیے ہیں چنانچہ ایک
جگہ کہتے ہیں

دکھا رہیں نے بہہ دیں جب خشکہ بیتا آری ۔۔۔ لیے برج لے مصحفی روح ایسی پیتا آدر گئی
تختہ آسو تمیں کیوں نہ نظر آئے سپاٹ ۔۔۔ یاد آئے مجھے جس دم وہ نگمبو کا گھاٹ

اثر

سید محمد نام اور تخلص اثر تھا ان کے حالات زندگی کا بہت کم پتہ چل سکا
بس اتنا معلوم ہے کہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے اور اُن سے اتنے مانوس تھے
کہ جتنا ایک مرید اپنے پیر سے ہوتا ہے فقیری اور شاعری دونوں میں درد کی تقلید
کیے ہیں

اثر کا کلام میر درد کی طرح صاف اور سادہ ہے لیکن وہ درد نہیں جو درد کے
یہاں ہے جذبات بے ساختہ ادا ہو گئے ہیں اور بہت خوب نظم ہوئے ہیں لیکن بقول
مولوی عبدالحق "مضمون کو دیکھئے تو اُن میں تصوف ہے نہ اخلاق نہ حکمت و فلسفہ
بلکہ سچے دل کی واردات ہے جو صاف صاف سیدھے الفاظ میں اس طرح بیان کر دی
ہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہے"[1]

دیوان بہت مختصر ہے اور قریب قریب ساری غزلیں چھوٹی بحر میں ہیں کچھ
رباعیاں ہیں اور کچھ مطلع غزلیں مخمس ہیں اور زبان کے لحاظ سے فارسی ترکیبیں
ہیں مگر بہت کم یوں تو اثر کے کلام میں دل سوزی، درد، خلوص سب کچھ ہے مگر

---

[1] دیباچہ دیوان اثر ص ۳

بقول محمد حسن خصوصیت یہ ہے اثر کو اثر ملا ہے وہ ایک جدت ہے ایک گداز ہے ایک
عاشقانہ گسندگی ہے" ثقیل الفاظ بہت کم آئے ہیں اور ممکن تھا کہ ان کی ثقالت معلوم
بھی نہ ہوتی مگر چونکہ اثر کی زبان بہت نرم ہے اس وجہ سے یہ الفاظ کبھی کبھی ناگوار
ہوتے ہیں مثلاً تحجبات۔ میر اثر کا شعر ہے۔

رسب ہوئی تحجاب ہے اب
مرہی جا بس ایک بات ہے اب

اسی طرح ایہام اکھیڑے ہم وطناں وغیرہ ہیں مگر یہ حیرانی زیادہ بہیا ہے اثر
کے کلام میں چند الفاظ اور بھی قابل دید ہیں جن سے اسی دور کے لسانی رجحان پر
روشنی پڑتی ہے۔

تلوار کے بجائے تروار، آگے کے بجائے آگو، ہم نے کے بجائے ہمیں، اس نے
کے بجائے حنیں

ایک مثنوی خواب و خیال ہی ان کی یادگار ہے

دور کی خصوصیات

(۱) زبان کی اصلاح برابر جاری ہے ثقیل الفاظ برابر نکالے جا رہے ہیں جس
کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان میں صفائی اور روانی زیادہ ہوتی جاتی ہے مگر پھر بھی ٹک، ٹک،
واچھڑے، جھگڑا، زور (بہت) وغیرہ اپنی جگہ پر قائم ہیں

(۲) ہندی کے الفاظ بھی لائے گئے مگر نرم اور فصیح۔

(۳) مضمون میں بہت کم ترقی ہوئی اس دور کے شعرا بزرگوں کے خیالات کو طرح طرح
سے پیش کرتے ہیں مگر خود کوئی نئی بات مشکل سے سوچتے ہیں

(۴) ظرافت اور تمسخر کی بھرمار ہے یہاں تک کہ متانت اور سنجیدگی کی بھی آنکھیں
کبھی کبھی بند ہو جاتی ہیں

(۵) ملکی اور مقامی خصوصیات کو اس دور کے شعرا نے زیادہ جگہ دی ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کے میلے اور مختلف جشن اور اثرات کا تذکرہ پہلے سے زیادہ ہے۔

(۶) کلام میں ناہمواری اور بے اعتدالی زیادہ ہے کم شاعر ایسے ہیں جن کے یہاں یکسانیت پائی جاتی ہو

(۷) سید انشاء نے دریائے لطافت لکھ کر اُردو کے محاورات اور قواعد کو باقاعدہ کرنے کی کوشش کی

(۸) شاعری میں روحانیت اور عمق کی کمی ہو گئی بانیں ہی باتیں رہ گئیں دربارداری کی وجہ سے شعرا اپنی آزادی خیال کو کام میں نہ لا سکے، بہت کم شاعر ایسے ہیں جو دربار کی سرپرستی کے خواہاں نہ رہے ہوں اور جو دربار سے متعلق تھے وہ اپنے سرپرستوں کی خوشی کو زیادہ مدنظر رکھتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں تصوف اور جذبات عالیہ کی کمی ہو گئی

(۹) اس کے مقابلے غزل میں زور آزمائی کا میدان ڈھونڈھنا مشکل قافیے ردیف، زمیں پر زیادہ توجہ ہونے لگی اور ایسی صورت میں صرف غزل کی خانہ پُری ہو سکی معنویت اور بلندی نصیب نہ ہو سکی۔

(۱۰) ریختی کو بھی فروغ اسی زمانہ میں ہوا غالباً امراء کی خوشنودی مزاج اور تعیش پسندی کے زیر اثر اس کی نشوونما ہوئی

شعرا کے باہمی اختلافات نے جو ادبی اور فنی اعتراضات کا سلسلہ قائم کر دیا تھا اگر وہ تنقید کا پہلو اختیار کر لیتا تو اُردو کو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا تھا لیکن نہ تو اس نیت سے اعتراض کئے جاتے تھے اور نہ کسی کو سنجیدگی کے ساتھ اس کے سوچنے کی ضرورت محسوس ہوئی

(۶)

نظیر اکبر آبادی

تاریخ ادب اُردو مرتب کرنے والے کے لئے ایک بڑی دقت نظیر اکبر آبادی کے سلسلے میں یہ ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُنھیں کس دور کے شعرا کے ساتھ رکھا جائے ان کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں لیکن ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا خیال ہے کہ حملۂ نادر شاہی کے وقت دلّی میں پیدا ہوئے تھے۔ یہی قرینِ قیاس بھی ہے کیونکہ اُنھوں نے طویل عمر پائی تھی اور ان کا انتقال سنہ ۱۸۳۰ء میں ہوا اگر پیدائش ۱۷۳۹ء سے ۱۷۴۰ء کے قریب مان لی جائے تو البتہ نظیر کے عہد معین کرنے میں کچھ آسانی ہو جاتی ہے پھر بھی زبان، طرزِ بیان، موضوع کے لحاظ سے ان کو کسی دور سے وابستہ کرنے میں قطعی فیصلہ کرنا باقی رہ جاتا ہے

ہم ان کو اپنی دنیا آپ سمجھ کر ہر دور سے الگ رکھتے ہیں ان کے کلام کی خصوصیات خود ایک دور کی خصوصیات کے برابر ہیں

نام ولی محمد تھا اور نظیر تخلص کرتے تھے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا احمد شاہ ابدالی کے زمانہ میں دلّی چھوڑ کر اپنے خاندان کے ساتھ آگرہ آئے اور اکبر آبادی ہو گئے دلی اس زمانہ میں انقلابات کا گہوارہ تھی سیاسی سماجی تبدیلیاں ہو رہی تھیں نظیر کو بھی انھیں تبدیلیوں میں سے ایک تبدیلی سمجھنا چاہئے کیونکہ غزلوں کی

رسمی شاعری کو الگ کرنے کے بعد نظیر کا نہ تو کوئی ہمعصر دکھائی دیتا ہے اور نہ ہم زبان
انھوں نے میر کی قنوطیت اور سودا کی ہمہ گیری بھی دیکھی، وہ درد کے تصوف سے بھی آشنا
تھے جرأت کی معاملہ بندی مصحفی اور انشاء کی چوٹوں کا نظارہ بھی انھوں نے کیا لیکن
دلی اور لکھنؤ کے مرکزوں سے دور رہ کر اپنی ایک الگ شاہراہ بنا کر جس پر خود ہی چلے
دوسرا کوئی اور ادھر قدم نہ بڑھا سکا

نظیر ایک قناعت پسند طبیعت لے کر آئے تھے درباروں سے وابستگی نہ تھی
اُن کا حلقہ احباب وسیع تھا اور اس حلقہ میں امیر وغریب، عالم وجاہل، پیشہ ور
اور غیر پیشہ ور، ہندو و مسلمان کسی کی قید نہ تھی اس وسیع النظری اور وسیع المشربی کا اثر
ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے نواب سعادت علی خاں نے لکھنؤ بلایا تھا نہ گئے
اور تقریباً عمر بھر آگرہ ہی میں لالہ بلاس رام کے یہاں معلمی کر کے شاعری کرتے رہے
کلام کا زیادہ حصہ بھی لالہ بلاس رام ہی کے یہاں سے ملا ورنہ نظیر کو خود اس کے
جمع کرنے کا خیال نہ تھا ضعیفی میں فالج کے اثر سے انتقال کیا

نظیر کی آزاد زندگی میں شاعری کو نئی راہوں پر جانے کا موقع خوب ملا
پابندیوں کی کمی، معیار کی قید سے آزادی، زبان کی لطافتوں کے جھگڑے سے
نجات حاصل ہونے کی وجہ سے نظیر کو اپنی شاعری کی دنیا وسیع کرنے کا موقع بھی
مل سکا اور اُنھوں نے غزل سے ہٹ کر نظموں پر اپنی ساری توجہ صرف کر دی
غزلوں میں تغزل اور کیف بہت ہے لیکن ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مصنف تاریخ
ادب اُردو کا یہ کہنا کہ لکھنو کا قدیم طرز بھی نہیں گیا ہے شاید نظیر کی غزلوں کے
ان اشعار کے پڑھنے کے بعد زیادہ صحیح نہ ثابت ہو جن میں خارجیت اور
رعایت لفظی ہے

کلیات نظیر کی کچھ نظمیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جو پیشہ ور دوستوں کی فرمائش

یہ لکھی گئیں اور کچھ وہ ہیں جو ممکن ہے لالہ بلاس رام کے لڑکے یعنی اپنے شاگرد کو خوش کرنے
کے لئے جانوروں اور چڑیوں کے بارے میں لکھی گئیں لیکن انھیں میں بعض نظمیں ایسی بھی
دیکھی جا سکتی ہیں جن میں تصوّف کا کوئی مسئلہ استعاروں کنایوں میں بیان کیا گیا ہے
ان نظموں کا ذخیرہ بھی کافی ہے جو جوانی اور جوانی کی سرمستیوں کا ذکر کرتی ہیں اگرچہ لہجہ
اور اندازِ بیان کہیں کہیں مبتذل ضرور ہو گیا ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے
ایسا نہیں ہے کہ بہت زیادہ ناگوار ہو پھر اُن نظموں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن میں
افلاس کی زندگی کو فطرت کی رعنائیوں کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے
بارِ زندگی کی تکلیفوں کی تصویر کھینچی گئی ہے چاہے وہ غریبی اور بڑھاپے کی وجہ سے
ہو یا عشق یا کسی اور سبب سے لیکن جن نظموں کی وجہ سے نظیرؔ کا نام زندہ رہا وہ اُن
کی واعظانہ اور ناصحانہ نظمیں ہیں جن میں کہیں تمثیل کی مدد سے اور کہیں صاف صاف لفظوں
میں زندگی کی بے ثباتی اور موت کا یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے جوانی میں جتنی
رندی اور مستی کا منظر پیش کیا تھا یہ بڑھاپے میں اُسی کا ردِ عمل معلوم ہوتا ہے۔ مذہبی نظموں
میں جہاں اسلام کے بعض رہنماؤں کا ذکر ہے وہاں گرونانک بھی آگئے ہیں اور اُن کے
کلیات کا اچھا خاصہ حصہ ہندو مذہب کی روایات اور تہواروں کے رنگین اور دلکش بیان
کے لئے وقف ہے

جیسا کہ ابھی بیان ہوا اُن کا تعلق کسی مرکز سے نہ تھا اس لئے وہ عوام کے قریب آگئے
اسی لئے اُن کو وہ زبان بھی اختیار کرنی پڑی جو عوام کے لئے قابلِ فہم ہو شاعری کی
صناعانہ تکلف تو اُن کے یہاں نہ ہو سکی لیکن اندازِ بیان کے لحاظ سے انھوں نے اپنے
فنی شعور کا پورا ثبوت دیا ہے انھوں نے نظم کی زبان موضوع کے اعتبار سے اختیار کی ہے
چنانچہ نظیرؔ کے کلیات کا مطالعہ کرنے والا مختلف قسم کی زبانوں کے نمونے دیکھے گا جو
موضوع کی مناسبت سے اس کے گرد کھینچے گئے ہیں۔

نظیرؔ کے یہاں جو شاعرانہ داعیہ اور بیان کی صداقت ملتی ہے اس میں اگرچہ خیال کی گہرائی اور تاثیر کے تیر نشتر نہیں لیکن پھر بھی وہ ہمیں یہ ماننے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ہم نظیرؔ کو ایسا شاعر مانیں جس نے اپنی نظم کا مواد روزانہ کی زندگی سے حاصل کیا۔ اور اسے اپنے رنگ میں پیش کیا یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں مقامی رنگ کافی ملتا ہے وہ کسی وقت خالص مثالی چیزیں نہیں پیش کرتے بلکہ اپنے گرد و پیش کے مناظر اور واقعات کو ایک پُرخلوص سادگی کے ساتھ سامنے لاتے ہیں ان کی زندگی اور شاعری میں ایک طرح کی ہم آہنگی ہے جو نظم لکھنے والے کے لئے ضروری ہے۔ نظیرؔ کے بارے میں نقادوں نے مختلف قسم کی رائیں قائم کی ہیں کسی نے انھیں شاعر ہی نہیں مانا ہے اور کسی نے انھیں انیسؔ وغیرہ سے بڑا شاعر سمجھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ شاعر تھے مگر صفِ اوّل کے نہیں ڈاکٹر سکسینہ نے مختصر لفظوں میں بہت صحیح لکھا ہے کہ "نظیرؔ میں سوداؔ کا زور، میرؔ کی بلند پروازی، انشاءؔ کی ظرافت، انیسؔ و دبیرؔ کا جوش و خروش نہیں ہے مگر یہ سب صفات اُس میں ایک حد تک ضرور پائی جاتی ہیں"

(۷)

ناسخ

امام بخش نام، ناسخ تخلص تھا۔ پیدائش فیض آباد میں ہوئی۔ بعد میں لکھنؤ چلے آئے۔ اُن کے خاندانی حالات پر مختلف ارباب قلم نے مختلف رائیں قائم کی ہیں لیکن ان باتوں کو نہ تو تاریخ ادب سے تعلق ہے اور نہ بحث اتنی خوشگوار ہے کہ اسے یہاں چھیڑا جائے بس اتنا مان لینا کافی ہے کہ دنیائے ادب میں ان کی ترقی ذاتی تھی۔

ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا خوراک کی مقدار کچھ کم نہ تھی۔ پانچ سیر پختہ کھاتے تھے جس پھل کے لیے جی چاہتا لگن اور سینیاں بھر کر سامنے منگاتے اور دَم کے دم میں صاف کر جاتے مگر یہ سب باتیں اُن کے جُثّہ کے لحاظ سے نامناسب نہ تھیں۔ نہایت قوی ہیکل تھے۔ بلند بالا فراخ سینہ منڈا ہوا سر سیاہ رنگ کھاروے کا لنگ باندھے شیر کی طرح بیٹھے رہتے تھے۔

لکھنؤ میں اُنھوں نے عربی، فارسی پڑھی۔ تحصیل علم کے بعد اصلاح کلام کے لیے میر کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن اُنھوں نے اصلاح کی زحمت نہ کی۔ خواجہ عشرت لکھنوی مصنف "آبِ بقا" کا خیال ہے کہ میر کے انکار کے بعد مصحفی اور [illegible] سے ناسخ اصلاح لیتے رہے لیکن عام طور سے یہ مشہور ہے کہ اُنھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی خود

دلی سے فیض آباد آئے آتش کی ولادت کا فخر فیض آباد ہی کو حاصل ہے ابھی کم سن ہی تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا لہذا تعلیم پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی بعد میں فارسی عربی کسی حد تک پڑھلی تھی

آتش کے خاندان میں پیری مریدی کا بھی سلسلہ چلا آتا تھا لیکن انھوں نے خاندانی روش چھوڑ کر شاعری اختیار کی شیخ مصحفی کے شاگرد ہوئے اور اپنا نام پیدا کیا کہ مسلم الثبوت استاد ہو گئے بلکہ سیکڑوں شاگردوں کو استاد کر دیا

اسی روپیہ ماہانہ بادشاہ لکھنؤ سے ملتا تھا پندرہ روپیہ گھر میں دیتے تھے' اور باقی راہ خدا میں غریبوں کو تقسیم کر دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مہینہ میں ایک آدھ فاقہ بھی ہو جاتا اکثر شاگرد امیرزادے تھے لیکن کوئی سلوک کرنا چاہتا تو یہ مشکل سے قبول کرتے گو فقیری چھوڑ دی تھی لیکن فقیرانہ انداز ان کی طبیعت سے کبھی نہ گیا آزاد ان کی طرز معاشرت کے متعلق لکھتے ہیں "ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں جس پر کچھ چھت کچھ چھپر سایہ کیے تھے بوریا بچھا رہتا تھا اسی پر ایک لنگ باندھے صبر و قناعت کے ساتھ بیٹھے رہے اور عمر چند روزہ کو اس طرح گزار دیا جیسے کوئی بے نیاز دبلے پر داہ فقیر تکیہ میں بیٹھا ہو کوئی متوسط الحال اشراف یا کوئی غریب آ جاتا تو متوجہ ہو کر باتیں بھی کرتے تھے امیر آتا تو دھتکار دیتے تھے وہ سلام کر کے کھڑا رہتا کہ آپ فرمائیں تو بیٹھے یہ کہتے "ہوں! کیوں صاحب! بورئے کو دیکھتے ہو کہ کپڑے خراب ہو جائیں گے یہاں مسند تکیہ کہاں ہے؟"

ضعیفی تک بانکپن اور سپاہیانہ وضع کے ساتھ رہے گیردانہ بند باندھتے تھے ایک ڈنڈا بھی ہاتھ میں ہوتا تھا سر میں سلیم شاہی جوتا ہمیشہ دیکھا گیا رنگ چپے کا سو عمر بھر رہ گیا آخر وقت میں بینائی جاتی رہی تھی آزاد لکھتے ہیں کہ "۱۲۶۳ھ میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ یکایک موت کا ایسا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے

آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہوتا تھا میر دوست علی خلیل نے تحریر دیکھیں گی

آتش، ناسخ کے ہمعصر تھے جن سے مشاعروں میں ہنگامہ آرائی رہی مگر صرف نوک زبان تک محدود رہتی سودا اور انشاء کی طرح ہاتھا پائی کی نوبت نہ آتی لیکن اسا ضرور ہے کہ اس جوش کو آداب دربار بھی دبا نہیں سکتا تھا۔ کبھی کبھی سر دربار نوک جھونک ہو جاتی آتش کا کارنامہ صرف ایک دیوان غزلوں کا ہے جو اُن کے سامنے رائج ہو گیا تھا دوسرا تتمہ ہے جو اُن کے بعد مرتب ہوا

لکھنؤ اسکول کا سب سے بڑا کام زبان کی درستی تھی چمنستان اُردو کو خس و خاشاک سے پاک کرنا اس نے اپنا فرض سمجھا اور انصاف یہ کہتا ہے کہ اس معرکہ میں اس اسکول کو بہت کچھ کامیابی ہوئی ناسخ نے خاص طور پر اصول مرتب کئے کہ کون الفاظ رکھے جائیں اور کون نکالے جائیں آتش نے صفائی زبان کو اپنے یہاں آئینہ کر کے دکھایا چنانچہ سب سے پہلی خصوصیت جو اس کو سوا ہے آتش کے یہاں ملے گی وہ زبان کی صفائی اور محاورات کا بہترین صرف ہے

روزمرہ اور بول چال کا لطف آتش کے کلام میں بے حد مزا پیدا کر دیتا ہے رنگینی اور شوخی ان کے کلام کی دلکشی دوبالا کرتی ہے اور پھر اُس پر لطف یہ کہ اختصار کے ساتھ مضمون ادا ہوتا ہے جو سونے میں سہاگے کا کام دیتا ہے۔ مثلاً

ناگفتنی ہے عشق بتاں کا معاملہ
ہر حال میں ہے شکر خدا کچھ نہ پوچھیے

کہا جاتا ہے کہ آتش کے کلام میں صرف باتیں ہی باتیں ہیں علو تخیل و بلند پروازی مفقود ہیں مگر یہ خیال محض ان کے حریفوں کا ہو سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان کا دیوان مضامین بلند سے خالی نہیں فقیرانہ اور آزادانہ رنگ آتش کو انفرادی حیثیت دے کر

دوسرے شعراء سے ممتاز کرتا ہے اور شعر میں جان پیدا کر دیتا ہے ایک جگہ کہتے ہیں -

مرا فقر دیا جائے ادب سے عاقل
بادشاہ تخت سے یاں اپنے اُتر لیتا ہے

کام ہے شیشے سے ہم کو اور نہ ساغر سے غرض
مست رہتے ہیں شراب رخ مردر سے غرض

آتش کے یہاں تصوف کی چاشنی اس مزے اور آزادی کے ساتھ ہے کہ بے جا نہ ہوگا اگر اُن کو اُردو کا حافظ کہا جائے مستی کا عالم ملاحظہ ہو۔

جہاں وکار جہاں سے ہوں بے خبر میں مست
زمیں کدھر ہے کہاں آسماں نہیں معلوم

آتش ثقیل الفاظ بہت کم استعمال کرتے ہیں اور جہاں کہیں ایسے الفاظ آجاتے ہیں وہاں طرز ادا اور نشست الفاظ کی وجہ سے ان کو بھی دلچسپ سا دیتے ہیں مثلاً "القصہ" کی ساخت کو دیکھئے تو غزل کے لئے ناخوشگوار معلوم ہوتا ہے مگر آتش نے کس مزے کے ساتھ اس کو نظم کیا ہے

حافظ رُخ کتابی محبوب کے ہیں ہم
القصہ ہے ہمیں یاد ہو گیا

حسن کے خارجی لوازمات کی تعریف اس زمانہ میں معمول عام تھی مگر کہنے والے کبھی کبھی خود اُلجھ کر رہ جاتے تھے معنویت اور سادگی تو دور شعر مہمل پہیلیاں ہو جاتا تھا مگر خواجہ آتش نے کمال کیا ہے کہ اس رنگ میں بھی دلکشی اور رنگین آفرینی قائم رکھی ہے آتش تشبیہات کو کس بے رنگی سے پیش کرتے ہیں "تلاش کہتے ہیں -

اس کی بہار میں تو مجھے مار ڈالا رے
قاتل سے دوا نہ اُمید دیم سے

آتش کے یہاں چند کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں کبھی کبھی عامیانہ مضمون نظم کر جاتے ہیں جن کو بلا خوف یہ کہہ سکتے ہیں کہ باتیں ہی باتیں ہیں دوسرے یہ کہ الفاظ صحیح طور پر بعض وقت نظم نہیں ہوتے خواہ آپ اس کو علمی استعداد کی کمی سمجھئے یا یہ کہہ کر چپ ہو جائیے کہ عوام کی زبان پر یہ لفظ ایسے ہی رائج تھا جس کو آتش نے نظم کیا اس قسم کی مثالیں اور لوگوں کے یہاں بھی ملتی ہیں مثلاً میر مسجد کو مسیت کہتے ہیں اسی طرح آتش نے بھی چند الفاظ لکھ دیئے ہیں مثلاً تمسک کو تمش اور الشاعت کو المصاف حلوا کو حلوہ وغیرہ ان کے یہاں سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ناہمواری کلام ہے۔

ماحول سے شعور ہو کر آتش نے بھی نوشت و رعایت لفظی پر زیادہ توجہ کی جا بجا کلام کا کافی حصہ اس خصوصیت سے مجروح نظر آتا ہے اسی موقع پر کیف و تاثیر دونوں کی کمی نظر آتی ہے صاف نظر آتا ہے کہ قافیہ پیمائی اور رعایت لفظی کے لئے یہ اشعار رکھے گئے ہیں لیکن جہاں کہیں آتش روایتی شاعری سے الگ ہو کر اپنی مردانگی و وضع داری کے ساتھ جذبات قلمبند کرتے ہیں وہاں ان کی امتیازی خصوصیت ان کو اردو کے بہترین شعراء کی صف میں جگہ دلاتی ہے

دیاشنکر نسیم

پنڈت[1] دیاشنکر نسیم ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا لکھنؤ آپ کا وطن تھا جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا اردو، فارسی میں تعلیم پائی شعرائے اردو و فارسی کا کلام نظر سے گزرتا رہا خلقی طبیعت داری اور ذہانت نے شاعری کا شوق لگایا غرض کہ بیس برس کی عمر میں شعر و سخن کا اچھا خاصا مذاق پیدا کر لیا خواجہ حیدر علی آتش کی گرمی

---

[1] ماخوذ از مضامین چکبست

سے داتش بیانی نے ایسا فریفتہ کیا کہ ان کی شاگردی اختیار کی اپنی قابلیت کی وجہ سے بہت جلد شہرت حاصل کرلی مگر افسوس کہ موت نے بے وقت حملہ کیا ۵۶ سال کی عمر میں ہیضہ کی بیماری نے دفعتہً ۱۸۶۴ء میں خاتمہ کر دیا

نسیم پستہ قامت گندمی رنگ سیہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے سلسلہ معاش یہ تھا کہ شاہی دور میں وکیل تھے بڑے ظریف و بذلہ سنج آدمی تھے تیزی ذہن و دکاوت طبع کا عجب عالم تھا حاضر جوابی نیچ زبان کی جوہر تھی ان ہی صفات خاص نے ان کا وقار معاصر شعرا میں قائم کیا

نسیم کی غزلیات میں آتش کے کلام کی طرح دنیا سے بے پروائی، خود داری، زندگی کی بے ثباتی اور بے باکی ہر جگہ نمایاں ہے زبان کا لطف عام طور سے آتش کے کلام کا مزہ دے جاتا ہے نسیم اپنے زمانے کے مذاق کے اعتبار سے تناسب لفظی کے بہت دلدادہ نظر آتے ہیں مگر معنویت و پاکیزگی کا بھی کافی خیال ہے ان کے کلام میں برجستگی و اختصار کی وجہ سے شعر میں خاطر خواہ خوبی پیدا ہو جاتی ہے، استعاروں کی ندرت اور تشبیہوں کی دل کشی سے کلام میں ایک نمایاں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے

نسیم کے متعلق چکبست کا یہ خیال ایک بڑی حد تک درست ہے کہ "گو یہ آتش کے شاگرد تھے لیکن آتش کی گرمی سخن ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی ان کی مشکل پسند طبیعت نے ناسخ کا رنگ پسند کیا مگر باوجود تصنع کے جو اس رنگ کا خاص جوہر ہے۔ نسیم کا کلام بالکل بے نمک نہیں طبیعت میں ایک خداداد کیفیت ہے جو کلام کو مزیدار بنا دیتی ہے[1]"

نسیم کا ایک چھوٹا سا دیوان ہے جس میں علاوہ غزلوں کے چند مخمس و ترجیع بند بھی ہیں مگر ان کی حیات جاودانی کا باعث یہ دیوان نہیں بلکہ وہ مثنوی ہے جس کا نام "گلزار نسیم" ہے۔

---

[1] مضامین چکبست ص۱۱۱

اس مثنوی کا خاص جوہر اختصار، پختگی کلام تناسب لفظی بندش کی چستی ہے سچ تو یہ ہے کہ نسیم نے تناسبِ لفظی کی صنعت کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا ہے اُردو شعرا کو قریب قریب ہمیشہ اس صنعت سے کم وبیش دلچسپی رہی ہے لیکن آتش و ناسخ کے زمانہ میں ضرورت سے زیادہ لوگوں کو اس کا چسکا ہو گیا تھا بعض لوگوں کا یہ ذوق جنون کے درجہ تک پہنچ گیا تھا بغیر رعایتِ لفظی کے کوئی شعر اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا امانت کا نام کس نے نہ سنا ہو گا ان کو اس صنعت سے خاص شغف تھا لیکن لطافت ومتانت ان کے شعروں میں تناسبِ لفظی کی وجہ سے مجروح ہو جاتی ہے نسیم کا احسان ہے کہ انھوں نے اس رعایتِ لفظی کو اپنی مثنوی میں لوگوں کے مذاق کا خیال کرتے ہوئے اس لطافت ومتانت کے ساتھ جگہ دی کہ گویا دنیا کو راستہ بتا دیا ہے کہ اس میدان میں یوں قدم اُٹھایا جائے تو بجائے پاؤں لڑکھڑانے کے خرامِ ناز کا لطف پیدا ہو سکتا ہے گلزارِ نسیم کا دامن آورد سے پُر ہے لیکن روانی، دبر جستگی کی وجہ سے آورد بھی آمد کا لطف دے جاتی ہے عموماً یہی معلوم ہوتا ہے کہ تناسبِ لفظی کو خواہ مخواہ اشعار میں جگہ نہیں دی گئی بلکہ طبیعت کی موزونیت نے ضرورت کے لحاظ سے یہ بے ساختہ صرف کر دیئے ہیں

اس مثنوی میں اختصار معنی آفرینی ہر لحاظ سے نہایت قابلِ قدر ہے ایک شعر میں معنی کے اعتبار سے کئی کئی شعر کے مضامین بھر دیئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہر جگہ مطلب واضح ہو جاتا ہے شاذ ونادر ہی کوئی موقع ایسا ہوتا ہے کہ مفہوم صاف نہ ہو نسیم کے یہاں رنگین بیانی کی وجہ سے سوز وگداز مثنوی میں بہت کم ہو گیا ہے لیکن بقول چکبست" نسیم کے اشعار زبان کی پاکیزگی اور ترکیبِ الفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم بنے ہوئے ہیں"[1]

---

[1] مضامین چکبست ص۱۲۹

نصیر

نصیر الدین نام تھا اور نصیر تخلص سیاہ فام آدمی تھے اس وجہ سے گھر والے میاں کلّو بھی کہتے تھے ان کے والد کا نام شاہ غریب تھا وطن خاص دہلی تھا خاندان میں فقیری اور پیری مریدی عرصہ سے چلی آرہی تھی شاہ نصیر چونکہ اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے اس لیے بڑی ناز و نعمت سے پرورش ہوئی تھی غریب باپ نے اُستاد و ادیب رکھ کر شاہ نصیر کی تعلیم پر پوری توجہ کی مگر یہ اتفاق تھا کہ علمی استعداد پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکی

شاعری میں نصیر نے شاہ محمدی مائل سے اصلاح لی تھی شاہ عالم کے زمانہ میں شاہ نصیر کی شاعری کو فروغ ہوا اور وہ دربار میں بڑی قدر و منزلت سے رکھے گئے ان کو بھی دربار سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ جب انگریزی عملداری ہوئی تو دربار چھوڑ کر حیدرآباد اور لکھنؤ کا سفر کرنے لگے مگر وطن کی محبت چین نہ لینے دیتی تھی کئی بار دہلی آ آ کے گئے شاہ نصیر کی ذات اس لئے بھی قابلِ قدر ہے کہ جو فرض ولی کی وجہ سے دکن کا شمال پر ہو گیا تھا اس کی ادائیگی میں انھوں نے بڑی دلچسپی لی یعنی جب شاہ نصیر دکن پہنچے تو وہاں شعر و شاعری کا چرچا کم ہو چلا تھا لیکن ان کی آمد سے وہی کام کیا جو ولی کی موجودگی نے دہلی میں کیا تھا بزم سخن پھر روشن ہو گئی اور سینکڑوں نے شاہ نصیر کی شاگردی کی

شاہ نصیر کئی بار لکھنؤ تشریف لائے اور مشاعروں میں استادوں سے معرکہ آرائیاں رہیں یہاں آنے سے شاہ نصیر نے بھی ناسخ و آتش کا رنگ اختیار کیا اور اُن کے کلام میں سوائے رنگینی رعایت لفظی کا عنصر غالب ہو گیا اس کے اثر سے دہلی کے اور شعرا بھی نہ بچ سکے بقول میر انیس۔ ع بچا نہ گرد سے دامن بہت بچا کے چلے

ان کے مزار کا فخر دہلی اور لکھنؤ کو نہیں بلکہ حیدرآباد کو حاصل ہے۔ جہاں ۱۸۴۲ء میں اس دارفانی سے شاہ نصیر نے رحلت کی۔

ان کا کلام کمیاب ہے تھوڑا بہت کہیں کہیں مل جاتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظرافت کی چاشنی اور تشبیہات کی دلاویزی اُن کے کلام کی جان ہے زور بھی کافی ہے اور کمال یہ ہے کہ سنگلاخ زمینوں میں بھی یہ زور قائم رہتا ہے۔ کبھی کبھی تشبیہہ۔ استعارے عامیانہ بھی ہو جاتے ہیں

شاہ نصیر کو بدیہہ گوئی میں بڑا ملکہ تھا۔ برسر مشاعرہ غزلیں کہتے تھے اور برجستہ اصلاح دیتے تھے

ذوق

شیخ ابراہیم نام ذوق تخلص تھا شیخ محمد رمضان کے لڑکے تھے ذوق ۱۲۰۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے جب ذرا ہوش سنبھالا تو اُن کے والد نے حافظ غلام رسول کے پاس پڑھنے کو بٹھادیا حافظ جی شاعر بھی تھے ہر وقت ان کے یہاں شعر و شاعری کا چرچا رہا کرتا تھا وہیں سے ذوق کو بھی شعر گوئی کا شوق ہوا اور حافظ جی سے اصلاح لینے لگے بعد میں شاہ نصیر کو دکھلانے لگے رفتہ رفتہ مشق سخن نے ذوق کو اُستاد بنا دیا یہاں تک کہ ولی عہد سلطنت بھی ذوق سے اصلاح لینے لگے اور ذوق نے اپنی قابلیت کا وہ سکہ جمایا کہ خاقانی ہند کا خطاب دربار سے عطا ہوا بعد میں خان بہادر بھی ہو گئے تھے ساتھ ہی ساتھ ایک ہاتھی مع ایک موضع نقرئی کے مرحمت ہوا تھا

اُن کا انتقال ۱۸۵۴ء میں ہوا مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ذوقؔ فطرتاً نہایت نرم دل اور سنجیدہ مزاج تھے خوفِ خدا دل میں اس قدر تھا کہ عمر بھر اپنے ہاتھ سے کوئی جانور ذبح نہیں کیا موسیقی سے خاص دلچسپی تھی نجوم اور رمل میں بھی کافی دستگاہ تھی طب میں بھی دخل تھا نماز درروزہ کے بہت پاسد لمے گھنٹوں عبادتِ خدا میں مصروف رہا کرتے۔

ذوقؔ کے کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلوں میں تغزل کا انحصار برجستگی اور کسی قدر رنگینی بھی ہے لیکن ذوقؔ کی ایک اہم خوبی جو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے وہ زبان اور محاورات کی کوشش ہے زبان کی صفائی اور لطافت میں مشکل سے کبھی فرق آنے پاتا ہے بلکہ ایسے مزے کے ساتھ الفاظ کو شعر کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے کہ خود بخود ترنم پیدا ہو جاتا ہے

محاورہ ہر ایک شاعر صرف کرتا ہے حوبی پیدا ہونا یا نہ ہونا اس کے امکان میں نہیں کمال اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب زبان گھر کی لونڈی ہو اور دل کی بجائے آمد ہو اور اُس کے ساتھ طبیعت میں خداداد لطافت اور مذاقِ سلیم کا غلبہ ہو تب ہی نظر انتخاب باغ زبان سے وہ پھول چھانٹ کر لائے گی جو نہ صرف شگفتہ اور دیدہ زیب ہوں بلکہ جن کو دماغ کا باغباں سر آنکھوں پر جگہ دے گا۔ دلی کی زبان جس قدر صاف اور نرم ہے وہ محتاجِ بیان نہیں اور پھر ذوقؔ ایسا مستند اور ثقہ جو محاورہ صرف کرتے ہیں وہ شعر کی جان ہو جاتا ہے اور شعر میں دلآویزی پیدا کر دیتا ہے

اخلاقِ حسنہ جس کثرت کے ساتھ ذوقؔ کے کلام میں ہیں وہ شاید ہی کسی دوسرے غزل گو کے یہاں دستیاب ہوسکیں تصوف کی چاشنی غزل میں ایک حد تک ضروری سمجھی گئی ہے چنانچہ اُن کے یہاں بھی تصوف کا عنصر آپ کو کافی ملے گا تصوف کے اکثر مسائل پر انھوں نے روشنی ڈالی ہے وحدتِ وجود وصال، فنا، بقا و عبرہ کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے

جہاں کہیں ولی کے کلام میں شوخی کی جھلک ہے دلکشی کا سرمایہ ہے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

مشکل ہے مرے عہدِ محبت کا ٹوٹنا
اے بے وفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں

اشعار میں ضرب المثل نظم کرنے میں کوئی اُن کا ثانی نظر نہیں آتا اس خوبی سے ضرب المثل کا صرف کرتے ہیں کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ زبردستی لائے ہیں بلکہ شعر میں خود بخود آ گئے ہیں اتنا صرف ہی نہیں معلوم ہوتا کہ اُن کی معلومات کا دائرہ وسیع ہے بلکہ علم و فضل کا بھی اندازہ ہوتا ہے کیونکہ نہ صرف اُردو، ہندی بلکہ عربی و فارسی کی بھی مثلیں پائی جاتی ہیں تشبیہات اور استعارات پر نظر ڈالیے تو اکثر اُن میں سے نئے اور عمدہ ملیں گے جن کی وجہ سے تاثیر کلام اور تیز ہو جاتی ہے

ولی جب کبھی شعر میں گفتگو کا پہلو پیدا کرتے ہیں تو ایک ادا ایسی ہوتی ہے جو اُن کے کلام کی محبوبیت کو دوبالا کر دیتی ہے تشبیہ اور استعارے کی طرح ان کے یہاں سے فقرے اور ترکیبوں کا بھی ابھار ہے مثلاً تو دہ حسرت، کفِ ہر شاخ، نظارۂ رنگِ بہار، سیرِ چمن وغیرہ

ولی کے شعر عام طور سے صاف اور سادے ہیں غالب کی طرح مشکلات کے سرمایہ دار نہیں لیکن جدبات اور مضمون آفرینی عام طور پر ملحوظ ہے ولی کا مذاقِ خاص یہ ہے کہ کسی قدر شوخ اور اس کے ساتھ رعایت لفظی لیکن بہوت ہی بعید از قیاس مائیں نہیں لاتے۔ مجموعی حیثیت سے ان کی غزلیں پُر اثر نہیں سیر دگی و ربودگی نہ ہونے کے برابر ہے تخیل میں بلندی، کلام میں کیف بہت کم ہے مولویانہ ذہنیت کا غلبہ ان کے دیوان میں ہر جگہ ہے اکثر اشعار فاقیہ پیمائی کے ذوق میں کہے گئے ہیں اور رعایت لفظی سے آراستہ کیے گئے ہیں مبالغہ کو شاید بلند پردازی کا مرادف سمجھ کر زیادہ زور و جوش کے ساتھ کلام میں صرف کیا گیا ہے۔

قصیدہ گوئی میں ذوق کا پایہ بہت بلند ہے سودا کے بعد اس صنف شاعری کے معیار قائم رکھنے میں انھوں نے بڑی قابلیت سے کام لیا مضامین میں تنوع، بیان میں زور و علمیت خاص طور سے نمایاں ہے الفاظ کا نادر و دلکش ذخیرہ عربی سے ایک جا کرتے ہیں ترنم کا بہت خیال رکھتے ہیں تشبیب میں عموماً ندرت و پُرکاری سے کام لیتے ہیں مختلف عنوانات سے دلچسپی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں مختلف مسائل پر بحث بھی کرتے جاتے ہیں روانی پر سب سے زیادہ توجہ ہے، باوجود سنگلاخ زمین و الفاظ کے ذہن کو رکاوٹ نہیں ہوتی مگر بلندی تخیل کی کمی اور جامعیت و ندرت کا فقدان ذوق کو سودا کے برابر نہیں پہونچنے دیتے۔

غالب

اسد اللہ خاں نام مرزا نوشہ لقب تھا نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ شاہی خطاب تھا پہلے اسد تخلص کرتے تھے بعد میں غالب ہو گئے اُن کا خاندان ایران کا تھا اور سلسلۂ نسب افراسیاب بادشاہ توران تک پہنچتا ہے جس پر مرزا کو بڑا ناز تھا مرزا کے دادا شاہ عالم کے وقت میں دلّی آئے تھے یہاں سلطنت نے اُسے حسب حال اُن کی کافی عزت کی اور پہاسو کا علاقہ بطور جاگیر کے دیا مگر شاہ عالم کے بعد ملک میں کچھ ایسی بدنظمی ہوئی کہ وہ علاقہ بھی جاتا رہا

غالب کے باپ عبداللہ بیگ خاں آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ آئے اور لکھنؤ سے حیدرآباد گئے بالآخر الور میں آ کر راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت کی اور یہاں کسی لڑائی میں ۱۸۰۲ء میں مارے گئے اس وقت مرزا کی عمر صرف پانچ برس کی تھی باپ کے بعد اُن کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے مرزا کے سر پر ہاتھ رکھا یہ اکبرآباد کے صوبیدار

تھے ۱۸۰۶ء میں جنرل لیک کا عمل ہوا تو مرزا نصراللہ کو سواروں کی بھرتی کا حکم ہوا اور سترہ سو روپیہ ذات کا اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر میں جاتی دی گئی مگر یہاں بھی غالب کو سکون نہ نصیب ہوا ابھی صرف نو برس کی عمر تھی کہ ایسے شفیق اور مقتدر چچا کا بھی انتقال ہو گیا جو در اصل تھے ان کی پنشن ہوئی غالب کو بھی سات سو روپیہ سالانہ ملتا رہا

بہادر شاہ نے بھی غالب کو پچاس روپیہ ماہوار اور خلعت مقرر کر دیئے تھے لیکن غدر کے بعد یہ تنخواہ بھی بند ہو گئی اور نہایت تکلیف سے بسر ہونے لگی مجبوراً رامپور چلے آئے اور یہاں ایک سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا مگر دلی کی محبت نے وہاں بھی رہنے نہ دیا دلی واپس آئے تین سال کے بعد پنشن بھی جاری ہو گئی اور آخر عمر تک دلی ہی میں گزاری ۷۳ برس کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں انتقال ہو گیا

غالب کو فارسی سے ازلی مناسبت تھی تمام عمر غیر معمولی دلچسپی اس زبان سے لیتے رہے ہندوستان کے فارسی شعرا میں ان کا پایہ بہت بلند ہے غالب کی طبیعت میں خدا نے اور ساتھ ہی ساتھ متانت ظرافت نے ایک جگہ جمع کر دی تھی اخلاق و شگفتگی مزاج کی وجہ سے مرزا کثیر الاحباب ہو گئے تھے چنانچہ خط و کتابت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو میں ایک بے نظیر خطوں کا مجموعہ ہو گیا جس نے اُردو کے طرز بیان پر کافی اثر ڈالا

غالب کا کلام تین دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا دور وہ ہے جس میں راستے بالکل دور کے الفاظ میں لیکن کچھ لوگوں کی نکتہ چینیوں اور کچھ مولوی فضل حق کی دوستی نے مرزا صاحب کو رنگ بدلنے پر مجبور کیا کیونکہ یہ عام شکایت تھی کہ ان کا طرز بیان نامانوس اور شعر بعید الفہم ہوتے ہیں دوسرا دور وہ ہے جس میں زبان کسی قدر صاف ہو گئی ہے اور ترکیبیں بھی سہل ہو گئی ہیں تیسرا دور وہ ہے جب کہ ترکیبیں اور پیچیدگیاں قریب قریب بالکل جاتی رہتی ہیں اس دور میں اُن کی شاعری بہت زیادہ ہو گیا سلاست اور روانی خاص طور پر نمایاں ہے جدت اور ندرت ہی کلام کی دور کا خاص ہیں غالب نے پامال راستے

کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ اختیار کیا اور چاہا کہ اہل ہند کو پوری طرح فارسی کی سیر کرا دیں مگر ہندوستانی
پھر بھی ہندوستانی رسوم کی پابندیوں نے اس کی اجازت نہ دی۔ غالب آگے بڑھتے ہی چلے
جاتے تھے کہ پلٹ کر دیکھا تو سمجھے کہ زمانہ کو میری روش پسند نہیں لوگوں کی دل شکنی کا خیال
ہوا ناچار خود اس راستہ کو چھوڑ دیا مگر پامال راستہ سے ملی ہوئی ایک الگ ڈنڈی نکالی،
جس پر عمر بھر گامزن رہے اور رفتہ رفتہ زمانے کو اس پر چلا کر چھوڑا

خیال میں بلندی اور مضامین کی ندرت کو مرزا نے ایسا حصہ بنا لیا تھا جس کا ایک زمانہ
گرویدہ نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں جدت ادا اور نازک تشبیہیں کام میں لائی گئی ہیں علو تخیل اور معنی
آفرینی ان کے طائر کلام کے پر پرواز ہیں جو مضمون کو کنگرۂ عرش تک پہنچا دیتے ہیں

بڑے بڑے مضمون نہایت اختصار کے ساتھ ایک ایک شعر میں نظم کر دیتے ہیں ان کے
کلام کی معنویت اور بلندی عام سطح سے بہت بلند ہے غالب کی سی ہموار غزلیں مشکل ہی سے
کسی اور دیوان میں نظر آ سکتی ہیں ان کا کلام کئی لحاظ سے دماغ پر دور رس ہے منجملہ ایک عنوان
یہ بھی نہایت پر لطف ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ان کے اشعار میں دو ایک باتیں ایسی محذوف
ہوتی ہیں جن کو پڑھنے والا اپنی طرف سے نہیں پورا کرتا بلکہ اشعار ہی میں بعض الفاظ
ایسے لطیف اشارے کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کا ذہن خود بخود اسی ماحول کی طرف
منتقل ہو جاتا ہے جو غالب کے پیش نظر تھا۔ ذہنی کاوش ایک کیف پیدا کرتی ہے
غور کرنے سے سب کچھ ذہن میں آجاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بھی شعر میں موجود
تھیں، درد و غم کی داستان نہایت مؤثر اور مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہیں غالب نے یہ
طرز ادا میر کے یہاں سے حاصل کی ہے۔ غالب کی تیز نگاہ زندگی کے حقیقی اور عملی پہلو پر
پڑتی تھی وہ تصوف کے اکثر رموز و مسائل نہایت لطیف پیرایے میں بیان کرتے
ہیں جہاں کہیں ان کے کلام میں شوخی ہے وہ نہایت دلکش ہے ابتذال کی جھلک
کہیں نہیں آنے پاتی "رنگینئ غزل" میں جتنا تنوع غالب کے یہاں ہے اور

کہیں نہیں مل سکتا حیات و موت، جبر و اختیار، سوز و ساز، گناہ و ثواب سب فلسفیانہ
عمق کے ساتھ ان کے کلام میں جگہ پاتے ہیں۔ حسن و عشق کے چھوٹے چھوٹے مسائل زندگی
کا راز بن جاتے ہیں۔ غالب تجربات و واردات قلب کو ہو بہو بیان کر دیتے ہیں
اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" کے
طلسم میں اسیر ہو جاتا ہے۔ غالب نے اپنی فلسفیانہ کاوشوں اور لہجہ کی بلندی سے
اردو ادب کو دفعتاً بلند کر دیا، زبان کی سطح ہمیشہ سے زیادہ بلند ہو گئی۔

مومن

ان کے والد کا نام غلام نبی خاں تھا خاندانی پیشہ طبابت تھا مومن خاں کے
دادا سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں دلّی آئے اور شاہی طبیبوں میں داخل ہو گئے اسی
سلسلہ میں کچھ جاگیر بھی عطا ہوئی۔

مومن خاں کی ولادت ۱۸۰۰ء میں ہوئی اُن کے والد کو شاہ عبدالعزیزؒ سے
عقیدت تھی چنانچہ یہ نام شاہ صاحب موصوف ہی نے رکھا تھا۔ ابتدائی تعلیم شاہ عبدالقادر
سے حاصل کی عربی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے خاندان میں طب کی کتابیں پڑھیں
ذکاوت اور حافظہ قسّام ازل نے مومن خاں کو خاص طور سے عطا کیا تھا نجوم میں وہ مہارت
حاصل کی کہ بڑے بڑے منجم منہ دیکھا کرتے تھے۔ شاعری میں شاہ نصیرؔ سے اصلاح لیتے
رہے اصناف شاعری میں قصیدہ، رباعی، واسوخت، غزل، ترکیب بند، ترجیع بند،
مثنوی سبھی پر طبع آزمائی کی ہے تاریخ گوئی میں کمال تھا بات بات میں تاریخ کہتے تھے

مومن کی یادگار ایک دیوان اور چھ مثنویاں ہیں کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے
کہ معنی آفرینی اور جدت بیان کے لحاظ سے اردو میں کم شعرا اس پایہ کے گزرے ہیں

فارسی ترکیبوں اور الفاظ کے الٹ پھیر سے سادی بات کو بھی شاندار بنا سکتے تھے، کبھی کبھی الفاظ کی تکرار تاثیر بڑھانے میں مدد دیتی تھی مومن کا دل عشق کی لذت سے خوب واقف تھا اس وجہ سے درد اور مزا کلام کو دلکش اور پُرلطف بنا دیتا ہے اشعار میں تھوڑی سی پیچیدگی، طنز، تشبیہ اور استعارے کی مدرت ان کی انفرادی خصوصیات میں داخل ہیں فرسودہ خیال کو بھی اسلوب بیان کے زور سے نیا کر لیتے ہیں جس سے پُرلطف معنویت پیدا ہو جاتی ہے ان کی جذبات نگاری میں اصلیت کا پہلو بہت نمایاں رہتا ہے کیونکہ وہ واردات قلب اور محبت کی کیفیات کو مدنظر رکھ کر شعر کہتے تھے ان کی غزلیں فلسفیانہ مباحث سے بھی خالی نہیں حیات و موت کی کشاکش مختلف طریقوں پر بیان ہوئی ہے اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کہیں کہیں ان کے الفاظ ان کے تخیل کا مفہوم پورا نہیں کرتے اور سننے والے یا پڑھنے والے کا ذہن خود اُن کے خیال تک نہیں پہنچتا

مومن کو مثنوی نگار کی حیثیت سے کوئی خاص شہرت نہیں حاصل ہوئی ان کی مثنویاں ان کی حیات کی آئینہ دار ہیں جن میں جذبات کی آمد اور زبان کی سلامت اور روانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں قصائد کے اعتبار سے وہ قصیدہ لکھنے والوں کی پہلی صف میں نظر آتے ہیں مگر طبیعت کی خودداری کسی بادشاہ یا امیر کا قصیدہ لکھنے سے مانع رہی بزرگانِ دین کی شان میں متعدد قصیدے کہے صرف دو قصیدے دیوان میں ایسے ہیں جو راجہ اجیت سنگھ اور فرمانروائے ٹونک کی تعریف میں ہیں لیکن وہ بھی صلہ کی امید پر نہیں ان کے واسوخت بھی عشق مجازی کے ایک رُخ کو واضح کرتے ہیں

۵۲ برس کی عمر میں کوٹھے سے گر کے، پانچ مہینہ بیمار رہ کر ۱۸۵۱ء میں انتقال کیا

دور کی خصوصیات

اس دور کی خصوصیات میں ان ہی دو ذہنیتوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کی راہیں بالکل الگ سی معلوم ہوتی ہیں

(۱) غالب و مومن اور آتش خیالات اور معنویت کی طرف زیادہ مائل تھے ذوق نصیر اور ناسخ کا رجحان زیادہ تر زبان اور عروض کی طرف تھا

(۲) غالب نے فلسفیانہ، حکیمانہ خیالات کا اُردو شاعری میں سنگ بنیاد رکھا جس کا نتیجہ اس وقت تو نہیں مگر بعد کو ظاہر ہوا لیکن خیالات میں تنوع اور اماریاں میں جدت اسی وقت لوگوں کے سامنے آ گئی

(۳) زبان کی صفائی، تشبیہات، استعارات کی رنگینی پر دور سے زیادہ بڑھ گئی

(۴) رعایت لفظی اور خارجی پہلو پر بعض شعرا نے اتنا زور دیا کہ پورے دور کو متاثر ہونا پڑا بلکہ اس کے بعد آنے والے دور کو بھی انہیں کی تقلید کرنی پڑی۔

(۵) شاعری کا دائرہ زیادہ تر غزل تک محدود رہا، قصیدہ و مثنوی پر کم توجہ کی گئی جن لوگوں نے اس طرف توجہ بھی کی وہ اپنے پیش روؤں سے آگے نہ بڑھ سکے

(۶) فارسی و عربی کے الفاظ و ترکیب اُردو شاعری میں تیزی کے ساتھ جگہ پانے لگے جس پر پہلے سے زیادہ توجہ کی جانے لگی

(۷) چونکہ سلطنت کا نقشہ بدل رہا تھا دہلی اُجڑ رہی تھی اور لکھنؤ نظاہر آباد ہو رہا تھا اس وجہ سے اس دور کے کلام میں رجائیت و قنوطیت شاعری کے میدان میں دوش بدوش نظر آتی ہیں، دہلی کے شعرا کے یہاں ایک گونہ یاس و اضمحلال ہے، لکھنؤ کے شعرا میں شاعرانہ بے بسی کو چھوڑ کر احساس میں شگفتگی نظر آتی ہے

(۸)

امیر

امیر احمد نام اور امیر تخلص تھا مولوی کرم محمد لکھنوی کے صاحبزادے تھے ۲۱ شعبان ۱۲۴۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے بادشاہ نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا لکھنؤ فضل و کمال کا مرکز بنا ہوا تھا علما اور مجتہدین علم کے دریا بہا رہے تھے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے اور بعد میں علمائے فرنگی محل سے حاصل کی امیر طب نجوم جفر وغیرہ سے بھی واقف تھے طبیعت بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھی اور پھر اس وقت لکھنؤ کی فضا ایسی تھی کہ ہر طرف شاعری برس رہی تھی امیر نے بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا کچھ دنوں کے بعد اسیر کے شاگرد ہو گئے اسیر نے امیر کے سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا چنانچہ جب واجد علی شاہ کا دور آیا اور اسیر کو دربار میں رسائی نصیب ہوئی تو اپنے ساتھ امیر کو بھی وہاں لے گئے امیر کو بھی رفتہ رفتہ فروغ حاصل ہوا دو کتابیں "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" لکھ کر بادشاہ کے دربار میں پیش کیں اور صلے میں خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے

امیر کے کلام میں واجد علی شاہی دربار اور لکھنؤ کے اس دور کے رنگ کی جھلک اکثر نظر آتی ہے یعنی معشوقوں کی محفل ادائیں گفتگو چھیڑ چھاڑ سیر باغ کی صحبتیں سب کا نقشہ نظر آ جاتا ہے

صحبتیں منتشر ہو چکی تھیں مگر امیر ان جیدوں کو نہایت حسرت و یاس کے ساتھ یاد کیا

کرتے تھے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں

امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے
وہ ملتے ہم کو قصرِ باغ کے جب یاد آتے ہیں

لکھنؤ کی رونق واجد علی شاہ کے ساتھ رخصت ہو گئی تھی رہی سہی بہار بھی غدر کے ہنگامہ میں ختم ہو گئی بلکہ وہ مصیبت آئی کہ شہر کے اہل کمال بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے ناچار امیر کو بھی کبھی کاکوری کبھی ہمیر پور کبھی مین پوری جانا پڑتا بالآخر رام پور میں آ کر مقیم ہوا اور یہیں شیخ وحید الزماں لکھنوی کی لڑکی سے عقد ہوا نواب رام پور امیر سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے امیر کی قدر و منزلت رام پور کے دربار میں اتنی ہوئی کہ ۴۲ سال تک یہیں رہے داغ کے بلانے سے حیدرآباد کا سفر کیا لیکن وہاں جاتے ہی بیمار پڑے اور ایک مہینہ دو دن بیمار رہ کر ۱۹۰۰ء میں راہی ملکِ بقا ہوئے

امیر اپنی قابلیت کے لحاظ سے بحرِ ذخّار تھے ان کی کتابوں کی فہرست کافی بڑی ہے دو کتابوں کے نام پہلے آ چکے ہیں لیکن اور بہت سی تصنیفات ان کے علاوہ ہیں صنم خانۂ عشق یا 'نورِ تجلی' اور 'ابرِ کرم' اور مسدس میں 'صبحِ ازل' 'شامِ ابد' 'لیلۃ القدر' 'ذکرِ شاہِ انبیا' مشہور ہیں واسوخت بھی خوب ہے ماحول کی تصویریں ہیں دیوان مراۃ الغیب ۱۲۹۰ھ اور صنم خانۂ عشق ۱۳۱۳ھ میں شائع ہوئے کچھ اور کلام بھی ہے جو ان کے سامنے شائع نہیں ہو سکا ایک کتاب سرمۂ بصیرت ہے جس میں عربی اور فارسی کے وہ الفاظ دیے ہیں جو اردو میں عام طور پر غلط استعمال ہوتے تھے ان الفاظ کو صحیح طور سے استعمال کر کے اس کتاب میں دکھایا گیا ہے امیر کی تصنیفات میں امیر اللغات ایک عدیم المثال لغت ہے امیر کا ابتدائی کلام ایک بڑی حد تک ناسخ کے رنگ میں ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ یہ تخیلی شاعری خشک ہونے پائی ہے اور نہ تصنع کی شاعری بے کیف ہوئی ہے تکلف میں امیر نے ایسی لطافت و رنگینی بھر دی ہے کہ نزاکت اور لوچ کے

علاوہ ایک خاص مزا پیدا ہو گیا ہے جو اُن کے کلام کو دوسروں کی ایسی شاعری سے بہت زیادہ دلکش اور پُر لطف بنا دیتا ہے برخلاف اس کے جب وہ داغ کی سادگی اور بے تکلفی اختیار کرتے ہیں تو کبھی کبھی رقیب اور ابتذال پیدا ہو جاتا ہے

ان کے کلام میں فصاحت اور ترنم خاص طور پر نمایاں ہیں شوخی کلام کے لطف کو دوبالا کرتی ہے اور عام طور پر متانت قائم رہتی ہے صحت زبان اور روزمرہ کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتے یہ ضرور ہے کہ شوخی کبھی کبھی مناسبت کے جامہ سے باہر نکل آتی ہے لیکن جب اس زمانے کے مذاق پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ عیب کچھ زیادہ تکلیف دہ نہیں معلوم ہوتا

امیر کا کلام عام طور سے صاف اور سلیس ہے بول چال اور محاورات کے لحاظ سے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا بہترین نمونہ ہے تصوف کی جھلک اُن کے کلام میں وسیع النظری کا ثبوت ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کا کلام ایک بڑی حد تک مبتذل کی کہانی کا ذخیرہ ہے جو ممکن ہے کہ موجودہ روشنی والوں کو ناپسند ہو لیکن اس زمانہ میں دل کی شگفتگی و حذبات کی لذت کے لیے اسے ضروری سمجھا جاتا تھا

داغ

نواب شمس الدین خاں کے بیٹے تھے سنہ ۱۸۳۱ء میں دلی میں پیدا ہوئے ابھی چھ سات سال کے رہے ہوں گے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ماں نے بہادر شاہ کے بیٹے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو سے شادی کر لی اس سلسلے سے داغ کو بھی لال قلعہ میں رہنا نصیب ہوا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی لال قلعے کے تعلق سے ذوق سا اُستاد ملا انہیں سے اصلاح لیتے رہے اور انھیں کے ساتھ مشاعروں میں جانے لگے

سنہ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کے انتقال کے بعد ان کو مع اپنی ماں کے قلعہ چھوڑنا پڑا

اس سے بڑھ کر یہ مصیبت ہوئی کہ اگلے سال غدر کا ہنگامہ رونما ہوا اور داغ مصائب میں مبتلا ہو گئے اس کے بعد رام پور آئے نواب یوسف علی خاں کا زمانہ تھا وہ نہایت علم دوست تھے لکھنو اور دہلی کے بعد شعرا کا ٹھکانہ رام پور ہی رہ گیا تھا یہاں داغ کی بڑی قدر ہوئی کلب علی خاں ولیعہد کے مصاحبِ خاص مقرر ہو گئے ان کی زندگی میں داغ کہیں نہ گئے ان کے انتقال کے بعد حیدرآباد آئے یہاں بھی قدر و منزلت سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا بڑی تنخواہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً انعامات سے بھی سرفراز ہوتے رہے حیدرآباد ہی میں فالج گرا زبان بند ہو گئی اور کچھ دنوں بیمار رہ کر ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے

چار دیوان گلزارِ داغ، آفتابِ داغ، مہتابِ داغ، یادگارِ داغ ہیں ایک مثنوی فریادِ داغ اور چند قصائد اور رباعیات بھی موجود ہیں داغ کے کلام پر نظر ڈالنے سے چند باتیں صاف نظر آتی ہیں سب سے پہلی چیز زبان کی صفائی اور روانی ہے ثقیل الفاظ اور فارسی ترکیبوں سے انھوں نے بڑی حد تک گریز کیا ہے پیچ در پیچ استعارے اور بعید از کار خیالات اُن کے یہاں نہیں پائے جاتے چلبلاپن اور شوخی ان کے کلام کی جان ہے لیکن یہی شوخی کبھی ابتذال تک پہنچ جاتی ہے اور رنگین بیانی عامیانہ پن کی جھلک لئے ہوئے محفلِ ادب میں نمودار ہوتی ہے معاملہ بندی، شباب اور سرمستی کی تصویریں کہیں کہیں ایسی بے ساختگی اور شوخ لطافت سے مزہ پیدا کر دیتی ہیں اور کبھی مذاقِ سلیم پر بار ہو جاتی ہیں داغ کے کلام میں عمق کم ہے محبت کی ترجمانی بیشک اس انداز سے ہے کہ ہر شعر پر کھپ سکے مگر درد و گداز زیادہ نہیں تشبیہ و استعارات میں جدت کی کمی ان کے اختراع پر داغ ہے ان کی غزلوں میں رطب و یابس بہت پایا جاتا ہے کچھ اشعار انھوں نے اپنے رنگ سے الگ ہو کر صرف مروجہ شاعری کی تقلید میں لکھے جو عموماً خشک اور بے کیف ہیں لیکن اُن کی شوخی ایسے اشعار کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیتی۔ لفظ "تیور" اور تیکھاپن کا صحیح اطلاق اگر شعر پر ہو سکتا ہے تو وہ داغ کے اشعار ہیں جہاں حسن اور عشق دونوں شوخ اور بے حجاب ہیں

اُردو شاعری پر داغ کا بڑا اثر رہا اُن کے زمانے ہی سے عام طور پر دوسرے شعراء ان کی تقلید کرنے لگے تھے ان کے بعد بھی عرصہ تک لوگ داغ کی شاعری کا اثر لیتے تھے

جلال

سید ضامن علی نام تھا ۱۲۵۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے حکیم اصغر علی کے بیٹے تھے فارسی و عربی کی تعلیم اعلیٰ پایہ پر حاصل کی آبائی پیشہ کا بھی خیال رکھا طبابت کی بھی قابلیت بہم پہنچائی مگر شعر و شاعری میں زیادہ انہماک رہا اس دور لکھنؤ کے مشہور شاعر گرد رشک کا طوطی بول رہا تھا جلال اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اصلاح لینے لگے مگر کچھ عرصہ بعد رشک زیارت کی غرض سے عراق چلے گئے تو جلال برق کو اپنا کلام دکھانے لگے۔

لکھنؤ کا ماحول اس زمانہ میں شعر و شاعری کے لئے بہت موزوں تھا۔ مشاعروں میں بڑے بڑے سخن فہم و صاحب کمال جمع ہوتے خود بھی غزلیں پڑھتے دوسروں کی بھی ہمت افزائی کرتے قلق، سحر، اسیر، امیر، بحر وغیرہ سب کے سب سرگرم بزم سخن ہوتے جلال بھی اسی دلستاں میں طبع آزمائی کی غرض سے حاضر ہوتے گویا ابتدا ہی سے بڑے بڑے صاحبان فن کی صحبت نصیب ہو گئی تھی طبیعت پر زور دینے کا کافی موقع ملتا رہا

لکھنؤ کی یہ بزم نشاط زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی غدر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ نہ کہنا چاہئے سر پر آپہنچا ع

اُٹھیئے کہ ابد دولت خواب سحر ہو گئی

محفل درہم برہم ہو گئی جس کو جدھر راہ ملی بھاگ نکلا جلال نے حکمت کے دامن میں پناہ لی لکھنؤ میں منشی سدرائے وقار کے مکان میں مطب قائم کیا اور گزر اوقات کا اہتمام کرنے لگے کچھ دنوں کے بعد نواب یوسف علی خاں والی رام پور نے ان کو اپنے یہاں

بلا لیا جلالؔ ان کے بعد بھی کوئی بیس سال تک عزت و احترام کے ساتھ رام پور میں رہے نواب
کلب علی خاں نے اپنے دربار کو دہلی و لکھنؤ کا خاکہ سا بنا دیا تھا اور امیرؔ، داغؔ، تسلیمؔ وغیرہ کو
اکٹھا کر لیا جلالؔ کو یہاں بھی معرکہ آرائیوں سے فرصت نہ ملی کلب علی خاں کے مرنے
کے بعد یہ صحبت بھی منتشر ہوئی کوئی حیدرآباد گیا کوئی کہیں گیا جلالؔ کو حسین میاں ریاست
منگرول کے نواب نے اسے یہاں بلا لیا مگر یہاں زیادہ دنوں تک قیام نہ رہ سکا واپس چلے
آئے سنہ ۱۹۰۹ء میں ۷۷ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا

جلالؔ نے زبان و شاعری پر ناسخؔ کی پوری تقلید کرنے کی کوشش کی قواعد پر خاص
توجہ کی لفظی بحث، تذکیر و تانیث کا جھگڑا، محاورات و عروض کا مسئلہ ہر وقت پیش رہتا ان
سب باتوں کا نتیجہ کچھ اچھا ہی ہوا کئی ایک لغت، قواعد، عروض کی کتابیں جلالؔ نے مرتب
کر دیں جو ادب کے لئے مفید ثابت ہوئیں گویا زبان کو ہر علمی نقطۂ نظر سے منظم کرنے میں جلالؔ
نے بڑی کاوش سے کام لیا اس لحاظ سے آپ نے اُردو ادب میں اپنی ایک خاص جگہ پیدا کر لی
اپنے عہد میں اُردو کے باکمال استاد اور خاص سرپرست سمجھے جانے لگے علمی قابلیت کی وجہ
سے ان کا سکہ تمام دبستانِ اُردو میں اس وقت رائج ہو گیا

شاعری میں انھوں نے اب اثر رائی لکھنؤ پر قدم رکھا خارجی عناصر و رنگینی بیان پر
زیادہ زور دیا علوِ تخیل و پرجوش اشعار بہت کم ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان
کا کلام غلطیوں سے پاک ہے اشعار زبان و محاورات و عروض کے لحاظ سے بہت صحیح و
مستند ہیں

ایک حصہ جلالؔ کے کلام کا ایسا ہے جس میں انھوں نے میرؔ کی تقلید کی ہے جس میں تاثیر و
سادگی و معنویت نہایت خوبی سے نمایاں ہیں ان کی اکثر غزلیں اپنے ہمعصروں کی روش کے
برخلاف مختصر و صاف ہیں رعایت لفظی، سوقیت وغیرہ ضرور ہیں لیکن لطافت و کیفیت سے خالی
نہیں اس لئے تصنع کا اثر زیادہ برا نہیں پڑتا اور جہاں کہیں معنویت و سادگی کی طرف جلالؔ

جلالؔ

سے توجہ کی ہے وہ اشعار اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں
جلالؔ نے قصائد پر بھی کافی توجہ کی شکوہ الفاظ مضمون آفرینی کہیں کہیں تشبیب میں
تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کے عالم و ہمہ داں ہونے کا صاف پتہ
چلتا ہے لیکن اس صنف شاعری میں کوئی خاص شہرت نہ حاصل کر سکے صرف اپنے زمانہ
کے معیار قصیدہ گوئی کو حسن و خوبی کے ساتھ برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہے جلالؔ کی
علمی قابلیت کا اندازہ کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات کی ایک
فہرست بھی سادی جاتی ہے

۱ دیوان اوّل شاہد شوخ طبع
۲ دیوان دوم کرشمہ جات سخن
۳ دیوان سوم مضمون ہائے دلکش
۴ دیوان چہارم نظم رنگیں

ان کے علاوہ لغت و قواعد وغیرہ حسب ذیل کتابیں ان سے یادگار ہیں

۵ سرمایہ زبان اردو محاورات کا لغت ہے
۶ افادہ تاریخ تاریخ گوئی کے متعلق ہے
۷ منتخب القواعد
۸ صحیح اللغات
۹ گلشن فیض (لغت ہے)
۱ مفید الشعراء

دور کی خصوصیات

(۱) شاعری میں رنگینی، معاملہ بندی، شوخی زیادہ ہو گئی
(۲) لکھنؤ اور دہلی اسکول ایک دوسرے سے اب بھی متاثر ہو رہے تھے شعرائے لکھنؤ دہلی کی

طرف زیادہ مائل تھے۔

(۳) اس سے پہلے دور کی الجھی ہوئی دور دراز کی تشبیہات، پیچیدہ استعارات کم ہو چلے لطافت و کیف کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی سادگی بھی کلام میں جگہ پانے لگی

(۴) اسدال و مبالغہ و خامہ بیانی کا اس دور میں بھی سکہ رہا

(۵) زبان، قواعد صحت کا زیادہ خیال رہا مختلف لغات و کارآمد رسالے لکھے گئے گویا شعراء نے بھی نثر کی طرف توجہ کی اور اپنی تحریروں سے زبان کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے کی فکر کی

(۶) مرثیہ کی وجہ سے حسن و عشق کے علاوہ دوسری راہیں بھی شاعر کو مل گئیں بزم و رزم کی داستاں، واقعات کی منظر نگاری، ماں باپ کی محبت، بھائی بھائی کی محبت، بھائی بہن کی محبت، امیر غریب کا کردار، غرض کہ مختلف و متعدد موضوعات اُردو شاعری کے ہاتھ آگئے

(۹)

مرثیہ

یہاں مرثیہ سے مراد وہ نظمیں ہیں جو واقعات کربلا کے متعلق وقتاً فوقتاً کہی گئیں امام حسینؓ کی شہادت کے بعد ہی سے ایسی نظمیں عربی میں آنے لگیں بعد میں فارسی نے بھی اثر لیا اور اچھا خاصا ایک ذخیرہ تیار ہو گیا اردو میں ابتدائی عہد سے یہ چیز آ گئی تھی بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ دکن میں اردو شاعری کی ابتداء مرثیہ سے ہوئی، لیکن یہ فیصلہ زیادہ اطمینان بخش نہیں بہرحال قطب شاہی دور میں اس کے اچھے نمونے ملتے ہیں

شروع میں مرثیہ بہت مختصر ہوتا تھا کوئی خاص شکل بھی معین نہ تھی کبھی مربع کی شکل میں رہا کبھی غزل کی شکل میں مضمون کے لحاظ سے زیادہ تر جذبات و واقعات پر مبنی ہوتا عموماً مذہبی نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا اور ثواب کے لئے پڑھا جاتا۔ شمالی ہند میں میر و سودا کے مرثیے مشہور ہوئے اور اسی عہد میں اس کی شکل مسدس کی ہو گئی جو رفتہ رفتہ اتنی مقبول ہوئی کہ مستقل طور پر مسدس مرثیوں کے لئے مخصوص ہو گیا۔

ابھی تک فنی اعتبار سے مرثیہ کو نمایاں حیثیت نصیب نہیں ہوئی تھی میر ضمیر نے اس طرف خاص توجہ کی اس کے اجزائے ترکیبی معین کئے یعنی مرثیہ کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا

(۱) چہرہ (۲) سراپا

(۳) رخصت (۴) آمد

(۵) رجز　　　　　　　　　　(۶) جنگ

(۷) شہادت　　　　　　　　　　(۸) بین

ان کے بعد والوں نے بھی اسی راستہ پر قدم رکھا اور ان خصوصیات کو برابر سامنے رہنے۔ اس وقت سے مرثیہ میں وہ چیزیں لائی گئیں جو اس سے پہلے اردو ادب میں مفقود تھیں اب تک اردو شاعری حسن و عشق کی داستان تک محدود تھی اب مرثیہ نے محبت کی دنیا کو وسیع کر دیا۔ نہ صرف عاشق و معشوق کے جذبات دکھائے بلکہ مختلف طرح کی محبت اور مختلف اشخاص کی محبت کا نقشہ پیش کیا۔ باپ بیٹے کی محبت، میاں بیوی کی محبت، بھائی بھائی کی محبت، بہن بھائی کی اُلفت، چچا بھتیجے کی اُلفت، آقا و غلام کا اُنس، دشمنوں پر شفقت، جانوروں کے جذبات غرضیکہ متعدد مختلف افراد کی محبت کا خاکہ پیش کر دیا

منظر نگاری کے اعتبار سے بھی مرثیہ نے وہ خدمات انجام دیں کہ اب تک اردو شاعری کی کسی ایک صنف میں ایسی مثالیں نہ تھیں۔ صبح کا منظر، شام کا منظر، دوپہر کی گرمی، دریا کی روانی، گھوڑوں کا دوڑنا، الف ہونا، فوجوں کا آپس میں ٹکرانا، تلواروں کا چلنا، پہلوانوں کا آپس میں تیغ آزمائی کرنا، غرضیکہ اس قسم کے صدہا منظر پیش کر کے اردو کی وسعت کو مرثیہ نے بڑھا دیا۔ مرثیہ کی یہ بہت دلربا پذیر سرمایہ داری۔ عربی میں بھی نہ فارسی میں مجموعی لحاظ سے ہر ایک پر فروغ تھا اس سے پہلے اردو میں جتنی علمی و ادبی چیزیں آئی تھیں وہ سب کی سب تقلیدی تھیں۔ مرثیہ نے آ کر اردو کو سر اٹھانے کا موقع دیا اور ادبی دنیا کو دکھا دیا کہ ایک عام موضوع اور تاریخی واقعہ بھی ادب کی جان بن سکتا ہے۔ مرثیہ نے فنی اعتبار اور ادبی لحاظ سے وہ اہمیت حاصل کی کہ اردو میں بالکل اسی چیز سمجھا جانے لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ اس حسن کمال کے ساتھ یہ صنف نہ عربی میں تھی نہ فارسی میں

میر انیس و مرزا دبیر نے اس فن کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ طرزِ بیان، مشاہدات، زبان، شدتِ احساس سب اس خوبی سے ایک جا ہوتے کہ اس سے آگے بڑھنا ناممکن

نسل کے لیے ناممکن ہو گیا ان لوگوں کے بعد بھی لوگ مرثیہ کہتے رہے مگر لسانیاتی تحلیل و فنی خصوصیات پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا

دبیر

مرزا سلامت علی نام اور دبیر تخلص مرزا غلام حسین کے بیٹے تھے ۱۸۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے مگر باپ کے ساتھ بچپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے اور یہاں آکر تحصیلِ علم میں مصروف ہو گئے یہاں تک کہ علمی استعداد فاضلانہ حد تک پہنچ گئی

شعر و سخن کا چسکا روزِ ازل سے لے کر آئے تھے مشاعروں میں اکثر شرکت کیا کرتے تھے دل میں سخن کی رغبت تیز ہوئی تو خود بھی طبع آزمائی کرنے لگے اور میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہو گئے یہاں تک نام پیدا کیا کہ اُستاد سے زیادہ شہرت ہو گئی مرثیہ کو ایسا خاص فن انہی کے استاد میر ضمیر نے فرسودہ مرثیہ گوئی میں چند عنوانات قائم کر کے چار چاند لگا دیے تھے یعنی چہرہ آمد رجز لڑائی وغیرہ کو خاص طور پر الگ کر کے ایک مخصوص حصہ قرار دے دیا تھا لیکن صرف راستہ ہموار ہوا تھا آرائش اور پختگی کا کام ہونہار شاگرد کے لیے چھوڑ دیا تھا

مرزا دبیر نے یہی بہت کیا کہ اپنے اُستاد کی بنائی ہوئی عمارت کو قائم رکھا بلکہ بقول آزاد مرحوم جو کچھ اُستاد سے پایا اُسے بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا سب شہرت کا سامان بلند ہوا تو دربار اودھ سے بھی سرپرستی کا ہاتھ بڑھایا مرزا دبیر بہت پُرگو تھے کم از کم تین ہزار مرثیے کہے ہوں گے رباعی، سلام، نوحے ان کے علاوہ ہیں مرزا صاحب کی خصوصیات میں ترکیبِ الفاظ، جدید تشبیہات، استعارے اور زورِ کلام داخل ہیں ان کا کلام علمی زبان اور مضمون آفرینی کا اعلیٰ نمونہ ہے عیوب سے مبرا ہے اور فنِ عروض کے

پر سلاموں کا بہترین دلچسپ چمنستان ہے کیونکہ صنائع بدائع سے مرصع ہے۔ مرزا صاحب نے محرم ۱۸۷۵ء میں وفات پائی اور اپنے گھر ہی میں دفن ہوئے۔

مرزا دبیر نے واقعات کربلا کی تفصیلات پر اس قدر زور دیا ہے کہ اختصار کی خوبی بہت کم ہو گئی ہے۔ پوری پوری روایتوں اور حدیثوں کو بنیاد قرار دے کر مرثیوں کو اتنا طول دے دیا ہے کہ شاعرانہ لطافت اور ذہنی کاوش کو بلند ہونے کا پورا موقع نہیں ملتا۔ زبان و بیان کے لحاظ سے مرزا دبیر کے کلام میں بہ نسبت میر انیس کے کلام کے یکسانیت و ہمواری بھی کم ہے۔

مرزا دبیر کے یہاں آپ کو اس زمانہ کے مذاق کے مطابق رعایت لفظی و مبالغہ بھی بھرپور طریقہ پر ملتا رہے گا لیکن عالمانہ انداز و استادانہ رنگ سے ان کا کلام کہیں خالی نہ ملے گا۔

انیس

میر ببر علی نام اور انیس تخلص۔ میر خلیق کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے لیکن جب آصف الدولہ نے لکھنؤ بسایا تو میر انیس بھی یہیں آ رہے۔ انیس کا خاندان سالہا سال سے زبان کی خدمت کر رہا تھا۔ کئی پشت سے شاعری پیشہ چلی آ رہی تھی۔ ان کے گھرانے کی زبان اردوئے معلیٰ کے لحاظ سے تمام زمانے میں مستند سمجھی جاتی تھی۔

ابتدائی تعلیم مولوی حیدر علی صاحب سے حاصل کی۔ شاعری میں باپ سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کے باپ میر خلیق مرثیہ گوئی میں میر ضمیر کے ہم پایہ تھے۔ میر انیس نے باپ کے قدم پر قدم رکھا اور باپ کے زمانہ ہی میں کافی شہرت حاصل کر لی۔ جب میر ضمیر اور میر خلیق کا انتقال ہوا تو مرزا دبیر اور انیس نے ان کی جگہ لی اور دونوں حضرات میں معرکہ آرائی شروع ہو گئی لیکن بجائے کسی خرابی کے کلام میں ترقی ہوتی چلی گئی

انیس کو زبان پر وہ قدرت حاصل ہے جو خالق کو مخلوق پر۔ حسن الفاظ سے جس موقع پر جو
کام لینا چاہتے ہیں وہ خادمانہ اطاعت کے ساتھ حکم بجا لاتے ہیں

مرثیہ میں دیکھئے تو بچے، عورت، مرد، آقا، خادم، دوست، دشمن سب ہی کا کارنامہ
نظر آتا ہے۔ انیس کا کمال ہے کہ ہر ایک کے جذبات کو حفظ مراتب کے لحاظ سے اس طرح نظم
کرتے ہیں کہ ان کے کردار کی پوری تصویر نمایاں ہو جاتی ہے۔ مناظر قدرت کے بیان کرنے
میں انیس کو ید طولیٰ ہے۔ دریا، جنگل، صبح، شام، دوپہر و سحر کا سماں الفاظ سے ایسا کھینچتے
ہیں کہ مصور کا قلم بھی ایسی تصویر اور نمونہ پیش کرنے سے عاری ہے۔ رزم کا واقعہ بیان کرتے
ہیں تو تلواروں کا چلنا، تیروں کا چمکنا، گھوڑوں کا حملہ اور حریف کے دست و بازو کی صفائیاں
ہو بہو نظروں کے سامنے اس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ گویا ہم اس جنگ میں کھڑے ہو کر تماشا دیکھ
رہے ہیں۔ غرض کہ جس مضمون کو لیا ہے اسے ایسے نباہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی ان کا خاص
رنگ ہے

زبان کی لطافت، محاورات کی دلاویزی اور مضمون کی دلکشی کسی وقت پڑھنے والے کی
طبیعت کو پژمردہ نہیں ہونے دیتی۔ سیکڑوں بند کے مرثیے ہیں پڑھتے چلے جائیے مگر کیا مجال کہ ذرا
بھی طبیعت اکتائے۔ آزاد نے سچ لکھا ہے۔ دونوں (انیس و دبیر) باکمالوں نے ثابت کر دیا
کہ حقیقی و تحقیقی شاعر ہم ہیں کہ ہر رنگ کے مضمون، ہر قسم کے خیال، ہر ایک حال کو اپنے الفاظ
کی تصویر سے ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں چاہیں رلا دیں، چاہیں ہنسا دیں، چاہیں تو حیرت کی
مورت بنا دیں،

سلاست، فصاحت اور روانی میر انیس کے یہاں قدم قدم پر نمایاں ہیں یہاں تک کہ
کوئی دوسرا شاعر اس معاملہ میں مشکل سے ان کا شریک نظر آتا ہے۔ ادق مضامین کو بھی انیس
نہایت آسان لفظوں میں اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ مضمون کی دقت مشکل سے محسوس ہوتی
ہے۔ صفائی و سنجیدگی ان کے کلام کی جان ہیں۔ ابتذال سے سخت نفرت ہے۔ مکالمہ میں کوئی

شاعر انیس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اگر ان کے تمام کلام پر نظر ڈالیے تو وقار و تمکین کے ساتھ اخلاقِ حسنہ کا آئینہ معلوم ہوتا ہے

میر انیس کا کلام پانچ جلدوں میں نولکشور پریس سے شائع ہو چکا ہے لیکن نظامی پریس نے بچپن جوانی اور بڑھاپے کے لحاظ سے کلام کو تین حصوں میں الگ کر کے شائع کیا ہے ہر دور میں تدریجی ترقی نظر آتی ہے میر انیس نے بہتر سال کی عمر پائی ۱۸۷۴ء میں عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا

جب تک لکھنؤ آباد رہا زیادہ تر وہیں رہے لیکن غدر کے بعد جب لکھنؤ تاراج ہوا، تو میر انیس اور مرزا دبیر کی زیارت کا موقع دوسرے شہروں کو بھی نصیب ہوا عظیم آباد بنارس حیدرآباد اور الہ آباد کو بھی ان کی زیارت اور کلام سننے کا موقع ملا

(۱۰)

دورِ جدید

غدر کے ہنگامے کے بعد نہ صرف ہندوستان کی سیاسی و معاشرتی زندگی پر اثر پڑا بلکہ علمی ادبی دنیا میں بھی انقلاب عظیم ہوا۔ انگریزی ادب سے روشناس ہوتے ہی اس کے گوناگوں اصناف شاعری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈراما، مناظر اور مختلف عنوان کی کارآمد نظموں کی ابتدا ہوئی۔ حالانکہ اُردو میں جن لوگوں نے اس راستہ کو دکھایا انھوں نے خود باقاعدہ کبھی انگریزی تعلیم حاصل نہ کی تھی لیکن صحبت کا اثر اور زبان کی محبت نے دلوں کو اُبھارا اور رفتہ رفتہ انھوں نے وہ رہنمائی کی کہ زمانہ کی آنکھیں کھُل گئیں۔ ایک وسیع میدان سامنے دیکھ کر پامال راستے اور فرسودہ حالات سے گھبرا کر اُردو کی دنیا نے نئی منزل کی طرف قدم اُٹھایا۔

تحریکِ اصلاح فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوگئی تھی سرسید اور اُن کے ساتھیوں نے علمی مضامین اور اخلاقی بحثیں مدلل و مؤثر طریقے سے پیش کر کے ایک نیا راستہ کھول دیا تھا البتہ نظم کی ترقی کے لیے شاید زمانہ آزاد و حالی کا منتظر تھا۔ آزاد نے پنجاب میں رہ کر ایک علمی انجمن قائم کی جس کا مقصد اُردو شاعری کی اصلاح اور ترقی تھا جس میں بجائے مصرع طرح کے عنوان نظم دیا جاتا تھا۔ اسی انجمن میں حالی نے اپنی مشہور اور بہترین نظمیں "برکھا رُت" وغیرہ پڑھیں تو ملک میں بجلی کی طرح دوڑ گئیں اور عام طور سے مقبول ہوئیں۔

حالیؔ اور آزادؔ نے شاعری میں نئی روح پھونک دی یہیں سے اس دور کی بنیاد پڑی جس کا عہدِ حاضر بھی ممنون ہے شاعری میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ اُردو کا شاعر جس کی رسمی دنیا سے الگ ہو کر حقیقت پسندی کی طرف مائل ہوا یعنی مبالغہ سے گریز اور محبت کی تنگ دنیا سے باہر نکل کر کورانہ جذبات نگاری کو ترک کرنے لگا کارآمد موضوع پر مختلف شکلوں میں نظمیں نمایاں ہونے لگیں رفتہ رفتہ سیاسی مضامین بھی اُردو شاعری کے احاطہ میں آ گئے اور عہدِ حاضر میں تو اس کثرت کے ساتھ معاشرتی و سیاسی پہلو پر نظمیں آنے لگی ہیں کہ دوسری چیزیں پس پشت رہ گئی ہیں حقیقت نگاری اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے ۔

آزاد

محمد حسین نام اور آزادؔ تخلص تھا ان کے والد کا نام محمد باقر تھا خاص دلی کے رہنے والے تھے سنہ ولادت ۱۸۳۲ء ہے مولوی محمد باقر اور ذوقؔ سے ایسے مراسم تھے کہ عزیز داری بھی ہیچ تھی جب آزادؔ نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے بیٹے کو ذوقؔ کے سپرد کیا جن کے سایۂ عاطفت میں آزادؔ کی تعلیم و تربیت ہوئی

غدر کے ہنگامے میں آزادؔ نے وہ مصیبتیں پڑیں کہ دنیا نظروں میں سیاہ ہو گئی مولوی محمد باقر شہید ہوئے گھر بار لٹ گیا کچھ دنوں تک آزادؔ کس مپرسی کی حالت میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرے آخر میں لاہور پہنچے اور سررشتۂ تعلیم میں پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے مگر قابلیت کے زور سے رفتہ رفتہ وہ شہرت حاصل کی کہ پنجاب گورنمنٹ کی نظروں میں ان کے سوا کوئی سماتا ہی نہ تھا گورنمنٹ نے ان سے بعض نصاب اور مختلف ریڈریں لکھوائیں جو بہت مقبول ہوئیں ایک مرتبہ علمی خدمات کے لئے کابل اور بخارا بھی گورنمنٹ کی طرف سے بھیجے گئے

آزادؔ کے کارنامے اُردو ادب میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں انھوں

نے نثر میں مختلف کارآمد نظمیں لکھ کر اُردو شاعری کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی بلکہ نثر میں بھی ایسی تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں جو اس سے پہلے نظر نہ آتی تھیں رمزیہ افسانہ، اُردو ادب کی باقاعدہ تاریخ، علم اللسان پر تحقیقات فارسی وغیرہ ایسے کارنامے ہیں جو اُردو میں اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے آزاد کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہوا

آزاد کی شاعری کی خصوصیات

آزاد چونکہ جدید اُردو شاعری کے بانی تھے اس لئے ان کے یہاں شاعری کی تمام خوبیاں نہیں پیدا ہو سکیں بعض جگہ تعقید بھی ہے جیسی بھی کم ہے علو تخیل کا بھی فقدان ہے لیکن عموماً منظر نگاری اور زور کلام کو جس طرح آزاد نے نباہا ہے وہ قابل تعریف ہے لطیف اور نازک جذبات کو نہایت خوبی سے اُبھارتے ہیں ان کے کلام کا خاص جوہر جوش اور درد ہے استعارہ اور تشبیہ کی تہہ میں بھی بہتر مطالب نہایت خوبی سے بیان کر جاتے ہیں

آزاد کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری رقمطراز ہیں " آزاد کی شاعری پژمردہ دلوں کو بہلا سکتی ہے دامن دل سے گرد افکار کو دھو سکتی ہے لیکن حالی کو عروج اور ذہن کو قوت پرواز عطا نہیں کر سکتی شگفتگی، لطافت، ترنم اور نفیس تشبیہوں اور خوش استعاروں کا استعمال آزاد کی شاعری کے اثر کا خاص راز ہے اس رنگ میں اُن کی شاعری منفرد ہے " [1]

اسی لائق مصنف نے آزاد اور حالی کا جا بجا جو موازنہ کیا ہے اس کا احساس ہم کہیں کہیں سے یوں کرتے ہیں " حالی کے برخلاف آزاد کے سامنے کوئی تلقینی یا اخلاقی مقصد شعر لکھتے وقت موجود نہیں رہتا تھا اس لئے ان کے کلام میں حالی کی نسبت زیادہ فطرت ہے " [2]

صفحہ ۱۵ پر لکھتے ہیں کہ " آزاد کے کلام میں جو جوش ہے وہ ہمارے جذبات کو حالی کے کلام سے زیادہ متاثر کرتا ہے "

---

[1] جدید اُردو شاعری از پروفیسر عبدالقادر سروری صفحہ ۱۰۲ ص ۹۱

آزاد اپنی شاعری کو ذریعۂ اصلاح نہیں مانتے بلکہ وہ اس سے گریز کرتے ہیں اسی وجہ سے ان کا کلام خشک اور پھیکا نہیں ہونے پاتا جو موضوع ان کو پسند آجاتا تھا اس پر طبع آزمائی کرکے لطف محسوس کرتے ہیں

ان کی یادگار کئی ایک مثنویاں ہیں مثلاً شبِ قدر، صبحِ امید، گنجِ قناعت، وداعِ انصاف، دادِ انصاف، خوابِ امن وغیرہ ان سب میں خوابِ امن 'طرزِ بیان' روانی 'اشعار وغیرہ کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔

حالی

الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے جب نو برس کے تھے تو سر سے سایۂ پدری جاتا رہا۔ قدیم کی رسم تھی کہ بچے کو پہلے قرآن پڑھاتے تھے چنانچہ ایسا ہی ہوا اس کے بعد فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی ۱۷ سال کے تھے کہ ان کے خلاف مرضی شادی کر دی گئی تاہم انھوں نے کسبِ علم کے مشغلے کو جاری رکھا علمی استعداد روز بروز ترقی کرتی رہی

دہلی میں آکر مرزا غالب کے شاگرد ہوئے مگر غالب کی صحبت سے زیادہ فیضیاب ہونے کا موقع نہیں ملا غدر کے ہنگامے نے کئی سال تک گھر سے باہر نکلنے کا موقع نہ دیا نہیں چار برس کے بعد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے فیض صحبت حاصل ہوا ان کی صحبت سے حالی کے خیالات پر بہت کچھ اثر پڑا شیفتہ مبالغے سے گریز کرتے تھے سچی باتیں اور سیدھے سادے حالات کو نظم کرنا ان کے نزدیک شاعر کا فرضِ اولیں تھا یہ باتیں ایسی تھیں جو حالی کی جدید شاعری کا پس منظر ہو گئیں

شیفتہ کے یہاں آٹھ برس رہ کر لاہور گئے وہاں گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک جگہ ملی جہاں اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی تصحیح کا کام سپرد ہوا چونکہ اس کام میں انگریزی ادب سے

واقعیت کا موقع ملا اس وجہ سے حالی کی طبیعت پر مغربی خیالات کا کافی اثر پڑا اُردو کی پستی دیکھ کر اس کی شاعری اور انشا پردازی کے نقائص پر اصلاح کے لئے کمر باندھی رفتہ رفتہ حالی کو بھی اُس انجمن میں باریابی ہوئی جہاں آزاد نغمہ سنجی کر چکے تھے حالی نے بھی جدید طریقے پر عمل پیرا ہو کر چار مثنویاں اس مشاعرے میں پڑھیں پہلی برکھارُت دوسری نشاطِ اُمید تیسری مناظرہ رحم و انصاف چوتھی حبِ وطن یہ مثنویاں بہت مقبول ہوئیں اس کے علاوہ بعد میں بھی کارآمد نظمیں لکھتے رہے ایک مسدس مدو جزر اسلام کے نام سے لکھا جس میں مسلمانوں کی ترقی اور تنزل کے اسباب دکھائے ہیں ۱۹۱۴ء میں آپ کا انتقال ہوا

اگرچہ جدید شاعری کی بنیاد آزاد کے ہاتھوں پڑی لیکن حالی کی جنبشِ قلم نے اس کو مستقل اور نمایاں شکل دے دی سب سے پہلی چیز جس پر نظر پڑتی ہے وہ اُن کی نظموں کی ضخامت اور بے عنوانوں کی کثرت ہے

حالی کا مجموعۂ کلام بادی النظر میں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) نظمیں (۲) غزلیں بے عنوانوں کے علاوہ ان کی نظموں میں سادگی، روانی، تسلسل اور ایک بڑی حد تک ہمواری، یکسانیت اور یک رنگی موجود ہے

منظر نگاری، واقعہ نگاری، سیرت نگاری، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ قومیت، اظہارِ شخصیت، وسعتِ نظر، صداقت پسندی، جذبۂ ہمدردی اور کہیں کہیں سادگی اور بے تکلفی سرسری کلام میں خاص دلکشی پیدا کر دیتی ہیں

حالی کے مجموعہ کلام کو ایک ضخیم اور طولانی وعظ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا ان کے یہاں درسِ عمل اور واقعیت وعدانی کیفیات سے ہرگز محروم نہیں ہیں

حالی کی قدیم غزلوں میں شیفتہ کا انداز نمایاں ہے جس میں عاشقانہ جذبات نہایت تیز اور پُر اثر ہیں سادگی کے ساتھ لطیف کنائے اور حسن و عشق کے رموز اس طرح آجاتے ہیں کہ پڑھنے والا ایک پُر کیف دنیا کیرہ فضا میں پہنچ جاتا ہے اعتدال اختصار بے تکلفی، ترنم اور کہیں کہیں

سہل ممتنع ان غزلوں کی امتیازی خصوصیات ہیں جدید غزلوں میں حالیؔ نے نئی مہم سر کرنی چاہی مگر شگفتگی و
سلاست اور غزلوں کا فطری لب و لہجہ بہت کم قائم رکھ سکے اس غزلوں کی حیثیت ایک ادبی تجربہ
سے زیادہ نہ بڑھ سکی

اسمٰعیل

ان کا وطن میرٹھ ہے جہاں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے ابھی دنیا کو بہت کم دیکھا تھا کہ
ملازمت کا بار سر پر پڑ گیا سولہ سال کی عمر تھی جب سررشتہ تعلیم میں ملازم ہوئے پہلے دفتر میں کچھ دن
تک کام کرتے رہے لیکن علمی قابلیت نے بہت جلد ترقی کے میدان میں کھڑا کر دیا یہاں تک کہ کالج
کے ہیڈ مولوی مقرر ہو گئے سہارنپور اور میرٹھ میں عرصہ تک اسی خدمت کو انجام دیتے رہے
۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ گئے اس وقت سے برابر وہیں قیام رہا ۱۸۹۹ء میں
پنشن لی اپنے وطن میں آکر بقیہ عمر تالیف و تصنیف میں ختم کر دی ۱۹۱۷ء میں اس جہانِ فانی
سے رحلت کی

مولوی اسمٰعیل کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی وہ اردو ریڈریں ہیں جو بچوں کے لئے انہوں
نے لکھی تھیں یہ کتابیں کچھ ایسے انداز اور مزاج شناسی کے ساتھ لکھی گئیں کہ بہت عرصے تک کورس
میں داخل رہیں اگر ان کی پانچویں ریڈر تک کوئی شخص توجہ کے ساتھ پڑھ لیتا تو اس کو اچھی خاصی
اردو آجاتی۔ مولوی اسمٰعیل کو سررشتہ تعلیم میں رہ کر بچوں کے دل و دماغ سے آشنا ہونے کا بہت اچھا
موقع ملا تھا جس سے انہوں نے وہ فائدہ اٹھایا کہ دوسروں کو نصیب نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انہیں
کتابوں کی بدولت ان کو اردو دنیا نے شاعر کی حیثیت سے بھی جانا بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی نظمیں
لکھ کر انہوں نے کچھ اس انداز سے نغمہ سرائی کی کہ پیرانِ کہن سال کی بھی نظریں پڑنے لگیں پڑھنے
والے اور پڑھانے والے دونوں کم و بیش یکساں متاثر ہونے لگے

اسمٰعیل کا کلام دو حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے ایک تو وہ حصہ جو بچوں کے لئے ہے اور دوسرا وہ جس میں نظمیں ہیں اور دوسرا حصہ وہ جس میں عاشقانہ، صوفیانہ مضامین ہیں بچوں کی نفسیات کا مطالعہ اسمٰعیل نے بہ نظر غائر کیا تھا ان کے مذاق کا صحیح اندازہ تھا چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج پیدا کرنا مولوی اسمٰعیل کا خاص کارنامہ ہے ایسی نظموں میں روانی، لطافت اور ان کی سادگی خاص طور پر پائی جاتی ہے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے موضوع کو شعر کے جامہ میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ دل و دماغ دونوں متاثر ہوتے ہیں ہر قدم پر ایک اُمنگ ایک اُبھار اور ایک خاص کیفیت محسوس ہوتی ہے

منظر نگاری میں بھی اسمٰعیل کو خاص ملکہ ہے وہ تفصیلات میں تو زیادہ نہیں جاتے مگر جذبات و کیفیت کو ہمیشہ مد نظر رکھتے ہیں تشبیہات ایسی پُرلطف لاتے ہیں کہ ایک تازگی محسوس ہوتی ہے، اور طرز بیاں کی خوبی سے منظر کی دلآویزی نہایت پُرکیف و با اثر ہو جاتی ہے۔

اسمٰعیل کی دوسری نظموں کا رجحان زیادہ تر اصلاحی ہے اتحاد و اتفاق کی تعلیم کے علاوہ کام کرنے اور باکار رہنے کی تلقین زیادہ ہے اس مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے کبھی کبھی وہ عہد ماضی کا عروج اور عہد حاضر کی پستی کا موازنہ کر کے عبرت دلانے کی کوشش کرتے ہیں کبھی کبھی اکبر کی طرح انگریزی فیشن سے گریز پر بھی زور دیتے ہیں اور سماجی کمزوریوں کی طرف پر اثر اشارے کرتے ہیں وہ اپنا اصلاحی مقصد قصائد وغیرہ میں بھی نہیں بھولتے کبھی کبھی کارآمد نصیحت اس میدان میں بھی کر جاتے ہیں غزلوں میں وہ زیادہ تر تصوف کے مسائل نظم کرتے ہیں عشقیہ مضامین بھی پُرزور انداز میں بیان کرتے ہیں مگر سرمستی اور تاثیر کی کمی محسوس ہوتی ہے اسلوب و لہجہ کے لحاظ سے غزلیات میں غالب کا اثر نمایاں ہے ان کی غزلوں پر غزلیں بھی اسمٰعیل نے لکھی ہیں یوں بھی کلام سے غالب کی تقلید نمایاں ہے وہ غالب کو اپنا استاد بھی مانتے تھے مگر اُن کی سوانح عمری سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ شاعری کے لئے وہ کسی استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے یا نہیں

مولوی اسمٰعیل کو انگریزی نظموں کے ترجمہ کرنے کا خاص ملکہ تھا جہاں کہیں انھوں نے نظم کا ترجمہ نظم میں کیا ہے وہاں محاورہ اور سلاست کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ان کا عام انداز بیان نہایت سیدھا سادہ ہے ہندی الفاظ مثلاً کھپ، سکت، ملیامیٹ دلدر وغیرہ کے استعمال میں تکلف نہیں کرتے

ان کے کلیات میں مختلف اصناف شاعری نظر آتے ہیں، غزل، رباعی، قصیدہ کے علاوہ سلام و مرثیہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے مولوی اسمٰعیل ہر حال میں بچوں کا خیال رکھتے ہیں ایک غزل کہی ہے جو مومن کی مشہور غزل "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کے جواب میں ہے اس میں خالق باری کی طرح بچوں کے لئے لغت کا مجموعہ اکٹھا کر دیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں

وہی کارواں وہی قافلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی منزل اور وہی مرحلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن
اسے وزن کہتے ہیں شعر کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی شکر ہے جو سپاس ہے وہ ملول ہے جو اُداس ہے
جسے شکوہ کہتے ہو ہے گلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی بغض ہے وہی کھوٹ ہے وہی ضرب ہے وہی چوٹ ہے
وہی سود ہے وہی فائدہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی ہے ندی وہی نہر ہے وہی موج ہے وہی لہر ہے
یہ حباب ہے وہی بلبلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے بھید کہتے ہو راز ہے جسے باجا کہتے ہو ساز ہے
جسے تان کہتے ہو ہے نوا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی خار ہے جو دلیل ہے وہی دوست ہے جو خلیل ہے
مدد اتنی کیا ہے بُرا بھلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سرور

منشی درگا سہائے سرور حکیم پیارے لال کے بیٹے تھے۔ آپ کی ولادت دسمبر ۱۸۷۲ء[1] میں جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں ہوئی۔ آپ کے بزرگ اس قصبہ کے قدیم رئیس و زمیندار تھے۔

سرور کی ابتدائی تعلیم جہان آباد کے تحصیلی اسکول میں ہوئی۔ وہیں سے انھوں نے اُردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ ابتدا ہی سے وہ اپنی جماعت میں ذہانت کی وجہ سے ممتاز رہے۔ اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد آپ نے مولوی سید کرامت حسین بہار سے فارسی پڑھنا شروع کیا۔ شعر و سخن کا شوق بھی اسی وقت سے پیدا ہوا۔ لکھنے پڑھنے سے جس قدر وقت بچتا تھا شعر گوئی اور شعرا کا کلام دیکھنے میں صرف کرتے تھے۔ آپ اصلاح بھی مولوی صاحب موصوف سے لیا کرتے تھے۔

عرصے کے بعد سرور کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا۔ جہان آباد میں اس کے لیے کوئی اسکول نہ تھا۔ لہٰذا ایک پوسٹ ماسٹر سے انگریزی پڑھنا شروع کر دیا۔ دو سال کے عرصے میں آپ نے انگریزی مڈل کا بھی امتحان پاس کر لیا۔ شعر و شاعری کا مشغلہ جاری رہا۔ ابتدا میں وحشت تخلص اختیار کیا لیکن پھر سرور ہو گئے۔

۱۸۹۹ء سے آپ کا کلام ادبی رسالوں میں شائع ہو کر مقبولِ عام ہونے لگا۔ ادیبِ دہلی میں آپ کا کلام خاص طور سے جگہ پاتا رہا۔ سرور بہت اُمنگ کے ساتھ اشعار میں اپنی جوشِ دلی کا ثبوت دے رہے تھے کہ دفعتاً ان کا اکلوتا بیٹا جس کی ماں ایک سال کا چھوڑ کر

---

[1] ماخوذ از جامِ سرور

مری بھی انتقال کر گیا اس حادثے نے سرور کی طبیعت میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہر وقت غم زدہ
رہنے لگے اور غم غلط کرنے کے لئے مے نوشی اختیار کر لی حالانکہ کہتے ہی تھے کہ ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

لیکن آخر میں اس قدر پینے لگے تھے کہ کئی کئی روز تک مست و بیہوش رہتے تھے ۳ر اپریل
۱۹۱۰ء کو سرور نے اپنا مجموعۂ کلام مرتب کرنے کی غرض سے الہ آباد کا سفر کیا ۲ر جون کو
آپ الہ آباد سے وطن آئے دوبارہ پھر اسی سلسلہ میں الہ آباد جا رہے تھے کہ یکایک بخار اور
درد سینہ میں مبتلا ہو گئے اور دو ہی روز میں ۳ر دسمبر ۱۹۱۰ء کو رحلت کر گئے

سرور بہت نیک طبیعت حلیم اور راست باز تھے گفتگو کا انداز خاص تھا اس میں منکسر
مزاجی ایک قسم کی سرشاری پیدا کر دیتی تھی طبیعت میں ظرافت اور رندانہ دلی بھری تھی "بندہ نواز"
ان کا تکیہ کلام تھا شاعری کے اثر سے طبیعت میں وارفتگی پیدا ہو گئی اور تنہائی زیادہ پسند
کرتے تھے

سرور کے یہاں نظموں کا ذخیرہ غزلیات کے مقابلہ میں زیادہ ہے آپ نے گوناگوں
مسائل سے کلام میں ندرت و تنوع پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ان کے یہاں امتیازی
خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ محض ایران و عرب ہی کے دریا و جانور وغیرہ کو جذبات انگیزی
کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ ہندوستان کی بھی چیزوں کو سامان جذبات حاصل کر کے کلام میں بہت
نمایاں جگہ دی ہے بلبل قمری دجلہ فرات لیلیٰ وغیرہ کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کی کوئل پپیہا
ہنس سارس، مرغابی، گنگا، جمنا، دسہرہ دیوالی کو جگہ دی ہے گویا سودیشی پیداوار کو بدیسی مال
کے پہلو بہ پہلو سجا دیا ہے

سرور کے پہلو میں ایک ایسا حساس دل تھا جو پھول وغیرہ میں بھی ذہنی رنگ جذبات
ڈھونڈھتا تھا جو انسان کے دل میں عموماً ہوتے ہیں سرور کی نگاہ بہت دقیق ہے

رس لینے کی اہلیت اس درجہ ہے کہ غیر مادی اشیاء اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کی زندگی سے سبق لے کر حقیقت کے موتی حاصل کرتے ہیں گویا مادی چیزوں سے روحانی منزل تک بالعموم پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں خاک وطن سے محبت کے اظہار میں ان کا ایک ایک لفظ سے عقیدت و اخلاص کا بہتا ہوا دریا نظر آتا ہے اور اسی سلسلہ میں اس قدر جوش آتا ہے کہ جن کو وطن سے محبت نہیں ان پر لعنت کے تیر برسا دیتے ہیں

سرور کا کلام نہ صرف مبالغہ سے پاک ہے بلکہ اس کی جگہ حقیقت لئے ہوئے ہے خیالی باتوں کی جگہ عموماً زندگی کے روزمرہ کے واقعات دلچسپ طریقے سے جگہ پاتے ہیں طرز بیان میں فارسی تراکیب سے شیریں اور روانی پیدا کر دیتے ہیں الفاظ کے انتخاب میں عموماً بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے شعر میں ایک ترنم اور ساتھ ہی ساتھ کیف بھی پیدا ہو جاتا ہے ان ہی سب باتوں کی وجہ سے وحدت کے متعلق مضمون میں دلکشی پیدا کر دیتے ہیں گھریلو زندگی کا بھی جب نقشہ کھینچتے ہیں تو تاثر بڑھتے جاتے ہیں باقی تغزل کی چاشنی دیگر نظموں کا لطف دوبالا کر دیتے ہیں

میر کی طرح سرور کے کلام میں غم واندوہ اُن کے دل کی پکار معلوم ہوتے ہیں سرور نہایت سلیقہ کے ساتھ جذبات کو خیالات سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اشعار محسوسات کا مرقع ہیں

سورج نرائن مہر

مہر کی حد سے بیوں بھی قائل نہ رہیں کہ جب اُردو کی فضا میں غزل کا نغمہ گونج رہا تھا مستقل نظموں کی طرف لوگوں کا التفات بہت کم تھا انھوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ طبع زاد موضوع پر نظمیں لکھی ہوں بلکہ انگریزی کی نظموں کو شعر کا جامہ پہنا کر زبان میں حتی المقدور وسعت پیدا کرنے

کی کوشش کی لیکن یہ نظمیں زیادہ تر لفظی ترجمے کی حیثیت رکھتی ہیں، چنانچہ "کلام مہر" کے دیباچہ میں
خود رقم طراز ہیں کہ انگریزی نظموں کے ترجمے خاکسار نے ۱۸۹۱ء میں کئے تھے یہ نظمیں انگریزی
نظموں کے تقریباً لفظی ترجمے تھے اُن میں میرا کچھ نہیں ہے کہیں کہیں تصرف ہے۔ ورنہ بالحاظ محاورۂ زبان
کے لحاظ سے چھوٹی موٹی تبدیلی بے شک عمل میں آئی ہے ورنہ یوں سمجھئے کہ اُردو میں انگریزی نظمیں
ہیں اُن میں ہر قسم کے مضامین کے نمونے شامل ہیں مزاح، سوز، تصور بیان، اخلاق، فلسفہ وغیرہ
کئی عشقیہ کہانیاں بھی ہیں لیکن یہ عشق زبانِ اُردو کے عشق سے کچھ علیحدہ ہے۔

ان ترجموں کے علاوہ مہر نے اپنی طبیعت سے بھی اخلاق و دیگر عنوانوں پر طبع آزمائی
کر کے مختلف نظمیں کہی ہیں جن کا ذخیرہ کافی بڑا ہے ان نظموں میں دنیا سے بیزار ہو کر موت کا
انتظار کرتے ہیں یہاں رہنے کے لیے نفس کشی کی زبردست تعلیم دیتے ہیں مہر کے کلام میں
تصوف بھی کافی ہے راہِ سلوک کی اکثر باتیں ایسی لکھی ہیں کہ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے
اقوال رسمی نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے دل سے نکلے ہیں جو خود بھی سالک راہ تھا چنانچہ اس
سلسلے میں مہر نے اکثر مستقل عنوانات پر طبع آزمائی کی ہے مثلاً رموزِ عشق، رموزِ عرفان، ترکِ خودی
ہمہ اوست، وصال وغیرہ

مہر عرصہ دراز تک سررشتہ تعلیم میں ملازم رہے اس لئے انہوں نے "بچوں کے لیے نظمیں"
بھی کہی ہیں مولوی اسمٰعیل کی طرح ان کو اُردو ادب سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اکثر ترنم ریز
بحریں اختیار کی ہیں یہاں زبان خاص طور سے نرم و شیریں ہے بچوں کے لیے سبق آموز کارآمد
موضوع پر قلم اٹھایا ہے لیکن اُن کا ذہن ہر جگہ بچوں تک محدود نہیں تھا بلکہ جوان اور بوڑھوں کی
بھی دلچسپی کا سامان موجود ہے ایسے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں جو دماغ پر زور اور سبق آموز ہیں
مثلاً اُن کا مل تدریج حیاتِ انسانی کے لئے ناکافی ہے؟ وغیرہ

مہر نے اُردو ادب کے اکثر اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی ہے، قصیدہ، غزل، مسدس
مخمس، مثنوی، مستقل نظمیں، قطعات وغیرہ سب ہی ان کے مجموعہ میں شامل ہیں کلام استدلال

سے یک قلم پاک ہے سادگی و صفائی خوب ہے شعریت البتہ کہیں کہیں کم ہو جاتی ہے طرز بیان نہایت صاف و ستھرا ہے کلام خلوص کا آئینہ ہے اور زبان و محاورات کا منتخب ذخیرہ

نوبت رائے نظر

آپ لکھنؤ میں سنہ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے آپ کا خاندان نہایت معزز کائستھ خاندان تھا جس کے اکثر افراد شاہی زمانے میں معزز عہدوں پر مامور رہے نظر کی تعلیم و تربیت زیادہ تر لکھنؤ ہی میں ہوئی علمی ذوق بچپن ہی سے تھا سن شعور کے پہنچتے ہی شعر گوئی کا بھی شوق ہوا آغا مظہر لکھنوی سے اصلاح سخن لینے لگے اور رفتہ رفتہ وہ مشق بہم پہنچائی کہ خود بھی استاد سمجھے جانے لگے

زندگی کا بیشتر حصہ علم و ادب کے لئے نظر نے وقف کر دیا تھا نثر و نظم دونوں میدانوں میں توسن فکر رواں رہتا اردو کو ترقی دینے کے لئے مختلف رسالوں کی قابل قدر خدمات انجام دیتے رہے سنہ ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ سے ایک رسالہ "خدنگ نظر" ماہانہ نکالنا شروع کیا یہ رسالہ دراصل اردو غزلیات کا ایک ماہانہ گلدستہ تھا اس وقت ملک میں اس قسم کے گلدستوں کے نکالنے کا عام رواج تھا نظر نے اس میں ایک اضافہ یہ کیا کہ نثر کے مضامین بھی لکھنا شروع کر دیئے کچھ عرصہ تک یہ رسالہ نہایت کامیابی کے ساتھ نکلتا رہا مگر زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا

سنہ ۱۹۰۴ء میں نظر رسالہ زمانہ کے نائب مدیر مقرر ہوئے ان کی خدمات کی وجہ سے زمانہ کی ابتدائی شہرت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا جنوری سنہ ۱۹۱۰ء میں انڈین پریس الہ آباد سے اردو کا مشہور رسالہ ادیب بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلا اس کی ایڈیٹری کے

ماخوذ از زمانہ جنوری سنہ ۱۹۲۴ء

نے جناب نظر منتخب کئے گئے۔ اس رسالہ کو آپ نے اس حسن و خوبی کے ساتھ شائع کیا کہ دنیائے ادب میں ادیب کو تھوڑے ہی عرصہ میں ایک ممتاز جگہ نصیب ہو گئی۔ افسوس کہ چند وجوہ سے نظر کو ادیب سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی اور سنہ ۱۹۱۲ء میں وہ پھر "زمانہ" کے دفتر میں چلے گئے اور وہاں تقریباً دو سال تک قیام رہا۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں نظر بسلسلہ ملازمت نولکشور پریس لکھنؤ چلے گئے اور وہاں سے اودھ اخبار نکالتے رہے۔ اس اخبار سے سنہ ۱۹۲۳ء تک تعلق رہا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں بعارضہ ضیق النفس آپ کا انتقال ہوا۔

نظر کی شہرت کا دامن نظموں سے زیادہ غزلیات سے وابستہ ہے۔ ان کی غزلوں میں سوز و گداز سب سے پہلی خصوصیت ہے جو پڑھنے والے کو اپنی طرف فوراً متوجہ کر لیتی ہے۔ بندش کی چستی محاوروں کی خوبی سے کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ غزل کے اشعار عموماً نہایت صاف اور سادے ہوتے ہیں مگر بیت اس خوبی سے جگہ پاتی ہے کہ تاثیر کے ساتھ معنی آفرینی نظر کی غزلیات کی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔ کلام کی پختگی اور صفائی کے ساتھ ساتھ جدت طرازی بھی ہے۔ ان کی غزلیات میں الفاظ کا انتخاب نہایت پسندیدہ ہے۔ فارسی و عربی کے ملائم و شیریں الفاظ و محاورات سے شعر کے حسن میں نہایت خوبی سے اضافہ کرتے ہیں۔

نظر نے مستقل نظموں پر بھی طبع آزمائی کی ہے مگر ان کا فطری ذوق غزلوں کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ زمانہ کی رفتار دیکھ کر انہوں نے بھی نیچرل اور دوسری نظموں کے لکھنے کے لئے قلم اٹھایا ہے مگر وہ خوبی نہیں پیدا ہو سکی جو غزل میں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی نظموں کا کوئی مرتبہ نہیں ہے اور ضرور ہے۔ تغزل کے معاملہ میں پیش نظر آتی ہیں۔ ہاں جہاں کہیں انہوں نے نظموں میں تغزل کی چاشنی پیدا کر دی ہے وہاں تاثیر کافی ہو جاتی ہے۔ نظمیں عموماً صفائی و سادگی کی سرمایہ دار ہیں، متانت و سنجیدگی ہر جگہ ہے۔ اس ہی وجہ سے دلکشی بھی قائم رہتی ہے۔ بعض اوقات منظر نگاری میں ان کا قلم مصور کے قلم کی طرح مختلف صورتوں کو نہایت حسن و خوبی سے تفصیل کے ساتھ نظروں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

اکبر

سید اکبر حسین نام تھا اور اکبر تخلص میر تفضل حسین کے بیٹے تھے۔ اکبر کی ولادت کا فخر الہ آباد کو حاصل ہے۔ ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد پیدا ہوئے جہاں ان کے چچا تحصیلدار تھے۔ اکبر ابتدائی تعلیم میں بھی اپنی ذہانت کی وجہ سے ہمیشہ اپنے درجوں میں ممتاز رہے۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان اول درجے میں پاس کیا کچھ دنوں کے بعد نائب تحصیلدار ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے ہائی کورٹ کی وکالت پاس کر کے منصف ہو گئے۔ آخر میں جج خفیفہ کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ بالآخر سنہ ۱۹۰۵ء میں پنشن لے کر علمی زندگی بسر کرنے لگے۔

اکبر کی ترقی اور شہرت کی اہمیت سرکاری خدمات کی وجہ سے نہیں بلکہ اُن کے نئے انداز بیان و طرز تخیل میں مضمر ہے۔ اُن کو شعر و شاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا۔ وحید کو اپنا کلام دکھاتے تھے جو خواجہ آتش کے بیک واسطہ شاگرد تھے۔ ابتدا میں اکبر بھی اسی رنگ میں شعر کہتے جو اُس زمانہ کا خاصا تھا یعنی مقررہ مضامین کو سیدھے سادے الفاظ میں نظم کرتے تھے۔ اس رنگ میں بھی جو کچھ اکبر نے کہا ہے وہ آسانی سے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ جذبات کو یوں ادا کرتے ہیں جیسے کسی پر خود گزر رہی ہو۔ صفائی اور سادگی اُس زمانہ میں بھی ہر جگہ نمایاں ہے۔

اکبر کی شہرت اس وجہ سے ہوئی جب انھوں نے قدیم رنگ کو خیرباد کہہ کر اپنے لئے ایک نہایت کارآمد میدان تلاش کیا۔ بچپن سے اکبر کی طبیعت میں شوخی و ظرافت موجود تھی جب اُنھوں نے نئے میدان میں قدم رکھا تو یہی دونوں باتیں اُن کے طائر کلام کے لیے پر پرواز ثابت ہوئیں۔

ملک اور قوم کی حالت کو تباہ ہوتے دیکھ کر ان کا دل بھر آتا تھا۔ آہ و فریاد سے

زمانہ کو چونکانا مناسب نہ سمجھا کبھی چٹکیاں لے کر کبھی طنز آمیز باتیں کہہ کر دلوں کو
ابھارنے کی کوشش کی مغرب کی کورانہ تقلید دیکھ کر اہلِ مشرق کو طرح طرح سے سمجھاتے
ہیں کہ آنکھ بند کر کے یورپ کی ہر بات کو قبول نہ کرو بلکہ وہ جوہر پیدا کرو کہ جس سے
تمہاری اور ملک کی حالت بہتر ہو۔ روزمرہ کی زندگی کی اصلاح چھوٹی چھوٹی نظموں میں
اس طرح کرتے ہیں کہ فلسفی اور واعظ کی لمبی لمبی تقریریں و تحریریں ہیچ ہیں سیاسی معاملات
کو بھی دور اندیشی کی عینک سے دیکھتے اور ایسے اشعار سے لوگوں کو نتائج کی خبر دیتے۔
اُن کی ظرافت اور بذلہ سنجی کسی نہ کسی تبلیغی مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے اور خوبی یہ ہے
کہ ان کی نصیحت کبھی ناخوش گوار نہیں معلوم ہوتی ایسے طرزِ بیان سے وہ تلخ باتوں
کو بھی شربت کا گھونٹ بنا دیتے ہیں

اس عہد کی شاعری (۳) اکبر نے تصنع اور باریک بیانی سے کبھی مشکل سے کام لیا ہوگا
سامنے کے مضامین کو نئے الفاظ اور نئے ڈھنگ سے اس طرح پیش کیا ہے کہ سنتے ہی
دلوں پر اُن کا جادو چل جاتا ہے ان کے مخصوص الفاظ کی فہرست پر نظر ڈالیے تو بظاہر
مکروہ معلوم ہوں گے مگر جب اکبر اپنی طباعی اور ذہانت سے اُن ہی الفاظ کو شعر کے جامے
میں پیش کرتے ہیں تو ہزار معنویت کا سامان پیدا ہو جاتا ہے بُدھو میاں کلو بیگ۔ اونٹ
ٹٹو ریل گاڑی وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو سادہ اور معمولی نظر آتے ہیں مگر اکبر اُن سے وہ
کام لیتے ہیں کہ دقیق اور بھاری بھرکم فقروں سے بھی نہیں ہو سکتا اکبر کی شاعری کا مقصد
زیادہ تر اصلاحِ قوم و ملک ہے جس میں وہ ہندو اور مسلمان سب ہی کو مخاطب کر لیتے ہیں۔
مگر زیادہ تر مسلمانوں کی طرف روئے سخن ہوتا ہے

اکبر نے انگریزی الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں جن میں بیشتر بظاہر ثقیل اور
ناقابلِ قبول ہیں مگر اکبر کے کلام میں یہی الفاظ نہایت بامزہ معلوم ہوتے ہیں افسوس کہ
اس طرح پر ہنسا ہنسا کے کام لینے اور اصلاح کرنے والا ۱۹۲۱ء میں راہیِ ملکِ بقا

ہوا اکبر کا یہ کارنامہ وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے وجود میں آیا جس میں اصلاحی مقصد تمام تر پیش نظر رہا ممکن ہے کہ ادب اکبر کو اس کارنامہ پر حیات جاوید عطا نہ کرے مگر اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اپنے ماحول کی ترجمانی اور سماج کی درستی بھی شاعر کا ایک بڑا فریضہ ہے۔

اکبر کی وہ نظمیں جو کسی تبلیغی مقصد کے تحت میں نہیں کہی گئیں ہیں اُن کی اہمیت سے نہ ادب انکار کر سکتا ہے اور نہ کوئی بڑے سے بڑا استاد ایسی نظمیں کلیات اکبر میں بہت کم ہیں مگر جتنی بھی ہیں نہایت قابل قدر و لازوال ہیں "جلوۂ دربار دہلی" "مانی کا ہاؤس" "برق کلیسا" ہر ملند پایہ شاعر کے لئے باعث افتخار ہو سکتی ہیں

شاد

شادؔ[1] کے والد سید عباس مرزا کی ولادت کا فخر ضلع الہ آباد ہی کو حاصل ہے چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ یہاں سے عظیم آباد چلے گئے جہاں شادؔ کی ولادت ۱۸۴۶ء میں ہوئی شادؔ کا خاندان عرصہ دراز سے اپنے کمالات و شاہی خدمات کی وجہ سے مشہور و معروف رہا ہے شادؔ کی تعلیم کا سلسلہ چار برس کی عمر سے شروع ہو گیا تھا کئی ایک مولویوں نے ابتدائی کتابیں پڑھائیں لیکن تربیت سرسید مرحوم کے ذمہ تھی جو اُردو زبان کے بہت بڑے محقق تھے ان ہی کی تربیت کا اثر تھا جس نے آئندہ چل کر شادؔ کی زبان کو اس قدر فصیح و بلیغ کر دیا تھا کہ وہ اپنے وقت کے میر سمجھے گئے عربی فارسی کی کتابیں پڑھنے کے بعد ایک بزرگ کے اصرار سے انگریزی بھی شروع کر دی لیکن یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا تھوڑے ہی عرصہ میں اس تعلیم سے دست بردار ہو جانا پڑا

---

[1] ماخوذ از گلشن حیات

شاد نے کلام پر اصلاح شروع میں دو شخصوں سے لی۔ ناظر ورزعلی عشرتی اور مولانا پیر نصرت حسین رضوی۔ ادبیات دینیات شاعری کی اکثر کتابیں انہیں دونوں بزرگوں سے پڑھیں لیکن اس کی تکمیل شاہ اُلفت حسین فریاد سے کی جو خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔

شاد کی ہمہ گیر طبیعت نے اُن کو محض اسلامی علوم پر اکتفا نہ کرنے دیا بلکہ عیسائیوں کے عہد نامجات عتیق و جدید، پارسیوں کی ژند و پاژند اور ہندوؤں کی رامائن و گیتا وغیرہ کے پڑھنے کا بھی موقع دیا۔

شاد نے اپنی کل عمر اُردو ادب کی خدمت میں گزاری کئی ایک تصنیفات یادگار ہیں ان کی علمی خدمات کا صلہ گورنمنٹ کی طرف سے بھی ملتا رہا۔ چنانچہ مؤلف گلشن حیات رقم طراز ہیں "کہ آپ کے کمالات و ریاضت اور ان علمی خدمات کے عوض میں جو آپ نے اپنی مستقل تصانیف کے ذریعہ اہل وطن کی کی ہیں گورنمنٹ نے آپ کو ۱۸۹۱ء میں خان بہادر کا خطاب عطا کیا سرکار سے ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا رہا" شاد نے ۱۹۲۷ء میں اس دنیا سے رحلت کی۔

شاد کے کلام کی سب سے نمایاں خوبی زبان کی صفائی و سادگی ہے نہایت شیریں و منتخب الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اشعار کو اتنا پُر تاثیر بنا دیتے ہیں کہ فوراً دل و دماغ متاثر ہو جاتے ہیں لطف یہ ہے کہ روزمرہ و عام فہم الفاظ میں وہ ادنیٰ سے ادنیٰ مضامین نہایت آسانی سے کہہ جاتے ہیں جو اُن کی اُستادی و کہنہ مشقی کا بین ثبوت ہے۔ ان کے کلام میں اخلاق، فلسفہ اور توحید کا عنصر غالب ہے عموماً انداز بیان میر سے بہت کچھ ملتا ہے محاورات اس خوبی سے لاتے ہیں کہ زبان میں ایک لے سی پیدا ہو جاتی ہے مختلف مذاہب کی روحانی تعلیمات کے مطالعہ سے نہ صرف شاد کی نظر بہت وسیع ہو گئی تھی بلکہ تمام کلام میں ایک ایسا کیف پیدا ہو گیا ہے جس کو پڑھ کر خود بخود ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

شاد نے بہت سے کہنہ مشقوں کی صحبت اٹھائی تھی جس کی وجہ سے کلام میں پختگی اور مضبوطی مدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ میر انیس و مونس کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے لہذا کلام میں ان لوگوں کی زبان و بیان کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس اعتبار سے ان کا تعلق عہدِ قدیم سے بہت گہرا ہے۔

یوں تو شاد نے اردو کے اکثر اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی ہے لیکن مرثیہ اور غزل کے میدان میں انھوں نے خاص جوہر دکھائے ہیں۔ مرثیہ میں زبان و خیال وغیرہ کے اعتبار سے میر انیس کا تتبع کیا ہے، فصاحت، سلاست، مضمون آفرینی، بلند پردازی، کردار نگاری، منظر نگاری شاد کے مرثیوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

سنہ ۱۹۲۸ء میں شاد کی غزلوں کا دیوان اُن کے عزیز شاگرد حمید عظیم آبادی نے مرتب کر کے ثمرۂ الہام کے نام سے شائع کیا ہے۔ دیوان مرتب کرنے والے اگر غالب کے طریقۂ انتخاب پر عمل کریں تو شاید نقصان میں نہ رہیں۔ دیوان شاد میں یہ روش نہیں رکھا گیا ممکن ہے کہ رطب و یابس سب کچھ ایک جگہ جمع ہو گیا ہے اور مجموعی حیثیت سے کلام اتنا پُر اثر نہیں ہو سکا جتنا انتخاب سے ہو جاتا۔

نظم طباطبائی

ان کے والد کا نام میر مصطفےٰ حسین طباطبائی تھا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو حضرت امام حسین علیہ السلام کے شاید تربیتے یا پوتے ہوتے تھے ملتا ہے۔ نظم ۲ محرم روز جمعہ سنہ ۱۲۶۹ھ کو بمقام حیدر گنج لکھنو پیدا ہوئے سولہ سال کی عمر تک آپ نے اپنے وطن میں رہ کر ملا طاہر نحوی سے عربی فارسی صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ ان ہی ایام میں

ماخوذ از زمانہ اگست ۳۳ء

سینڈرلال زار سے علوم متداولہ اور فن سحر حاصل کرتے رہے۔

نظم اسی خداداد ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے شاہ اودھ کے شاہزادوں کی اتالیقی کے لیے منتخب کئے گئے شارح پہنچ کر استادی شاگردی دونوں کا سلسلہ ایک ساتھ ہی وقت میں قائم رکھا یعنی شاہزادوں کو تعلیم دیتے رہے اور خود علامہ قائمۃ الدین مرزا سمد علی مجتہد سے معقولات کا درس لیا کرتے تھے۔

جب واجد علی شاہ کا انتقال ہوا تو نظم نظام کالج حیدر آباد میں پروفیسر کی حیثیت سے طلب کئے گئے جہاں کچھ دنوں تک قائم مقام رہے لیکن سال بھر کے بعد مستقل ہو گئے تقریباً تیس سال تک آپ طلبائے نظام کالج کو اپنے چشمۂ علم و فضل سے سیراب کرتے رہے اس کے بعد آپ کو نظام سرکار سے حسن خدمت کے صلہ میں وظیفہ مل گیا لیکن نظام نے قدردانی فرمائی اور ولی عہد کی تعلیم کے لئے نظم کو مقرر فرمایا جنھوں نے یہ خدمت بھی کچھ اس حسن و خوبی سے انجام دی کہ سرکار نظام سے نواب حیدر یار جنگ کا خطاب عطا ہوا

جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہوا تو قدردانوں نے نظم کو دارالترجمہ کی طرف کھینچا جہاں ناظر ادبی کی حیثیت سے آپ نے کام شروع کیا جتنی کتابیں اس محکمہ سے ترجمہ ہوئیں آپ ان کو شائع ہونے سے پہلے ایک بار ادبی نقطۂ نظر سے دیکھ لیا کرتے۔ ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو اس قابل قدر ہستی کی خدمات سے اردو ادب ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا

طباطبائی کی ذات فضل و کمال کے لحاظ سے اس زمانہ میں عدیم المثال تھی باوجود اس کے کہ آپ پرانے لوگوں میں سے تھے مگر پھر بھی مغربی خیالات و ادب سے متاثر ہو کر جدید قسم کی نظموں میں آپ نے وہ نام پیدا کیا کہ گھر گھر شہرہ ہو گیا کچھ نظمیں تو ایسی ہو گئی ہیں جن کا جواب مشکل سے ہو سکتا ہے انگلستان کے مشہور شاعر "گرے" کی ایک نظم (گرے کی ایلیجی) کا ترجمہ "گور غریباں" کے نام سے اس خوبی سے کیا ہے کہ ان کی شہرت میں چار چاند لگ گئے کسی زبان سے دوسری زبان میں نظم کا ترجمہ کرنا یوں بھی آسان کام نہیں چہ جائے کہ

اُن کی تمام خوبیاں منتقل کرنا اسی نظم کے متعلق عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ "ایسی مقبول روزگار ایسی سرمایۂ ناز نظم جس کا ترجمہ ہمارے واجب التعظیم علامہ اور مستند زمانہ شاعر جناب مولوی علی حیدر صاحب نے کیا ہے مگر کس خوبی سے جس کا اظہار کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ ایسی جانگداز اور موثر نظمیں اور محل طور پر بھی اُردو میں کم کہی گئی ہیں نہ کہ ترجمہ اور پھر اس پابندی کے ساتھ کہ جس طرح پہلے مصرع کا قافیہ تیسرے مصرع سے اور دوسرے مصرع کا چوتھے مصرع سے انگریزی میں ملتا ہے اسی طرح ہمارے مولانا نے بڑے لطف سے اسی طرز قافیہ بندی کو چھوڑ کے اُردو میں ملایا ہے" اگر اصل انگریزی میں دیکھ کے اس ترجمہ کو ملاحظہ فرمایئے تو معلوم ہوتا ہے سوز و گداز کے علاوہ قبرستان کا منظر بعینہٖ حقیقتہً جملہ خوبیوں کے ساتھ گورِ غریباں میں جلوہ افروز ہیں اور اُردو کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں جانے پایا محاورات انداز بیاں مصرعوں کی ساخت ترقی غرضکہ پورا ماحول اُردو کا ہے

نظم نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں مثلاً مناظر قدرت، اخلاقیات، تاریخ وغیرہ اور ہر ایک میں خیال و حقیقت کے ساتھ شاعری کا مزہ پوری طرح قائم رکھا ہے گلاب کا پھول ایک مختصر سی نظم ہے مگر دنیا کی بے ثباتی اور انجام کا بہترین مرقع ہے ساقی نامۂ نقشبندیہ نے اپنے طرز بیاں اور تاثیر کی وجہ سے کافی شہرت پائی ہے اس نظم میں روانی اور برجستگی کے علاوہ مراسِ کی مدحت نہایت عمدہ طریقہ پر کی گئی ہے

نظم کے کلام میں عام طور پر روانی اور سلاست الفاظ کی وجہ سے ترنم پیدا ہو جاتا ہے جو ہر کلام کے لئے باعثِ دلکشی ہو سکتا ہے جب کہ اس میں دوسری خوبیاں بھی موجود ہوں اس معرکہ میں وہ نظم جو شاہزادہ البرٹ کے درد دیر لکھی گئی ہے غالباً سب پر فوقیت رکھتی ہے علاوہ اور خوبیوں کے مولانا اپنے کلام میں محاورات کے صرف سے ایک خاص دلکشی پیدا کر دیتے ہیں تشبیہات میں ندرت و شگفتگی کافی ہے بڑا کمال یہ ہے کہ ایک

بات کو سیکڑوں تشبیہوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور بے لطفی نہیں پیدا ہونے پاتی بلکہ رعب بڑھتی جاتی ہے "طلوع آفتاب" پر جو نظم لکھی وہ خاص طور سے اس بیان کی تائید کرتی ہے

نظم نے اردو ادب میں نظموں کے ترجمہ کرنے والوں کی خاص رہنمائی کی نظموں کا ترجمہ کر کے یہ بتا دیا کہ اردو میں کس طرح ترجمہ کرنا چاہیئے محض خیالات کو لے کر اسالیب بیان محاورات اور ترکیبیں اردو کی اس خوبی سے صرف کی ہیں کہ نظموں کا لطف دوبالا ہو گیا اور وہ اردو کی دنیا میں اجنبی نہیں معلوم ہوتیں بلکہ اسی کی چیز ہو گئیں

نظم نے قصیدوں کو ایک نئی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا ان میں تاریخی عنصر کا اضافہ کیا ان کے قصیدوں سے علم و فضل کا بھی اندازہ ہوتا ہے وہ اسلامی جنگیں جو مسلمانوں میں ایک خاص اہمیت رکھتی تھیں ان کے قصیدوں میں جگہ پاتی ہیں معرکہ آرائیوں کا ذکر اس وضاحت کے ساتھ ہوتا ہے کہ صرف جنگ کا نقشہ پیش نظر ہوتا ہے۔ بلکہ واقعات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے اور لوگوں کی سیرت کا بھی پورا اندازہ ہوتا ہے

نظم کی عربی فارسی دانی اساتذہ اردو شاعری میں بھی دکھائی جاتی ہے کبھی پورا شعر کبھی ایک مصرعہ فارسی یا عربی کا آ جاتا ہے کہیں کہیں عربی و فارسی کے ادق و ثقیل الفاظ بھی اردو کے اشعار میں مل جاتے ہیں جو خوش گوار نہیں معلوم ہوتے

تصوف ہمیشہ تلخ ہوتی ہے مگر جہاں کہیں نظم نے ناصحانہ انداز سے قلم اٹھایا ہے وہاں وہ انداز بیان اختیار کیا ہے کہ نہ صرف تلخی دور ہو جاتی ہے بلکہ اثر اور دلکشی بھی پیدا ہو جاتی ہے

اُن کی جدت پسند طبیعت نے اردو میں "ملمع در سی" بھی کہا

نظم کے مرنے کے کچھ ہی دنوں بعد دیوان شائع ہوا اس دیوان میں زیادہ تر غزلیں ہیں تھوڑی سی رباعیاں اور کچھ تاریخیں ہیں مصنف نے جو اس مجموعہ پر خود تبصرہ کیا ہے اس کا یہاں لکھ دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا لکھتے ہیں "یہ سب غزلیں شاعروں کی ہیں ۔۔۔

گلدستوں کی طرحوں میں یا بعض بعض احباب کی فرمائشی زمینوں میں ہیں خود سے کبھی غزل نہیں کہتا ردیفیں پوری نہیں ہیں اور 'الف' 'بے' کا پورا کرنا میں ہمیشہ سے فضول سمجھتا ہوں، غزل میں مقطع کا نہ ہونا میرے رنگ کا یکساں ہے دیوان رسوا سے مرتب ہو چکا تھا مگر چھپنے کا وقت اب آیا میری اُردو بھی فارسی سے کم نہیں ہے میں نے فارسی کی طرحوں میں جو غزلیں کہی تھیں وہ بھی اس مجموعہ میں شامل کر دیں ان غزلوں میں جابجا معشوقانہ اداؤں کی تصویریں کھینچی ہوئی ہیں"

متانت وسنجیدگی کے ساتھ اشعار نظم کرنا ان کا خاص حصہ ہے ان کا شمار عہدِ قدیم میں اگر کیا جائے تو بے جا نہیں مگر ان کی شاعری بالکل موجودہ زمانہ کی شاعری ہے مبالغہ سے بہت کم کام لیا ہے ابتذال کا کہیں نام بھی نہیں، محاورات و روزمرہ کا صرف نہایت دلکش ہے اشعار کو دیکھ کر اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ سامنے کے مضمون کہے گئے ہیں

غزلوں میں عشق و جذبات کی کمی نمایاں ہے دورِ متوسط کے شعرا کی طرح اکثر غزلیں قافیہ پیمائی کے دور میں شعر کہنے کا نمونہ ہیں سپردگی کی کمی نے غزلوں میں تاثر اُبھرنے نہیں دیا اشعار کی تعداد بھی غزلوں میں ضرورت سے زیادہ ہے جس کی وجہ سے ملالت بھی پیدا ہو جاتی ہے دنیا کی بے ثباتی اور قنوطیت ان کی غزلوں کی خاص خصوصیت ہے

نظم کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو ہوا۔

(۱۱)

دورِ حاضر

عزیزؔ

مرزا ہادی عزیزؔ کے بزرگوار ایران سے پہلے کشمیر آئے تھے شاہانِ اودھ کے دورِ حکومت میں کشمیر سے لکھنؤ آئے عزیزؔ کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی علم و فضیلت اس خاندان میں موروثی تھی کئی پشتوں سے علمی خدمت انجام دی جا رہی تھی عزیزؔ نے اپنے خاندان کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے تحصیلِ علم میں بلیغ کوشش کی نتیجہ یہ تھا کہ اپنے عہد کے ممتاز صاحبِ علم سمجھے جاتے تھے۔

عزیزؔ کی ولادت ۱۸۸۲ء میں ہوئی سات برس کا سن تھا کہ سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا لیکن فطری شوق نے تحصیلِ علم سے منہ نہ موڑنے دیا اور کتب بینی کا مشغلہ آخر تک ذوق و شوق کے ساتھ جاری رہا اساتذہ کے فیضان اور مطالعۂ کتب نے ان کی شاعری میں اُستادانہ رنگ پیدا کر دیا فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے فارسی میں حافظؔ عرفیؔ نظیریؔ کا رنگ مرغوب تھا اُردو میں عام طور پر میرؔ اور غالبؔ کی تقلید کرتے تھے عزیزؔ کا شمار اُردو کے اُن چند شعرا میں ہے جنھوں نے دورِ جدید میں غزل کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی

عزیز کے اشعار میں الفاظ اس خوبی سے نظم ہوتے ہیں کہ خود بخود ایک ترنم پیدا ہوجاتا ہے جس سے کلام کی دلکشی اور بڑھ جاتی ہے طرزِ ادا کی جدت اور خیال آفرینی کا ہر قدم پر خیال رہتا ہے۔ اُن کے دل میں اتنا سوز و گداز ہے کہ عام طور سے غزلیں واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کی سرمایہ دار ہوگئی ہیں زبان کے اعتبار سے کلام نہایت صاف اور سلیس ہے ایک اور خاص بات آپ کے کلام میں یہ نظر آتی ہے کہ تصنع سے پاک ہے آپ کے کلام پر عام طور سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ غزل میں اس قدر بار بار رونا اور ماتم کا عنصر نامناسب ہے کیونکہ طبیعت پراگندہ ہو جاتی ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عزیز کبھی کبھی مضمون میں اتنے ڈوب جاتے ہیں کہ الفاظ ان کے خیالات کا پورا مفہوم نہیں ادا کرتے جس کی وجہ سے کلام میں نقص پیدا ہوجاتا ہے اور اشعار بے حد مبہم ہوجاتے ہیں لیکن اس کی مثال شاذ و نادر ہی ہوگی اُردو میں عزیز نے اکثر اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے قصیدہ میں ایک خاص امتیازی حیثیت پیدا کرلی ہے جو ہر طرح قابل داد ہے شکوہ الفاظ، تسلسل معنویت، علو تخیل، ان کے ہر قصیدہ میں آپ کو خاص طور پر دکھائی دیں گے، نظمیں بھی خوب کہتے تھے جن میں سے بعض ایسی ہیں جو ہر مشاعرہ کے لئے باعث افتخار ہو سکتی ہیں

گل کدہ (آپ کی غزلوں کا مجموعہ) اور قصائد عزیز آپ کی یادگار ہیں آپ کی وفات ۱۹۳۵ء میں ہوئی

رواں

چودھری جگت موہن لال رواں ۱۴ جنوری ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۹ سال کے تھے کہ اُن کے والد چودھری گنگا پرشاد کا انتقال ہوا۔ اُن کی وفات کے بعد رواں

کے بڑے بھائی بالو کنھیا لال نے پرورش کی رواں بہت ذہین تھے جب سے پڑھنا شروع کیا امتحانوں میں برابر امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوتے رہے ۱۹۱۳ء میں ایم اے پاس کیا اور ۱۹۱۶ء میں ایل ایل بی کرکے اناؤ میں وکالت شروع کی جلد ہی وہاں کے نامی نامی وکیلوں میں شمار ہونے لگے شاعری کا لگا بچپن ہی سے ساتھ رہا اور مرتے دم تک قائم رہا اُن کا انتقال اکتوبر ۱۹۲۴ء میں ہوا

رواں اپنے کلام پر عزیز لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے جس کا اثر اُن کی غزلوں پر خاص طور سے نمایاں ہے رواں کے دیوان "روح رواں" میں غزل قطعہ رباعی کے علاوہ نظمیں بھی ہیں غزلوں میں رواں نے زبان کا خاص طور سے خیال رکھا ہے عامیانہ الفاظ و لہجہ سے اُن کو یک قلم گریز ہے جس کی وجہ سے کلام میں تازگی اور بیان میں ندرت پیدا ہو گئی ہے اُن کے تمام کلام میں اور خاص کر غزلوں میں پختگی نہایت نمایاں طور پر نظر آتی ہے جو دلکشی اور تاثیر میں کافی اضافہ کر رہی ہے ان کا رجحان بالعموم فلسفہ اور معنویت کی طرف ہے لیکن لطف یہ ہے کہ کلام میں خشکی نہیں آنے پائی اور چونکہ اثر لے کر کہتے ہیں اس لئے کلام میں درد و کیفیت کی وجہ سے ایک خاص مزہ پیدا ہو جاتا ہے

رواں کے کلام میں ایک زور اور سخنہ کی ہر جگہ نمایاں ہے رواں اپنی نظموں میں غزل کی چاشنی دے کر نہایت خوبی سے تاثیر کا اضافہ کر لیتے ہیں ان کی بعض نظمیں کردار کی بلندی کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں صاف گوئی و صحیح کردار نگاری اُن کی نظموں کی دو نمایاں خصوصیات ہیں واردات حسن و عشق کو جہاں کہیں بیان کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ خود اُن ہی کے دل پر کیفیتیں گزر رہی ہیں مناظر فطرت کے بیان میں خاص امور کو نہایت پُر اثر اسرار و الفاظ میں نظم کرتے ہیں جیر مادی چیزوں پر طبع آزمائی کرتے وقت فلسفہ مضامین لانے کی کوشش کرتے ہیں نظموں میں عام طور سے روانی و فارسی ترکیبیں ہیں لیکن کہیں کہیں ناہمواری بھی پیدا ہو گئی ہے۔

روانی سے رباعیات بہت کافی کہیں جن میں زندگی کے مختلف عنوانات پر دلچسپ طریقے سے طبع آزمائی کی ہے ادق مضامین کو بھی نہایت سہل کرکے ادا کرنے کی کوشش کی ہے اس میدان میں بھی انھوں نے لطیف استعارے اور پسندیدہ تشبیہوں سے اپنے کلام کو دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے

چکبست

ان کے بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے مگر یہ فیض آباد میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت لکھنؤ میں حاصل کی اور ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کرکے وکالت کے میدان میں قدم رکھا۔ اس پیشہ میں ایسی کامیابی حاصل کی کہ لکھنؤ کے ممتاز وکلاء میں شمار ہونے لگے

۱۹۲۶ء کی بارہ فروری کو ایک مقدمے کی پیروی کے لئے رائے بریلی گئے سہ پہر تک بحث کی اور پھر واپس لکھنؤ آنے کے لئے اسٹیشن آئے ریل میں بیٹھے تھے کہ فالج گر ا ان پر ہوگیا اور کچھ گھنٹوں کے بعد اسٹیشن ہی پر انتقال ہوگیا۔ ۱۱ بجے رات کو آپ کی لاش موٹر پر رکھ کر لوگ لکھنؤ لائے کاظم حسین محشر لکھنوی نے چکبست ہی کے ایک مصرعے سے تاریخ وفات کہی

اُن کے ہی مصرعے سے تاریخ ہے ہمراہ عزا
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

چکبست بچپن ہی سے شاعری کے دلدادہ تھے اساتذہ اُردو کے کلام کا بغور مطالعہ ان کی روحانی غذا تھی جس سے اُن کے خیالات پر صیقل کر دی تھی آتش، غالب، اور انیس نے ایسی لاتعداد خوبیاں ہے اُنھیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا جس کا اثر آج بھی اُن

کے کلام پر صاف نظر آ رہا ہے۔ مسدس میں انیس کا اور غزل میں آتش کا انداز بیاں ہر جگہ
نمایاں ہے۔

چکبست کے یہاں فلسفیانہ خیالات بہت کم ہیں لیکن جو کچھ ہیں بہت خوب ہیں
ایسے موضوعوں پر وہ غالب کی تقلید کرتے ہیں لیکن ظلم ہوگا اگر اُن کی ذاتی ذہانت و شعوری
کی داد نہ دی جائے اور محض تقلید ہی تک اُن کی فکر رسا کو محدود کر دیا جائے۔ غالب
انیس اور آتش کے انداز بیاں سے چکبست نے وہ کارِ نمایاں کیا جو اُن کے لئے ایک
انفرادی خصوصیت ہو گئی کیونکہ اُن ہی بزرگوں کے ٹکسالی کلام کے رنگ و بو سے انھوں
نے سیاسی قومی تحریکوں اور اصلاحوں اور سانحوں کو منتق د شاندار نظموں سے ایک نئی
کیفیت عطا کر دی

چکبست کے یہاں حسن و عشق کے افسانے بہت کم ہیں اُن کی شاعری کا خاص
مقصد وطن کو بیدار کرنا ہے چنانچہ غزلوں میں بھی اس بات کو مدِنظر رکھے ہیں۔ ان کو
مغرب کی کورانہ تقلید سے گریز ہے مشرقی تہذیب و تمدن کا سررشتہ چھوڑے بغیر وہ ترنم
کے ساتھ میدانِ ترقی میں قدم رکھنا چاہتے ہیں جہاں کہیں وہ ناصحانہ انداز اختیار کرتے
ہیں کلام میں بجائے بے اثری کے ایک وارفتگی اور سرمستی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔
چکبست کی شاعری کا ایک دوسرا دلفریب پہلو اُن مناظر میں نظر آتا ہے۔ جہاں وہ
ہندوستان ہی کے واقعات اور فطری مناظر سے استعارات و تشبیہات پیدا کرتے
ہیں چونکہ ان چیزوں سے ہماری طبیعتیں آشنا ہیں لہٰذا کلام میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے

چکبست نے اپنے احباب اور جانے والوں کے اکثر مرثیے کہے ہیں جن میں اپنے جذبات
کا نہایت درد مندانہ پیرائے میں اظہار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سردارانِ قوم کا جہاں کہیں بیان
ہے اس میں اُن کی سچی سیرت اور انفرادی حیثیت کو نہایت خوبیوں سے نمایاں کیا ہے
ایک اور خوبی اُن کے کلام میں نہایت آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے جو کسی اور شاعر

کے یہاں مشکل سے ملے گی، موجودہ زمانہ کے سیاسی اور قومی واقعات کو نہایت کامیابی اور شاعرانہ تاثیر کے ساتھ بیان کرنا چکبست کا خاص حصہ ہے جس میں وہ رسمی لفظ پروری نہیں کرتے بلکہ اپنی آزادئ رائے کا ہر جگہ خیال رکھتے ہیں افسوس ہے کہ جس پیمانے پر یہ خوبیاں چکبست کے یہاں پائی جاتی ہیں اُتنی گہرائی اُن کے کلام میں نظر نہیں آتی لیکن باایں ہمہ مجموعی حیثیت سے زمانے نے اُن کی کافی قدر دانی کی اور آج اُن کی جگہ اُردو شعراء کے بزم اول میں نظر آتی ہے ہمارا ادب چکبست کے اس کارنامہ کو نہیں بھلا سکتا کہ اُنھوں نے اسے دور کے سیاسی حالات و خیالات کو اُردو شاعری میں بڑی خوبی کے ساتھ جگہ دی انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے جب سیاسی رہنما جدوجہد کر رہے تھے تو چکبست نے آگے بڑھ کر اپنی شاعری سے اس کو ہر دل عزیز بنادیا

اقبال

آپ کی ولادت ۱۸۷۳ء میں بمقام سیالکوٹ ہوئی ابتداء میں عام بچوں کی طرح ایک مکتب میں پڑھنا شروع کیا پھر مدرسہ میں داخل ہوئے رفتہ رفتہ انگریزی اسکول کی باری آئی تو انٹرنس کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کر لیا اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا بی اے کی تعلیم کے لئے لاہور آنا پڑا ڈگری حاصل کرنے کے بعد چند دنوں کے لئے اورینٹل کالج لاہور اور بعد میں گورنمنٹ کالج کے پروفیسر ہو گئے ۱۹۰۵ء میں تکمیل علم کے لئے انگلستان گئے اقبال کو فلسفہ سے خاص شغف تھا ولایت جاکر اس شوق میں اور ترقی ہوئی یہاں تک کہ فلسفہ کے ڈاکٹر ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ بیرسٹری کا امتحان پاس کرکے ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آئے

اقبال کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا ابتدائی زمانہ تعلیم ہی سے طبع آزمائی

کرتے تھے۔ اس زمانہ میں داغ کی شاعری کا تمام ہندوستان میں چرچا تھا۔ اقبال نے بھی
بذریعہ خط وکتابت ان سے اصلاح لینی شروع کی جس کا اثر اقبال کی زبان پر خاطر خواہ پڑا
روانی و سلاست کا وصف غالباً داغ ہی کی اصلاح کا نتیجہ ہے۔ اقبال کی جدت پسند
طبیعت کے لئے مشکل تھا کہ داغ کے محدود دائرے میں مقید رہتی۔ ان کی فکر کو بلندی
پرواز کی ضرورت تھی جس کا سامان بجز غالب کے کسی کے یہاں ملنا دشوار تھا چنانچہ انہوں
نے غالب کی تقلید میں لکھنا شروع کیا۔

طالب علمی ہی سے وہ شہرت بہم پہنچا چکے کہ علمی طبقے میں اقبال کا اچھے الفاظ میں
ذکر کرنے لگا۔ اسلام کی قومی شاعری کی ابتدا انجمن "حمایت اسلام" سے ہوئی ہے جہاں
دوستوں کے اصرار سے اُن کو مختلف نظموں کے پڑھنے کا موقع ملا۔ "نالۂ یتیم"، "فریادِ امت"
"شکوہ" وغیرہ انجمن کی یادگار ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی نظموں سے لوگوں کے دل میں
بڑی جگہ پیدا کر دی۔ ہم نے اقبال کو اور اقبال نے ہم کو پہچانا۔ ملت اسلامیہ کی گرتی ہوئی
حالت سنبھالنے کے لئے لوگوں کی نظر انتخاب اس پر [illegible] بڑی حد تک [illegible]
نے اپنی شاعری کو اسی مقصد کے لیے وقف کیا کہ مسلمانوں کی معاشرتی اور [illegible] بیماریوں کے
بیٹھنے کا [illegible] میں [illegible] اور [illegible]
جس کو وہ مسلمانوں کے ہر رگ و پے میں پہنچانا چاہتے تھے [illegible]
ہو کر [illegible] والوں کو وہ [illegible] کے [illegible]
میں دوسری خاص بات یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو یورپ [illegible]
مادہ پرستی کے بجائے خدا پرستی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں

[illegible] بات کے ساتھ [illegible]
کہ دور حاضر میں کسی شاعر کو یہ فخر حاصل نہیں [illegible]
[illegible]

پہلک تمام ہی دو ر رہی بلکہ گورنمنٹ نے بھی علم دوست ہونے کا ثبوت دیا اور اقبال کو معزز خطاب "سر" سے سرفراز کیا

ایک عرصے سے ڈاکٹر اقبال کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی اپریل ۱۹۳۸ء میں ایک طویل علالت کے بعد اردو کے اس نامور شاعر کی زبان ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی ان کی موت سے ملک کو بڑی جسمانی سے نقصان پہنچا لیکن انھوں نے اپنا گہرا نقش چھوڑا ہے کہ موجودہ نسل کے بہت سے شاعر اور ادیب انہیں کے یہاں سے اپنی شمع روشن کرتے ہیں

اقبال اردو کے ان شعرا میں ہیں جو مغربی خیالات سے متاثر ہو کر اردو میں کامیابی کے ساتھ نئے مضمون کو جگہ دیتے ہیں ۔ فلسفیانہ تخیل سے مضمون کو بہا بہت بلند و شاندار بنا دیتے ہیں اپنے مضمون سے مناظر قدرت مثلاً چاند تارے وغیرہ کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں کہ گویا وہ بھی انسان ہیں اس روش نے اردو شاعری کو ایک نیا میدان دے دیا ہے

اقبال نے اردو شاعری میں نہ صرف خیالات کا اضافہ کیا بلکہ نئی اور عمدہ تشبیہوں سے بھی انہوں نے اردو کو مالا مال کرنے کی کوشش کی ہے فارسی کی ترکیبوں سے کلام میں زور پیدا کرتے ہیں کبھی کبھی الفاظ ثقیل ہو جاتے ہیں مگر ان میں حسن بیان کی بڑی خوبی ہوتی ہے اور بہت زیادہ پُر لطف ہو جاتی ہے مناظر کا جو ان کا قلم کھینچتا ہے مصور کے قلم سے کم نہیں ہے جو منظر لکھے ہیں بہت دلکش اور موثر ہیں اقبال کے اشعار میں الفاظ کی ترتیب ایسی ہوتی ہے کہ ایک ترنم پیدا ہو جاتا ہے ان کا انداز بیان فلسفیانہ ہے یہاں تک کہ قدرتی چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان سے رموز حیات اور خودی کی کوئی خاص بات بیان کر جاتے ہیں

اقبال کے کلام کے اثر نے شاعری میں بڑی بیداری پیدا کی ۔ ان کے مجموعے "بانگ درا" اور "بال جبریل" وغیرہ اپنے انداز بیان کے لحاظ

سے بڑا فرق ہے بلکہ تخیل اور تصور کے لحاظ سے بھی بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز میں نظموں
کا اختصار، تمہید کی کمی اور خیال کی گہرائی ہمیں بغیر متوجہ کئے نہیں رہ سکتی وہ اقبال جنھوں
نے ہمیں بانگ درا میں رنگینیوں میں غرق کر دیا تھا آہستہ آہستہ تلوار کی تیزی نشتر میں
بھرنے لگے اس اختصار نے ان کے فکر کی دنیا بھی کسی قدر محدود کر دی، ادھر اُن کے
انتقال کے بعد سے اُن پر نہ جانے کتنی کتابیں نکلی ہیں، نہ جانے کتنے رسالوں نے
اقبال نمبر شائع کئے ہیں لیکن اُن کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں
نے پوری طرح تنقید نگاری کے فرائض انجام نہیں دیئے ہیں بلکہ اقبال کی عظمت کا احساس
اپنے اوپر طاری کر لینے کے بعد انھیں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں کہیں ایک دو مضمون
ایسے بھی دیکھنے میں آئے جو دوسری جانب انتہا پر ہیں اُن کے متعلق متوازن رائے
غالباً اب قائم کی جائے گی

حسرت موہانی

نام سید فضل الحسن ہے اور حسرت تخلص لیکن تخلص اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ بہت کم
لوگ نام سے واقف ہیں چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے ہیں کہ

حسرت کہا تھا کس نے حسرت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

سید فضل الحسن قصبہ موہان کے رہنے والے تھے وہیں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے
ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی لیکن علم و ادب کی آخری منزل طے کرنے کو علی گڑھ میں آیا کئے
اور وہیں سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اُن کی ذہنی تربیت کی ذمہ داری
ادب پر رہی کچھ عرصہ تک ان کا رجحان سیاسی علمی و ادبی خدمات کی طرف رہا۔

مگر جب سے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگے ہیں اُس وقت سے پوری توجہ کے ساتھ یکسو
ہو کر علمی خدمات نہیں کر سکے مگر پھر بھی غزل گوئی میں آپ کا مرتبہ نہایت بلند و امتیازی
ہے اور اس میں شک نہیں کہ اُردو کی موجودہ غزل کو نکھارنے اور سدھارنے میں حسرت
نے بڑا کام کیا ہے بے کیفی کو دور کر کے تغزل کو تیز کرنا ان کا خاص کارنامہ ہے۔

حسرت، لکھنؤ کے مشہور شاعر تسلیم کے شاگرد تھے جن کو نسیم دہلوی سے تلمذ تھا
اور وہ مومن کے خاص شاگرد تھے حسرت کو قدیم اُستادوں کے کلام سے فطری شغف
تھا چنانچہ شاعری تغزل کا اثر ان کی طبیعت میں کئی لحاظ سے نمایاں ہے سادگی
دیباچہ تمیع ویرانہ انگلی ململ وغیرہ اُن کے خاص موضوع کلام ہیں کبھی کبھی پُرانے
بزرگوں کی تقلید میں مسلسل غزلیں بھی کہتے تھے قریب قریب ہر ردیف پر الف سے لے
کر ی تک طبع آزمائی کی ہے خواہ ایک ردیف میں ایک ہی غزل کیوں نہ ہو اسی طرح بعض
بعض پرانے الفاظ بھی روا رکھے ہیں جو اب متروک ہیں مثلاً "دیکھید" "آن پہنچے" "ماسے"
لیکن اس کے ساتھ ساتھ کلام الجھاؤ اور پیچیدگیوں سے پاک ہے صفائی شیرینی خاص
طور پر اُن کے یہاں قریب قریب ہر جگہ موجود ہیں

ابتذال اور رکیک پن کو حسرت نے اپنے کلام میں بہت کم آنے دیا اشعار میں
درد و اثر کے ساتھ پاکیزگی خیال کا زیادہ لحاظ رکھا ہے ان کا کلام نہ تو سراپا
یاس و نامرادی کا مرقع ہے اور نہ عیش و نشاط کی محفل اگر آپ کو اُن کے اشعار میں
دکھ درد وغیرہ ملے گا تو مسرت و شگفتگی بھی جا بجا نظر پڑے گی جس کی وجہ سے طبیعت۔
اُستادی مشق و مہارت کے لحاظ سے حسرت زاہد خشک نہیں اُن کے کلام میں رنگینی بھی
ہے لیکن کہیں کہیں شوخی و ناسک حد سے باہر ہو گئی ہے

حسرت کو رنگ کے انتخاب کا خاص ملکہ حاصل ہے، وہ مستانہ کے کلام میں
رس اور رنگ بہت پیدا ہو جاتا ہے، بول چال کا بھی کافی لحاظ رہتا ہے الغرض

حسرت

انتخاب میں بھی وہ بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں عام طور سے ملائم اور عام فہم لفظوں کو
اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی فارسی کی ایسی ترکیبیں بھی لاتے
ہیں جو بعض لوگوں کے نزدیک پسندیدہ نہیں غالباً یہ غالب کی تقلید کا اثر ہو دل شدگاں
خود فراموش، وجہ نومیدی بسیار فریاد رس عشق با ہزاراں آرزو وغیرہ جا بجا اُن کے
اشعار میں ہیں جہاں کہیں کلام میں برجستگی ہے وہ بہت ہی لطف و دلکش ہے مومن کی
طرح اکثر اشعار میں تھوڑی سی ایسی پیچیدگی پسند کرتے ہیں جو طبیعت میں اُلجھاؤ نہ پیدا
ہونے دے بلکہ معنویت و لطف زیادہ کر دے

حسرت نے غزل کو محض حسن و عشق کی واردات تک محدود نہیں رکھا بلکہ جو کچھ اور
جس عنوان کا خیال اُن کے دل پر اثر کر جاتا ہے اس کو وہ غزل میں جگہ دیتے ہیں چنانچہ
آپ اُن کے یہاں دوستوں کا شکوہ احباب کا ماتم، سیاسی و مذہبی عقائد وغیرہ سب
ہی کچھ پائیں گے ان سب میں جہاں کہیں ملکی معاملات کا تذکرہ علانیہ آگیا ہے وہاں
زور تو ضرور ہے مگر شعریت کی کمی ماہر کو ابھرنے نہیں دیتی لیکن اس قسم کے اشعار بہت
کم ہیں حسرت اُن چند مخصوص شعرا میں ہیں جو غزلوں میں تغزل کا بہت خیال رکھتے ہیں
یہ خصوصیت اُن کے کلام کا امتیازی پہلو ہے

حسرت تمام عمر سیاست سے دلچسپی لیتے رہے مگر تعجب ہے کہ اُنہوں نے کبھی کوئی مستقل
سیاسی خیالات کا اظہار نہیں کیا اس کی وجہ یا تو تغزل سے بے پناہ اُنس ہو سکتا ہے یا پھر یہ
کہ سیاست کو اُنہوں نے غزل کا اہل نہیں سمجھا کہ مستقل عنوان بنا کر کچھ کہتے۔

حسرت کا انتقال ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو ہوا۔

فانی بدایونی

شوکت علی خاں نام ہے۔ فانی تخلص۔ ولادت ۱۳ دسمبر ۱۸۷۹ء کو ہوئی۔ آبا و اجداد
کابل کے رہنے والے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانے میں آپ کے جد امجد نواب
بشارت خاں نے ہندوستان آ کر سکونت اختیار کی۔ موجودہ صوبہ بدایوں کے گورنر تھے۔
اُن کی جائداد ایک سو چورانوے مواضعات معافی پر مشتمل تھی ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کچھ
بھی باقی نہ رہا۔ فانی کے والد مرحوم محمد شجاعت علی خاں نے اپنی قوت اور قابلیت کے بل
پر عزت و آبرو کی زندگی بسر کی۔ آپ محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے۔ مگر ملازمت کو غلامی
تصور کرتے تھے۔ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا کوئی آزاد پیشہ اختیار کرے۔ چنانچہ اُنھوں نے
فانی کو وکالت کے امتحان کے لیے مجبور کیا۔

فانی نے انٹرنس تک بدایوں میں تعلیم حاصل کی۔ بریلی کالج سے بی۔ اے۔ کا
امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد میور سنٹرل کالج الہ آباد اور محمڈن کالج علی گڑھ میں ایل۔
ایل۔ بی کی تکمیل کی لیکن وکالت کے پیشے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ صرف باپ کے مجبور
کرنے پر آپ نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ طبیعت اوائل عمر ہی سے شعر و سخن
کی طرف مائل تھی۔ پہلی غزل ۱۸۹۰ء میں کہی تھی۔ ان کے والد ہمیشہ شعر کہنے سے روکا
کرتے تھے۔ چنانچہ جو کچھ فانی کہا کرتے تھے وہ بہاریہ پوشیدہ طور پر (۳)۔ سے ظاہر
ہے کہ فانی کو کسی صاحبِ فن سے مستفید ہونے یا اصلاح لینے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا۔
ایک مرتبہ بذریعہ خط و کتابت داغ سے اصلاح لینی چاہی مگر یہ راز بھی افشاء ہو گیا اور
پھر کبھی والد کے خوف سے کوئی غزل اصلاح کے لیے بھیجنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اصلاح
شعر کا کام آپ کو خود اپنے مذاقِ شعری سے لینا پڑا۔ آپ کی فطرت کی ودیعت تھا

۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۸ء تک تمام کلام ضائع ہو گیا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں ایک حادثہ جانکاہ سے متاثر ہو کر اصولی سے اپنا تخلص فانی رکھا۔ اسی سلسلے میں [illegible] تین قسم کی [illegible] جن پر [illegible] ایک [illegible] اور دو [illegible] بیاض اور [illegible] ان کے [illegible] [illegible] ڈرامے [illegible] کئے گئے [illegible] مگر عدم توجہی سے وقت کو [illegible] ہزار اجو کچھ باقی رہ گیا [illegible] "فانی" کے [illegible]

اسی ضمن میں [illegible] ذکر [illegible] ۱۹۰۹ء [illegible] ہو گئے تھے [illegible] ۱۹۱۱ء [illegible] گیارہ سال [illegible] [illegible] اکتفا کرنی پڑی۔[1]

[illegible] فانی کا [illegible] [illegible] کر کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مگر بہر حال [illegible] [illegible] [illegible] طرح [illegible] "فانی" [illegible] کلام کا ایک مجموعہ "[illegible] فانی" کے نام سے شائع ہوا [illegible] [illegible] فانی میں [illegible] قطعات [illegible] [illegible] کام لیا گیا ہے۔

فانی کے کلام کی ایک خاص خصوصیت [illegible] ان کے دیوان کا کون صفحہ ایسا ہے کہ جس میں دو چار اشعار [illegible]

---

[1] اخبار سرگزشت حیات، فروری ۱۹۲۰ء

شعر کو اتنا سجاتے اور سنوارتے ہیں کہ تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے اور موجودہ دور کے بہت کم
غزل گو شعرا ان کے قریب دکھائی دیتے ہیں

ناصری

آپ کی جائے ولادت لکھنؤ ہے جہاں ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے چونکہ طبیعت میں
خداداد ذہانت اور غیر معمولی سمجھ تھی لہٰذا چودہ برس کے سن میں اردو، فارسی، عربی کی تعلیم سے
ایک بڑی حد تک فراغت حاصل کر لی لیکن تمام عمر مطالعۂ کتب سے استعداد علمی کو بڑھاتے
رہے انگریزی تعلیم کا بھی بچپن ہی سے شوق ہوا چنانچہ ۱۹۱۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے
انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۱۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے خانگی طور پر ایف اے
کا امتحان پاس کیا اسی برس منشی کامل کا امتحان بھی پاس کر لیا اس کے دوسرے سال فاضل کے
امتحان میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کر لی لیکن اس سے پہلے ہی یعنی ۱۹۱۴ء میں اسی قابلیت
کی وجہ سے سنٹرل کالج لکھنؤ میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہو چکے تھے اور وہیں سے پڑھتے
پڑھاتے ۱۹۱۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کر لیا اس کے ایک سال بعد میور سنٹرل
کالج الہ آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر عربی و فارسی مقرر ہوئے اور یہاں سے ایم اے کا امتحان
پاس کر لیا چھ برس تک الہ آباد میں رہ کر انھوں نے نہ صرف عربی و فارسی کی خدمت کی
بلکہ اردو کی ترقی میں بھی ہمہ تن کوشاں رہے

کالج اور اسکولوں میں مشاعروں کا رواج دے کر لوگوں میں مذاق سلیم پیدا کرنے
کی کوشش کی اردو شاعری کے عیوب و محاسن کو سمجھا کر ایک شائستہ اور صحیح راستہ طلبا کی
نظروں کے سامنے پیش کر دیا جس کا اثر اب تک باقی ہے ۱۹۲۲ء میں الہ آباد سے ان کا
تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول بجنور میں بحیثیت ہیڈ ماسٹر کے ہوا وہاں سے دو سال بعد

ضلع بارہ بنکی کے گورنمنٹ اسکول میں تشریف لے گئے ۱۹۲۹ء تک وہیں رہے بعد ازاں علی گڑھ تبادلہ ہوگیا اور وہیں ۱۹۳۱ء میں راہیٔ ملک بقا ہوئے

زندگی میں اپنے ذاتی اخلاق اور علمی قابلیت کی وجہ سے وہ اپنے ہر دل عزیز تھے کہ اس صوبہ کی مختلف علمی درسگاہوں میں بہ حیثیت ممبر کے منتخب ہوتے رہے ان کی قیمتی رائے سے الہ آباد، لکھنؤ، علی گڑھ وغیرہ کی یونیورسٹیاں فیض یاب ہوتی رہیں۔ انٹرمیڈیٹ بورڈ جب سے وجود میں آیا تھا ہمیشہ ان کی ذات سے مستفیض ہوتا رہا اور گورنمنٹ نے ہمیشہ ان کو اس بورڈ کا ممبر نامزد کیا

ناصری کی قابلیت صرف اسلامی علوم تک محدود نہ تھی بلکہ جرمن، عبرانی، فرانسیسی زبان سے بھی ایک بڑی حد تک واقفیت رکھتے تھے وہ نہ صرف عربی اور فارسی کے ادیب تھے بلکہ اردو کے بھی ایک زبردست انشاء پرداز شاعر اور محقق تھے۔

ناصری کی ایک خاص خدمت آسانی سے نہیں بھلائی جا سکتی وہ پرانے اسکول اور نئے اسکول کو ایک منزل پر جمع کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے ان کے کلام میں اگر پرانے دور کی خصوصیات یعنی زبان کی صفائی شعر کی مضبوطی اور آرٹ موجود ہیں تو موجودہ زمانے کی سائنسی بلندیٔ خیال اور حقیقت بھی پائی جاتی ہے

یہی نہیں کہ ناصری نے درس و تدریس کا سلسلہ اسی زندگی کا جزو لاینفک سمجھ لیا تھا بلکہ تصنیف و تالیف کا بھی مشغلہ برابر جاری رکھا چنانچہ متعدد کارنامے آپ کی یادگار ہیں منجملہ چند کتابیں حسب ذیل ہیں

۱۔ سحرِ ابداع۔
۲۔ مخزنُ الفوائد۔
۳۔ کرارب
۴۔ زینت وحش و طیر (جانوروں کے متعلق ہے)

۵ مدارج سوم (تاریخ زبان فارسی)

۶ مثنوی سرگزشت ۔

۷ دیوان حصہ اول (نذرِ احباب)

۸ دیوان حصہ دوم

۹ مجموعہ قصائد

اخلاق و عادات

جن لوگوں کو ناصری کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ کبھی کسی شخص کا اُن کے پاس سے مغموم ہوکر اٹھنا تو کیا معنی ملال خاطر ہو جانا بھی مشکل تھا آپ کے حلقۂ احباب میں ہر مذہب و ملت کے لوگ یکساں طور پر شریک ہوتے اور جو ان کے حلقہ میں آ جاتے اپنے شاگردوں کو اولاد سے کم نہ سمجھتے اور جہاں تک ہو سکتا ان کی ترقی کی صورت پیدا کیا کرتے

ناصری خود نام و نمود سے بہت متنفر رہا یہ جذبہ کبھی کبھی ضرورت سے بھی زیادہ بڑھ جاتا تھا یہاں تک کہ اپنا کلام بھی شائع کرنا عار سمجھا کئے لیکن جب فارسی کا دیوان چھپ گیا تو احباب کے شدید اصرار سے اُردو کا کلام جمع کرنے لگے مگر اُردو کا دیوان نہ شائع ہو سکا تھا جس کی صورت بقول پروفیسر سید ضامن علی صاحب یہ تھی کہ ان کا کچھ کلام کتابوں میں رکھی ہوئی بیاضوں میں کچھ رسالوں میں احباب کے پاس نکلیں اور کچھ حافظے سے ضائع ہو گئیں۔ ان سب کو اکٹھا کرنے کے بعد گم شدہ کلام کی جانب توجہ ہوئی ۱۷ اشعار یاد آئے ان کو قلمبند کر کے اس مجموعہ کو مرتب کیا[1] افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی اُن کا مجموعہ مسودہ کی صورت میں پوری طرح صاف بھی نہ ہو چکا تھا کہ داعیِ اجل کو لبیک کہا اُن کی وفات کے بعد نذرِ احباب کے نام سے دو حصوں میں کلیاتِ ناصری نہایت خوبی کے ساتھ انڈین پریس الہ آباد میں چھپا۔"

---

[1] تمہید دیوان ناصری

ناصری صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ اُن کو پیارے صاحب رشید سا کامل اُستاد نصیب ہوا اُس کی رہنمائی سے ناصری صاحب کے کلام میں صفائی اور سادگی خاص طور سے آئی
ناصری نے اپنے اسلوبِ بیان میں اصولِ بلاغت کا خاص طور سے خیال رکھا ہے اکثر اشعار میں کسی کا کوئی ایسا جزو بیان کرتے ہیں جس سے اثر و نتیجہ ظاہر پوری طرح بیان نہیں ہوتا مگر بعض طرح طرح کے نتائج خود نکال کر روح کو کیف سے سرشار کر دیتا ہے کبھی "خدا جانے" کبھی "الاماں" کبھی "الوداع" کبھی "معاذ اللہ" اور اس قسم کے ٹکڑوں سے اُن کے کلام میں معنویت کافی پیدا ہو جاتی ہے سمجھنے والے سمجھنے میں اس کا لطف اُٹھاتے ہیں

عشق کی شدت و انتہائی کیفیت کو پورے زور کے ساتھ معمولی الفاظ میں بیان کر دینا اُن کا ذاتی جوہر ہے وہ وارداتِ عشق، لوازمات اور عمدہ ترکیبوں سے بہتر کرید کرتے ہیں تلمیح، فارسی کی پُر اثر ترکیبیں اور دلکش الفاظ کے استعمال سے کبھی اُصول سے دریغ نہیں کیا چنانچہ ناصر نے ان صنائع لفظی و معنوی گل و گلزار، دل، جاں وغیرہ سے اپنے کلام کو آراستہ کیا ہے اسی وجہ سے اسرار اور درد ان کے کلام دل و جان ہیں نواب حسن علی خاں صاحب آثر ناسخ کا مقدمہ میں رقم طراز ہیں کہ "دردبھرے الفاظ میں ماجرائے عشق بیان کرنا ان کی شاعری کا نصب العین ہے اور بیشتر حصہ کلام تاثیر کا طلسم ہے"

وہ قدما کے اصول کی تقلید کرتے تھے مگر گوارا نہیں پیچ در پیچ استعارات اور تشبیہوں کو ترک کر کے پاکیزہ و دلفریب پھولوں کو چن لیتے تھے محاورات کے صرف میں اُن کو پورا عبور تھا جہاں کہیں استعمال کرتے ہیں ایک خاص خوبی سے دا خل کرتے ہیں اس کو چاہیے آپ قدما کی تقلید کہیے یا الفاظ کی دلکشی کہ معشوق کو "میری جان" اور "صنم" کہہ کر اسے یاد کیا کرتے تھے۔

ناصری کا کلام حسرت و حرمان کا آئینہ ہے مگر اس میں جھوٹ موٹ کی ہائے واے نہیں ہے بلکہ ایک ٹوٹے ہوئے دل کی فریاد ہے جو سننے والے کے تارِ رگِ جاں کو مضراب سے چھیڑ دیتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص جو فلسفۂ حزن کا ماہر ہے یاس کے راز دلگداز نغموں میں دہرا رہا ہے اور سننے والوں کے جسم درگ میں سنسناں بھر رہا ہے کہیں کہیں خوشی کی ترنگ بھی ہے مگر اس کا مستاعو صرف اس قدر ہے کہ الم کی اور اُجاگر ہو جائے جس طرح راگ کی دل آویزی سرگم سے بڑھ جاتی ہے۔

ناصری نے اپنی زندگی ہی میں تمام جوانی و ضعیفی کو موت کا پیام سمجھا تھا چنانچہ ان کی رباعیوں اور غزلوں میں اکثر آپ کو اس قسم کے اشعار ملیں گے کہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قبل از وقت موت کا انتظار کر رہے تھے ۴۶ برس کے سن میں فالج کے عنوان سے علی گڑھ میں موت کا پیام آہی گیا میں نے ایک مرثیہ اور اس کے ساتھ تاریخ وفات کہی

ناصری خلد بریں کو پہنچے
۱۳　　　　ھ　　　　۴۹

ضامن

آپ کی ولادت ۱۸۸۰ء میں قصبہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی میں ہوئی آپ نے علوم مشرقیہ کی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی آپ کا قیام عرصہ تک لکھنؤ میں رہا البتہ انگریزی تعلیم کے لیے دوسرے شہروں کو بھی جانا پڑا چنانچہ الف۔ اے آگرہ سے پاس کیا اور بی اے وایم۔ اے کی ڈگری الہ آباد سے حاصل کی

ضامن کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی رہی ۱۲ برس کے سن سے

شعر کہنا شروع کر دیا تھا میر علی عباد میساں الہ آباد میں رثے پایہ کے شاعر تھے۔ ضامن کے جوہر دیکھ کر خود بخود اصلاح کلام کی متوجہ ہوئے۔ اُستاد کی شفقت اور طبیعت کے خداداد جوہرنے کلام میں پختگی اور دلکشی پیدا کر دی۔ میساں کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ آپ کے کلام میں ایک خاص تبدیلی شروع ہو گئی جس کی طرف آپ خود ارشاد فرماتے ہیں ؎

حضرتِ میساں کے دم تک لطف تھا اُس رنگ کا

اب کہو ضامن غزل اس میں جو رنگ عام ہے

گویا اُس وقت سے آپ نے رنگِ ناسخ کو ترک کر کے صفائی کے کوچے میں قدم رکھا آپ کا کلام دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشہبِ طبع شاعری کے ہر میدان میں رواں ہے۔ غزل قصیدہ رباعی مخمس۔ سلام وغیرہ پر کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کرتے ہیں

الفاظ کے انتخاب، محاورات کے برمحل صرف فارسی تراکیب کی دلآویز آمیزش نے آپ کی شاعری میں ایک خاص مزہ پیدا کر دیا ہے تشبیہات اور استعارات کی رادنی سے غزل میں قدیم رنگ کی جھلک بھی آجاتی ہے

آپ کے قصائد میں تخیل کی پرواز اور معنویت کی فراوانی ایک خاص رفعت پیدا کر دیتی ہے آپ کا خیال ہے کہ سوداؔ اٹھارویں صدی کا ایک زبردست شاعر ہے، اور سادہ بھی سوداؔ کی محبت بھی جس سے قصائد میں آپ کو اس باکمال شاعر کو استاد ماننے پر مجبور کیا تشبیب میں اکثر جدت ہے

چونکہ آپ کے کلام کا زیادہ حصہ غیر مطبوعہ ہے جو آسانی سے ہر شخص کو فی الحال دستیاب نہ ہو سکے گا لہٰذا نہایت اختصار کے ساتھ چند غزلیں اور متفرق اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

دنیا میں پھر وہ کام کے قابل نہیں رہا

جس دل کو تم نے دیکھ لیا دل نہیں رہا

اس رشک گل نے بزم میں الٹی ہے جب نقاب
گلشن میں پھر ہجوم عنادل نہیں رہا

رستے نگاہ قیس نے اتنے بتا دیے
حاجب نظر کا پردۂ محمل نہیں رہا

کشتی اشک آ کے کنارے ہوئی تباہ
ساحل بھی اعتبار کے قابل نہیں رہا

ٹکرائی جب سے کشتی طوفاں زدہ کوئی
خاموش اس گھڑی لب ساحل نہیں رہا

حوروں پریوں کا ذکر ہی کیا ہے کہ عمر بھر
زر بسام غمزہ قائل نہیں رہا

جھکا ہے سر در پہ اک صنم کے زماں پہ لیکن وہاں نہیں ہے
بتا رہا ہوں اہل دل کی کہ حسن میں بانگ اذاں نہیں ہے

عجب ہے دیر و حرم کا جھگڑا وہ ہر جگہ ہے کہاں نہیں ہے
عیاں ہے جتنا وہ چھپنے والا ہے اس سے اتنا نہاں نہیں ہے

تری نگاہوں نے لے لیا دل مگر خلش درد کی ہے باقی
طلسم [illegible] ہے یہ محبت مکیں تو ہے پاں مکاں نہیں ہے

[illegible] ہوئے اک ہرا یاد لے کے بیٹھے چھپکے ہوئے دل مارے
[illegible] کہا ہے کوئے جاناں رہیں [illegible] آسماں نہیں ہے

ترسے ہیں [illegible] دل میں کوئی اسیر ہم نے ڈالا
عدم مجھے [illegible] ہے کہ حسن میں رہیں تو [illegible] آسماں نہیں ہے

ہر درد کھی ہے میری صورت ہوئی جو یہ امجد کی حالت
سب اس طرح سے ہیں جیسے کہ گویا سکتے میں حال ہیں ہے
کلی کلی مسکرا رہی ہے ترا سے بھری بھی گا رہا ہے
تمھیں کو کیا ہو گیا ہے عباس جو راہ دکھا رہا ہے

رخ کی زردی سے الفت سے عیاں ہوئی گئی
راز دل تھا چھپا ... آشنا ہی آشنا ہوا

کھل جائے حال آپ ہٹا دیں نقاب اگر
وہ اور ہوں گے عشق جنہیں آ ماچکے ہم نہیں
کرتی ذلیل و خوار ہے حاجت فقیر کو
دراز ... ہے دست گدا ہیں ...

مٹی سیاہ ساتھ لیے ساری زندگی
گرداں تلاش موت میں ہم کو ...

میں ... دل کو تمہاری یاد کرتا ہوا
... دولت تھی جس کو عشق ...

شعر (۱) دیدار رخ یار الٰہی ... آپ ہم عمر ...
عباس کا انتقال ۲۷ اپریل ۱۹۵۲ء کو الٰہ آباد میں ہوا

اثر

۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں ولادت ہوئی ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ سے بی اے
پاس کیا ۱۹۱۹ء میں عہدۂ ڈپٹی کلکٹری پر مامور ہوئے

اثر کے اکثر بزرگوار اپنی قابلیت اور کمال کی وجہ سے سربلند و ہر دلعزیز رہے شعر و سخن کا بھی چرچا عرصے سے گھر میں رہا آپ کے والد بزرگوار حکیم مرزا افضل حسین خان ثابت بھی اپنے وقت کے اچھے شاعر تھے۔

اثر نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی کہ بچپن ہی سے شعر و سخن کا مذاق پیدا ہو گیا تھا لیکن شعر کہنے کا بہت کم اتفاق ہوا جوانی میں شعر کہنا شروع کیا اور اب آپ کا مجموعۂ بہاراں ایک خاص وقعت کے ساتھ دلوں میں گھر کئے ہوئے ہے

اثر کے اشعار کو اگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کہنے والا دربار عشق کا بہت بڑا رمز شناس و نکتہ داں ہے جو اکثر معمولی الفاظ و اشارہ میں ایسی بہت کی باتیں بیان کر جاتا ہے کہ سمجھنے والے سمجھتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں آپ اکثر ہر بات کی تصویر الفاظ میں اس خوبی سے کھینچتے ہیں کہ اس کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے روزمرہ و صفائی زبان کا ہر قدم پر خیال رہتا ہے جس کی وجہ سے کلام میں دلکشی اور زیادہ ہو جاتی ہے ہمیشہ نرم و شیریں الفاظ صرف کرتے ہیں، غالباً یہ خوبی اس وجہ سے اور زیادہ ہو گئی ہے کہ آپ کو میر کے کلام سے نہایت درجہ شغف ہے اور اکثر اسی بزرگ کی تقلید کامیابی کے ساتھ کی ہے ہندی الفاظ بھی کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں مگر بہت مزے کے ساتھ، مدھری، آنکھ، لوک بالا روگ، وغیرہ اردو و عربی الفاظ کے ساتھ سونے میں سہاگا کا کام کرتے ہیں۔

۱۹۴۲ء میں اثر کے نظموں کا مجموعہ "رنگ بست" شائع ہوا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو جتنی غزل کہنے پر قدرت ہے اتنی ہی مہارت نظموں میں بھی ہے مناسب الفاظ کا تسلسل، جوش اور زور ان نظموں کی خصوصیت ہے موجودہ زمانے میں اثر کی وہ ذات ہے جو پرانے رنگ کی غزلوں کے ساتھ ہی ساتھ ایسی نظمیں لکھتے ہیں جن میں جدید و قدیم طرز سخن کی خصوصیات یکجا نظر آتی ہیں

زبان و بیان کے لحاظ سے اثر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ تقلید نے ان کو میر کے قریب پہونچا دیا ہے۔

اثر نثر میں بھی کچھ نہ کچھ لکھا کرتے ہیں جسے تنقید کہا جا سکتا ہے ان کی تنقید نگاری زبان و بیان کی دیکھ بھال سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس معرکہ میں بڑی کاوش و نکتہ رسی سے کام لیتے ہیں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "چھان بین" شائع ہو چکا ہے نثر میں دوسری کتاب میر انیس کی مرثیہ نگاری ہے۔

جلیل

نام جلیل حسن ہے مولوی حافظ عبدالکریم کے بیٹے ہیں ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی ۲ برس کی عمر میں امیر مینائی کے شاگرد ہوئے عرصہ دراز تک بلکہ امیر کے آخر زمانہ تک دفتر امیر اللغات کے سکریٹری رہے اپنے بزرگ اُستاد کے ہمراہ حیدرآباد دکن گئے اور ان کے انتقال کے بعد وہیں اقامت پذیر ہوگئے اب آپ امیر کے بہترین شاگرد خیال کیے جاتے ہیں آپ کی فارسی اُردو کی قابلیت مسلم الثبوت ہے عروض و قوافی میں عالم و عامل ہے سلطنت آصفیہ نے بجا قدر دانی کی ہے اور آپ کو فصاحت جنگ کا خطاب دیا ہے۔

جلیلؔ کا کلام دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہایت خوبی کے ساتھ آپ اپنے اُستاد (امیر مینائی) کے قدم بقدم چلتے ہیں انھیں کے رنگ میں شعر کہتے ہیں وہی شوخی، وہی سادگی جو امیرؔ کے کلام کا جوہر ہے یہاں بھی ایک عام فہم صورت میں کچھ اس طرح چمکی کہ جلیلؔ کی غزلیں ہر طرف ہندوستان میں پھیل گئیں اُن کے کلام کی اس مقبولیت نے اُردو اور صحیح اُردو کا ذوق عوام الناس میں پیدا کر دیا، اُردو زبان ہمیشہ اس کی رہین منت رہے گی۔
ان خوبیوں کے علاوہ جلیلؔ کی عام مقبولیت کے دو خاص وجوہ معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) غزلوں میں نشست الفاظ سے ایسا ترنم پیدا ہو جاتا ہے گویا یہ غزلیں موسیقی ہی کے لئے کہی گئی تھیں۔

(۲) حسن و عشق کے اظہار میں اس قدر سلاست اور روزمرہ ہے کہ خود بخود دل کھنچ جاتا ہے۔

اس طرح جلیلؔ نے شاعری کو عوام الناس کے لئے بہت کچھ دلچسپ بنا دیا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اُن کے یہاں شعر و شاعری کی وہ بلندیاں نہیں جو شاعری کو دوسرے فنون پر فوقیت دیتی ہیں اور شاعری کا رتبہ عوام سے بلند تر کر دیتی ہیں۔

اُن کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اُن کی شاعرانہ عظمتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اکثر اخلاقی اور عاشقانہ مضامین کو انھوں نے غزل میں اس طرح جگہ دی ہے کہ عوام و خواص دونوں یکساں لطف اُٹھاتے ہیں صوفیانہ رنگ بھی جا بجا اُن کے کلام میں موجود ہے لیکن یہ اُن کا خاص مذاق نہیں۔ جلیلؔ کا اصل رنگ جذبات عشق اور اظہار اُلفت میں زیادہ نمایاں ہے گویا تغزل میں اُن کو خاص ملکہ ہے جس کو انھوں نے اپنی سادگی اور دلکش اندازِ بیان سے سراہا۔ لطف زبان سے دل آویز بنایا اور محاورات کے زیور سے آراستہ کیا غرض جلیلؔ کا کلام سادہ اور رواں ہے مجموعہ کلام "تاجِ سخن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

جوشؔ

آپ لکھنؤ کے ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو عرصہ سے علمی خدمات انجام دیتا رہا ہے اور اس حیثیت سے سب سے پہلے نفقر محمد خان گویا کا نام آتا ہے جنھوں نے ابتدا میں تیغ آبدار کی بدولت نواب امیر الدولہ بہادر کی فوج میں رسالداری حاصل کی اور تیغِ زبان کے جوہر میدانِ ادب میں دکھا کر ایک دیوان اور ایک نثر کی مشہور کتاب بستان حکمت یادگار چھوڑی گویا کے فرزند ارجمند محمد خان احمؔ بھی صاحب دیوان تھے

شبیر حسن خاں جوشؔ گویا کے پر پوتے ہوئے ہیں آپ ۱۸۹۶ء میں ملیح آباد میں پیدا ہوئے خداداد ذہانت و سلیم الطبعی اور فطرت وردی نے راہ راست سے کبھی قدم ہٹنے نہ دیا علمی مذاق کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ قائم رہا شاعری کا چسکا بچپن ہی سے رہا

جوشؔ کچھ عرصہ تک دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں بھی ادبی نقاد کی خدمت انجام دے چکے ہیں یہ وہ اہم خدمت ہے جس پر کبھی طباطبائی بھی مامور تھے حیدر آباد میں آپ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۴ء تک رہے

جامعہ عثمانیہ سے الگ ہو کر آپ نے دہلی سے ایک رسالہ "کلیم" شائع کرنا شروع کیا جو باوجود اپنے ممتاز اوصاف کے بھی زیادہ نہ چل سکا۔

کلیم کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ شاعری کے جوشؔ میں نثر نگاری کی بھی بے نظیر صلاحیت موجود ہے دلیل کے ساتھ تنقید اور اثر کے ساتھ زور ہر جگہ نمایاں ہے صرف جذبات تک جوشؔ کی دنیا محدود نہیں بلکہ اپنی صحافت نگاری سے اُنھوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ اُن کو سیاسیات اقتصادیات وغیرہ سے بھی لگاؤ ہے

جوشؔ کا ادبی کارنامہ دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) غزل (۲) نظم،

ان کی مستقل نظمیں اُن کی حیات جاودانی کا ذریعہ ہو گئی ہیں اس لئے کہ دلکشی جو قبول عام کا شرف دلواتی ہے ان کے کلام کا خاص جوہر ہے خیالات کی تہہ میں ڈوب کر مضامین کے نہایت آبدار موتی نکال لیتے ہیں طرز بیان میں جدت ہے فارسی کی ترکیبوں کا صرف مدعول ہیں اس خوبی سے ہوتا ہے کہ تمام کلام میں جان آجاتی ہے اور ایک خاص لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔

جوش تشبیہات کے خاص ماہر ہیں، اُن کی تشبیہات میں مقامی اثر بھی ہوتا ہے وہ زیادہ تر اُن چیزوں کو تشبیہات کے لئے چنتے ہیں جو ہمارے مشاہدے میں روزمرہ آیا کرتی ہیں اور ایسی معنویت در محل استعمال کی وجہ سے شعر کی جان بن جاتی ہیں بعض وقت جوش تشبیہات ہی سے پوری فضا کو ایک مکمل تصویر بنا دیتے ہیں اور متعدد تشبیہات و استعارات سے مفہوم کو اتنا واضح اور دلکش کر دیتے ہیں کہ اردو ادب میں کوئی دوسرا شاعر اُن کا اس معرکہ میں حریف نہیں

اُن کے کلام میں ایک اور خاص بات نظر آتی ہے کہ جوش اور زور کا دریا ہر جگہ موجزن ہے جس کی وجہ سے پڑھتے وقت ایک خاص اُمنگ دل میں پیدا ہو جاتی ہے

وہ اپنے کلام سے دنیا کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اقبال کی طرح حسن عمل کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور دنیا کو غلامی سے نجات دلا کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تعلیم دیتے ہیں اگر بعض وقت لوگوں کی برائیوں پر روشنی ڈالنے میں اتنے جوش اور تیزی سے کام لیتے ہیں کہ نظروں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی شیریں کلامی تلخ نوائی سے بدل جاتی ہے خواہ اُسے اُن کے شدید احساسات پر محمول کیجئے یا خواب گراں سے چونکانے کی تدبیر سمجھئے۔

مناظر قدرت کی تصویر کشی میں جوش کو کمال حاصل ہے عموماً پوری تصویر نظر کے

سامنے آجاتی ہے، البتہ کبھی کبھی ہیجانی حالت کا نقشہ جوشؔ کے جذبات کی رنگ آمیزی میں کسی قدر دھندلا ہو جاتا ہے ان کا پیمانۂ قلب جذبات سے اس قدر لبریز ہے کہ کائنات کے ہر ذرہ پر وہ جذباتی نگاہ ڈالتے ہیں چاہے "راب ورپل" ہو یا "گاؤں کا بازار" تارک الدنیا کالج سے خطاب ہو "کسان" ہر نظم میں وہ اثر و کیف پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے شاعری میں تاثیر ضرور بڑھ جاتی ہے لیکن اصلی خد و خال پوری طرح صاف نظر نہیں آتے

جوشؔ کے کلام کی یہ بھی امتیازی خصوصیت قابل قدر ہے کہ یاس و حرماں نصیبی بہت کم ہے وہ بزدلی کو پاس نہیں آنے دیتے بلکہ اظہار افسوس کے بعد ہمت و شجاعت کہہ کر آخر میں ہمت افزائی کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ موجودہ بیکسی کا علاج کیا ہے اُن کا خیال ہے کہ ہر مصیبت کے بعد خوشی آتی ہے صرف ہوشیار ہو جانے کی ضرورت ہے اُردو میں اشتراکی شاعری کا رسا جوشؔ سے پڑی جس میں مزدور پیشہ کی حمایت، سرمایہ داری کی مخالفت خاص موضوع ہے بے باکی اور زور اُن کے کلام کی جان ہے معاشرتی و سیاسی نظام پر رائے زنی کرتے وقت وہ نہ کسی بادشاہ کا خیال کرتے ہیں نہ کسی مذہبی پیشوا یا جماعت کا ہر ایک کی خامیاں آوازِ بلند پکار کر بیان کر دیتے ہیں اُن کا کلام زیادہ تر تنقید حیات پر مبنی ہے سماج کی خرابی چاہے مذہب کی غلط ترجمانی سے ہو یا ذاتی اقتدار کی خام خیالی سے ہر ایک کی اصلاح کرنا وہ اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں اُن کی نظموں میں یہ خصوصیات ہر جگہ نمایاں ہیں

جوشؔ کی ایسی نظمیں بھی کافی دلکش ہیں جن میں تبلیغی انداز کے علاوہ حسن و عشق کے جذبات و واردات ہیں اُن میں واقعیت و اصلیت کا عنصر بہت حسین ہوتا ہے مناظرِ قدرت اور دیہات کے بازار، کھیت، ریل وغیرہ کو سادگی و حقیقت کے ساتھ دلچسپ شاعرانہ انداز میں پیش کرنا جوشؔ کا ایک خاص کارنامہ ہے

جوش کی غزلیں سرمستی و کیفیت کا بیان ہیں محبت کے واقعات کی تفصیل حسن کی کرشمہ سازیوں کی داستانیں نہایت خوبی سے اشعار میں جگہ پاتی ہیں چونکہ وہ خود راہ محبت میں گم ہو چکے ہیں اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں دل کی چوٹ ہوتی ہے، دماغ کی کاوش نہیں

جوش کے کلام کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے متعدد اڈیشن بھی نکل گئے ہیں ان میں روحِ ادب نقش و نگار شعلہ و شبنم ۔ حرف و حکایت جنوں و حکمت فکر و نشاط آیات و نغمات ۔ عرش و فرش سنبل و سلاسل وغیرہ ہیں

جوش عموماً اپنے کو مرحوم لکھتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ ابھی بقید حیات ہیں

صفی لکھنوی

نام علی نقی، اور تخلص صفی ہے سلسلۂ نسب حضرت امام زین العابدین تک پہنچتا ہے آپ کے مورث اعلیٰ سید نور الدین شاہ مبارک سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں عرب سے آکر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے وہیں بالائے حوض شمسی اُن کا مزار ہے ۔ سید احسان علی صفی کے پر دادا جاٹوں کے مظالم سے تنگ آکر فیض آباد چلے آئے اور وہیں سکونت اختیار کی نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں سید سلطان حسین صفی کے دادا فیض آباد سے آکر لکھنو میں مقیم ہوئے

صفی ۱۸۶۲ء میں لکھنو میں پیدا ہوئے دس بارہ سال کے سن تک درسیات فارسی و عربی کی تکمیل مولوی نجم الدین کا کوروی اور شیخ حافظ علی مہروی سے کی بارھویں یا تیرھویں برس ماڈل اسکول میں انگریزی شروع کی اور سال بھر کے بعد کیننگ کالیجیٹ اسکول

میں داخل ہو کر انٹرنس تک تعلیم انگریزی حاصل کی۔ اسی درمیان میں دو تین سال تک اکثر
علوم معقول و منقول کا استفادہ اپنے خسر علامہ مولوی احمد علی اور اپنے چچا سید محمد حسین
سے کیا ۱۸۸۳ء سے ملازمت سرکاری میں داخل ہوئے اور محکمۂ دیوانی میں مختلف
مقامات اور مختلف عہدوں پر رہ کر ۱۹۲۳ء میں ۴۰ سال کام کرنے کے بعد
پنشن پائی۔

صفی کی ذات اُن لوگوں میں ہے جنھوں نے لکھنؤ اسکول کی شاعری کے دامن
کو بدنامی کے دھبے سے پاک کیا اور ایک پاکیزہ اور کارآمد جامہ پہنا کر بازارِ اُردو میں
پیش کرنے کی کوشش کی۔ اُن کے کلام میں نہ تو رعایتِ لفظی کی بھرمار ہے نہ مبالغہ سے اشعار
کا دامن گرانبار ہے اور نہ ابتذال سے داغدار، بلکہ زیادہ تر پاکیزگی کے ساتھ صفائی، حقیقت
دلکشی تمام کلام میں نمایاں ہے۔ قصیدہ و رباعی مثنوی وغیرہ کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ
اُن کا کلام دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے ایک غزلیات کا اور دوسرا مستقل نظموں کا

غزل میں سب سے پہلی چیز جس کو جانِ غزل کہنا چاہیئے وہ تغزل ہے صفی عاشقانہ
مضامین حسن صفائی اور ستھرے طریقہ سے نظم کرتے ہیں اُس کی مثال اُردو میں زیادہ نہیں ملتی
سادگی آپ کی غزلیات کا خاص جوہر ہے، زبان میں بھی سادگی، خیال میں اور طرزِ بیان
میں بھی سادگی ہے اور خوبی یہ کہ ان چیزوں میں کبھی عامیانہ پن نہیں آنے پاتا

محاورات اور تشبیہات کی خوبیوں سے کلام میں چاشنی اور دلکشی بڑھ جاتی ہے۔
ان کی غزلوں کا امتیازی رنگ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ مغربی دل پسند مذاق کو اُردو
میں اس خوبی کے ساتھ اُس وقت لاتے جب دوسروں کے یہاں یہ عنصر نایاب تھا
کہ جس کے سبب سے نہ صرف جدت پیدا ہوتی گئی بلکہ اُردو ادب میں خیالات کا اضافہ
بھی ہو گیا۔ اپنی غزلوں میں موجودہ زمانے کے گوناگوں مسائل اس خوبی سے نظم کرتے
ہیں کہ نہ تو اُردو غزل کے لئے وہ بیانات بار ہوتے ہیں اور نہ اجنبی معلوم ہوتے ہیں

صفی کی زبان اتنی نرم اور شیریں ہے کہ پڑھنے والے کو ایک غزل کئی بار پڑھنے پر بھی سیری نہیں ہوتی، پھر اس میں بول چال کا لطف دل کشی میں اور چار چاند لگا دیتا ہے ثقیل الفاظ کہیں نہیں ملیں گے، فارسی کی ترکیبیں البتہ غزلوں میں موجود ہیں کلام کی پختگی معنی آفرینی کے ساتھ مل کر اشعار میں ایک کیفیت پیدا کر دیتی ہے

نظم لکھنے کو تو سب ہی لکھتے ہیں مگر جب شعریت پیدا نہیں ہوتی تو نظم بجائے دلکش ہونے کے پڑھنے والوں کے ذہن پر بار ہو جاتی ہے یہ وہ میدان ہے جہاں شاعر اور متشاعر کا فرق بہت آسانی سے معلوم کر لیا جاتا ہے صفی کی نظموں میں اس بات کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے کہ دلکشی کہیں ہاتھ سے جانے نہ پائے شعر میں شگفتگی، بیانات میں خوش مذاقی تشبیہات میں جدت دل و دماغ کو اس طرح اپنی طرف متوجہ رکھتی ہیں جس طرح حسین صورتیں نگاہوں کو۔

صفی کی نظموں کے موضوع مختلف ہیں ان کی فہرست دینا طوالت سے خالی نہیں بعض موضوع ایسے ہیں کہ جو شاید اردو ادب میں اس کے پہلے بہت کم لکھے یا نہ ہونے کے برابر تھے مختلف شہروں کے تاریخی مقامات کا دلچسپی کے ساتھ منظوم بیان اور ان کے تاریخی اور جغرافیائی حالات اور اس کے ساتھ عمارتوں اور مقامات کا ذکر اس خوبی کے ساتھ کرتے ہیں کہ باوجود اس کے یہ موضوع خشک ہیں مگر پھر بھی ایسے پُر لطف ہو جاتے ہیں کہ دلکشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی اس لحاظ سے الٰہ آباد، بمبئی، جونپور وغیرہ کے متعلق نظمیں قابلِ دید ہیں جو شائع بھی ہو چکی ہیں

طولانی نظموں کی بدمزگی دور کرنے اور نظم کی دلکشی قائم رکھنے کے لئے جہاں کہیں تغزل کا رنگ پیدا کرتے ہیں وہاں بڑی لذت پیدا ہو جاتی ہے صفی کی نظمیں زیادہ تر شیعہ کانفرنس کے سالانہ جلسوں کے لئے لکھی گئی ہیں ایسی نظموں کا مجموعہ "لختِ جگر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے

اس کے یہ معنی نہیں کہ صفی کی نظموں کا ذخیرہ ایک فرقہ تک محدود ہے ان کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن سے کل ملک اور ہر قوم کے لوگ یکساں لطف اندوز ہو سکتے ہیں ہندوستان کی بدقسمتی اور اہلِ وطن کی بربادی پر اکثر ماتم کر کے اہل وطن کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح بعض نظموں میں "اُردو" کی بگڑی ہوئی حالت پر آنسو بہاتے ہیں اور راہِ راست پر لانے کے لئے نہایت معقول مشورے دیتے ہیں

نظموں میں کبھی کبھی شگفتگی زیادہ کرنے کے لئے مزاح کا پہلو اس خوبی سے پیدا کر دیتے ہیں کہ نہ تو ابتذال پیدا ہوتا ہے اور نہ متانت و سنجیدگی کو ٹھیس لگتی ہے بلکہ دل و دماغ تازہ ہو جاتے ہیں اب غالباً یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ صفی نے مختلف موضوع پر طبع آزمائی کر کے اُردو کے میدان کو وسیع کرنے کی خوبی کے ساتھ کوشش کی ہے

صفی کا انتقال ۲۶ رجون ۱۹۵۰ء کو ہوا۔ دیوان ابھی تک شائع نہیں ہوا لیکن غزلوں کا ایک انتخاب "صحیفۃ الغزل" کے نام سے شائع ہو گیا ہے

ثاقب لکھنوی

مرزا ذاکر حسین نام ثاقب تخلص ہے پیدائش اکبر آباد (آگرہ) میں ۱۸۶۹ء میں ہوئی ان کے جدِ امجد حاجی علی قزلباش شاہ طہماسپ صفوی کے خاص امراء دربار میں سے تھے دو سو برس کا زمانہ گزرا کہ یہ خاندان ہندوستان میں سلسلہ تجارت وارد ہوا اور اکبر آباد میں سکونت اختیار کی ثاقب ابھی چھ مہینے کے تھے کہ ان کے والد اکبر آباد کو چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی

ثاقب نے فارسی کی طرف زیادہ توجہ کی عربی میں ابتدائی کتابیں پڑھ لیں اور انگریزی میں انٹرنس تک لیاقت حاصل کی تلاش معاش میں کبھی ثاقب لکھنؤ میں قسمت آزمائی

کرتے رہے اور کبھی کلکتہ چلے گئے بالآخر ۱۹۰۸ء میں ریاست محمود آباد میں ٹھکانا ہو گیا۔

اس کتاب کے دوبارہ شائع ہونے کے پہلے ہی ثاقب کا دیوان شائع ہو چکا ہے جس کی روشنی میں ہم کو اپنی اس رائے کو ترمیم کرنا پڑا جو پہلے ایڈیشن میں کلام ثاقب کے احباب کی مدد سے قائم ہوئی تھی ثاقب میر و غالب کے مقلد ہیں لیکن دیوان شائع کرنے میں اگر وہ میر کے بجائے غالب کی تقلید کرتے تو بہتر ہوتا۔ ضخامت کی خواہش نے رطب و یابس سب ہی ایک جا کر دیا غزلوں کے علاوہ سہرا، تاریخ، تضمین سب کو اس دیوان میں جگہ مل گئی

مرزا ثاقب اگر غالب کی نظر انتخاب سے کام لیتے تو ان کے اچھے اشعار کو دیر تک چمکنے کا موقع ملتا اب موجودہ صورت میں نظروں کو تلاش کرنا پڑتا ہے جب وہ خود متوجہ کر لیتے معنویت و زبان کا اثر یکساں قائم رہتا۔ سب سے پہلا اثر جو دیوان ثاقب کے مطالعہ کرنے سے ہوتا ہے وہ زبان کی صفائی اور مضمون کے تلاش کی بے درپے کوشش ہے خیالات کو بلند کرنے کے لئے ثاقب نے بڑی محنت سے کام لیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی کامیاب بھی ہوتے بڑے سے بڑے خیالات کو کم از کم الفاظ میں نظم کرنے کی اچھی کوشش کی ہے لیکن یہ خصوصیت ہر جگہ قائم نہیں رہ سکی ان کے دیوان میں ایسے اشعار بہت کافی ہیں جن سے خودداری کا احساس نشو و نما حاصل کر سکتا ہے خصوصیت کو اہم بنانا کہ انسان، انسان معلوم ہو سکے اس کی ہستی اپنی انفرادیت کا دوسروں پر نقش قائم کر سکے ان کے کلام کی بڑی نمایاں خصوصیت ہے پاکیزگی و لطافت کے ساتھ ساتھ ہموار کلام خاص طور پر پورے دیوان میں موجود ہے

طرز بیان و صفائی زبان کے اعتبار سے دیوان ثاقب قابل قدر ہے مصرعوں کی ساخت عالمانہ انداز لئے ہوئے ہے بہا بہ سچے سجے ہوئے الفاظ بہترین محاورے،

شاعرانہ پیرائے کے ساتھ نظم ہوتے ہیں۔ واردات حسن و عشق کو لطیف اشاروں میں بیان کر دینا ثاقب کا ایک کارنامہ ہے جس سے اُن کی فطرت شناسی اور نازک جذبات کے احساس کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

خودداری، زور کلام و سرداری تخیل کی کوشش ثاقب کے اشعار میں ایک انفرادی حیثیت پیدا کر دیتی ہے۔ غالباً اِن ہی خصوصیات کی وجہ سے کلام میں شگفتگی و بیخودی کے جذبات بہت کم ہو سکے جس کی کمی جا بجا محسوس ہوتی ہے۔

ثاقب کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا۔

ظریف

سید مقبول حسین ظریف کی ولادت ۲۴ فروری ۱۸۷۰ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ اُن کے والد کا نام سید فضل حسین تھا۔ ظریف بچپن ہی سے شوخ اور بے باک تھے۔ اس زمانہ کے رواج کے لحاظ سے ظریف کی ابتدائی تعلیم قرآن مجید سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد اُردو فارسی کی طرف توجہ کی گئی۔ انگریزی کم پڑھی مگر کسب معاش کے مشغلے نے روز بروز اُن کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ظریف صفی کے چھوٹے بھائی تھے اور اُن ہی کی فیض صحبت سے شعر و شاعری سے واسطہ ہوا۔ صفی اس وقت اُردو شاعری اور خاص کر صنف غزل کی ذہنی تبدیلی کرنے والوں میں نمایاں حصہ لے رہے تھے، فرسودہ طرز بیان اور مبتذل مضامین سے غزل کو پاک کرنا چاہتے تھے۔ اُردو کے دور متوسط میں جو خرابیاں طرز تخیل اور ہیئت میں آگئی تھیں ان کو دور کر کے صحت مند عناصر غزلوں میں داخل کرنا چاہتے تھے۔ صفی کی اس ذہنی کاوش کا اثر ظریف پر خاطر خواہ پڑا۔ چنانچہ جب ظریف مشاعروں میں شرکت کرتے تو اُن کے پیش نظر یہ رجحان رہتا اور مزاحیہ انداز میں معشوق کو قاتل کہنے والے، معشوق سے فریاد کرنے

ظریف

والے چاکِ گریبان پر شعر کہنے والے اور اسی قسم کے تقلیدی راویۂ نگاہ کو شاعری کا جزوِ اعظم ماننے والے' کا وہ ہمیشہ مذاق اُڑاتے ظریف کے نزدیک یہ زبان کی بڑی خدمت تھی جس کو مرتے دم تک نباہتے رہے

ظریف کی شاعری اکبر کی شاعری کی طرح ایک مقصد پر مبنی تھی بادی النظر میں وہ محض تفریح کے لئے ہوتی مگر باطن میں اس کا منشا اصلاحِ مذاق ہوتا وہ ہنسا ہنسا کر ادب کی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے یہ نظریہ یہیں تک محدود نہیں تھا بلکہ سیاسی و سماجی خرابیوں پر بھی وہ اسی انداز میں برابر نکتہ چینی کرتے رہے کل ہند تحریک ہو یا صوبائی' سیاسی تحریک مقامی ہو یا سماجی خرابی وہ ہر ایک میں اپنی شاعری سے اصلاح کرنے یا نکتہ چینی سے اپنی بیداری کا ثبوت دیتے اس کا ثبوت آپ کو ان کی متعدد نظموں میں ملے گا مثلاً محل آب رسانی کونسل الیکشن' ریس' ہمارے لیڈر' زلزلۂ بہار' نعال لکھنو' ہوم رول' وغیرہ

ظریف کا کلام اگرچہ ہنسنے ہنسانے کا مرقع ہے مگر اسی مجموعہ میں ایسی نظمیں بھی نظر آتی ہیں جن میں سنجیدگی اور درد مند دل کی پکار بھی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی یہ ہنسانے والا اپنے محسوسات سے مجبور ہو کر رو بھی دیا تھا ایسے موقع پر ظریف کی نظموں میں بڑی تاثر دگدار کا سامان مل جاتا ہے

ظریف کے کلام میں تاثیر کی کئی وجہیں معلوم ہوتی ہیں سب سے پہلے تو زبان کی پاکیزگی اور محاورات کی صحت ہے اسی کے ساتھ نئی خوبیاں بھی شامل کر لیجئے تو بڑی حد تک کامیابی کا راز معلوم ہو جاتا ہے مگر ان باتوں سے بڑھ کر اُن کا زاویۂ نگاہ تھا ہر خرابی پر ان کا دل دھڑکنے لگتا تھا وہ انفرادی احساس سے بلند ہو کر قومی و اجتماعی شعور سے کام لیتے تھے اور جب احساس میں شدت ہو جاتی تھی تب خیالات کو اشعار کا جامہ پہنا دیتے تھے اُن کا طرزِ بیان نہایت پُر اثر تھا عموماً ایسی زبان کلام میں استعمال کرتے تھے اور ایسے مزے

کے اعتراضات کرے جو عام فہم بھی ہوتے اور ہمہ گیر بھی۔ اس سے انکار نہیں کہ ان کے دیوان
میں بعض جگہ ایسا کلام بھی ملتا ہے جو صرف کہنے کے لئے کہا گیا ہے۔ جشنِ مروت سے مجبور ہو کر
ایسے مشاعروں کی شرکت اور ایسے اشعار کہنے پر مجبور ہوئے جو ان کے محسوسات سے بیگانہ
ہوتے۔ کہیں کہیں ایسے موقعوں پر اپنے عجز کا اعتراف بھی ظریف نے کر لیا ہے۔

ظریف اپنے زمانہ کے سب سے بڑے ظریف شاعر سمجھے گئے اور اس میں کچھ بھی لوگ حق بجانب
تھے اس لئے کہ دوسرے مزاحیہ نگار شاعر صرف ہنسنے ہنسانے کے لئے تفریح کا سامان مہیا
کرتے ہیں برخلاف اس کے ظریف کا ایک مقصد ہوتا ہے اور عموماً شدتِ احساس کے تحت وہ
ایسا کلام پیش کرتے ہیں اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ زبان ان کی کافر تھی، دل
مومن تھا یعنی مزاحیہ اندازِ بیاں ظاہری پہلو تھا اور مقصدِ کلام ان کے دردِ دل کی
آواز تھی۔ وہ ہر صحت مند شعبۂ حیات کو پورا پورا تندرست دیکھنا چاہتے تھے ہنسا ہنسا کر
انجام کی طرف زمانہ کو متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کی ہر دل عزیزی کا ثبوت ان بیانات اور
اظہارِ تعزیت سے ملتا ہے جو ان کے مرنے کے بعد اکثر ادبی حلقوں اور اشخاص نے ان کے
غم میں بھیجے۔ ظریف کا انتقال ۳ر دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ میں ہوا۔ ان کا مجموعۂ کلام ان
کے مرنے کے بعد سنہ ۱۹۴۹ء میں "دیوانِ جی" کے نام سے شائع ہوا۔

آرزو

آرزو کے جدِ امجد نواب تہور خاں ہرات سے اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان
آئے۔ اجمیر میں قیام رہا۔ پھر ان کے پوتے نواب سیف الدین خاں اجمیر سے لکھنؤ چلے
آئے۔ غدر میں ریاست بگڑ گئی گھر لٹ گیا۔ آرزو کے والد میر ذاکر حسین دل آرام کی بارہ دری
لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئے۔ اسی بارہ دری میں سنہ ۱۲۸۹ھ میں آرزو کی ولادت ہوئی۔

پانچ سال کی عمر سے سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ فارسی و عربی کی کتابیں لکھنؤ کے مشہور علماء سے پڑھیں علم عروض حکیم میر ضامن علی جلالؔ سے حاصل کیا اور اُن ہی سے اصلاحِ سخن بھی لینے لگے بارہ برس کے سن سے شعر کہنے کا شوق ہوا۔ رفتہ رفتہ اُستاد کی توجہ اور اپنی محنت سے وہ مشق بہم پہنچائی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا نے استاد مان لیا

آرزو اردو کے اُن چند باکمال شعراء میں ہیں جن کا قلم نثر کے میدان میں بھی رواں رہتا ہے چنانچہ کئی قابلِ قدر ڈرامے مثلاً متوالی جوگن، دل جلی بیراگن، شرارۂ حسن وغیرہ نثر میں آپ نے لکھے اور ایک رسالہ قواعد زبان اُردو کے متعلق نظامِ اردو کے نام سے میں سال کی محنتِ شاقہ کے بعد تصنیف کیا، جو اُردو ادب میں ایک خاص اضافہ خیال کیا جاتا ہے

نظم کے میدان میں بھی آرزو نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے، غزل قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مستقل نظموں کے علاوہ سلام، مرثیے بھی بکثرت کہے ہیں جن کے دیکھنے سے موصوف کی پُرگوئی اور زبان پر حاکمانہ تصرف کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو چیز سے زیادہ آرزو کی ناموری کا باعث ہوئی وہ غزل ہے غزلوں میں عموماً ایک درد انگیز یاس ہے، جس کے اظہار کے لیے موصوف ایسے اثر کرنے والے الفاظ شعر میں لاتے ہیں کہ رنج والم کے ساتھ ایک کیف بھی پیدا ہو جاتا ہے اندازِ بیان اور استعار کی رنگینی سے کہیں کہیں میر کا بھر ار رنگ نظر آجاتا ہے

شگفتہ بحر، ملائم الفاظ اور دل پذیر ترکیبوں کے ساتھ سوز وگداز کا عنصر اشعار میں نہایت موثر ہو جاتا ہے زبان نہایت صاف و شیریں ہے اس وجہ سے کلام میں دلکشی بہت ہے ہندی کے منتخب الفاظ اور فقروں سے کلام میں دل کشی پیدا کرنے کا خاص مادہ ہے جیسے ؎

وہ جھونکے سرد ہواؤں کے وہ دل کے کنول کا لہرانا

دل کے کنول کا لہرانا ایسا ٹکڑا ہے جو ایک وجدانی کیفیت پیدا کرنے کے لئے بہت کافی ہے، آرزو کی غزلوں میں بادجود متانت وسنجیدگی کے شوخی، ادا بندی اور چھیڑ چھاڑ کا بہت دلچسپ ذخیرہ موجود ہے

ذوق کی طرح آرزو کو بھی محاورات اور ضرب الامثال کے نظم کرنے کا خاص شوق معلوم ہوتا ہے لیکن نہایت اعتدال کے ساتھ ان کی بھرمار سے شعر بے لطف ہونے نہیں پاتا بلکہ ایک لطف پیدا ہوجاتا ہے آرزو کے کلام میں رعایت لفظی کو بھی جگہ ملی ہے، جو غور کے بعد نظر آتی ہے لیکن اس صنعت کا جو لطیف حربہ ہے وہ آپ اشعار کی زینت کے لئے لیتے ہیں شوخ اور تکلیف وہ عنصر سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں ایسی صورت میں آورد کا پتہ نہیں رہتا بلکہ آمد سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے

بے ثباتی عالم اور عدم کے جانے کو آرزو نے نہایت یاس انگیز لہجہ میں دنیا کے سامنے غزلوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ایسے موقع پر وہ ناصح نہیں بنتے بلکہ اپنے ہی کو مخاطب کرکے کچھ اس انداز سے ان ہی باتوں کو کہتے ہیں کہ دل پر خاص اثر ہوتا ہے ان کی غزلوں میں ایک اور چیز بھی ہے جو خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے عالم تنہائی کا منظر، اس کا اور آپ ہی آپ کبھی رونا کبھی ہنسنا یہ سب باتیں ایسی خوبی کے ساتھ نظم ہوجاتی ہیں کہ ایسے اشعار کو بار بار پڑھیئے مگر سیری نہیں ہوتی

یہ تنقید نامکمل رہ جائے گی اگر آرزو کی خالص اُردو کا تذکرہ نہ کیا جائے آرزو نے ایسی غزلیں کافی کہی ہیں جن میں وہی الفاظ اور محاورے آسکتے ہیں جو خاص اُردو کے ہوں نہ عربی وفارسی الفاظ ہوتے ہیں نہ ترکیبیں، ایسی غزلوں کا کہنا جتنا مشکل ہے ظاہر ہے مگر آرزو نے بڑی فنکاری سے ایسی غزلوں کو دلچسپ بنایا ہے اس سے اور فائدوں کے علاوہ ایک یہ بھی اہم فائدہ متصور ہے کہ اُردو غزل عام فہم اور ہر دل عزیز ہوجائے اور جو ہندی اور اُردو میں بُعد ہوچلا ہے وہ بھی جہاں تک ممکن ہو کم ہوجائے۔ ایسی

غزلوں کو آرزو نے خالص اردو کے نام سے یاد کیا ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ اردو داں تو کیا ہندی داں بھی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں خالص اردو کے نمونے کے لئے ہم ایک غزل پیش کر دینا نامناسب نہیں سمجھتے۔

دن ان آنکھوں کا ہے کہنے کو ذرا سا پانی
سیکڑوں ڈوب گئے پھر بھی ہے اتنا پانی

آنکھ سے بہہ نہیں سکتا ہے بھرم کا پانی
پھوٹ بھی جائے گا چھالا تو نہ دے گا پانی

چاہ میں پاؤں کہاں آس کا میٹھا پانی
پیاس بھڑکی ہوئی ہے اور نہیں ملتا پانی

دل سے لوکا جو اٹھا آنکھ سے ٹپکا پانی
آگ سے آج نکلتے ہوئے دیکھا پانی

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

پھیلتی دھوپ کا ہے روپ لڑکپن کی اٹھان
دوپہر ڈھلتے ہی اترے گا یہ چڑھتا پانی

ٹکٹکی باندھے وہ تکتے ہیں میں اس گھات میں ہوں
کہیں کھانے لگے چکر نہ یہ ٹھہرا پانی

کوئی متوالی گھٹا تھی کہ جوانی کی امنگ
جی بہا لے گیا برسات کا پہلا پانی

ہاتھ جل جائے گا، چھالا نہ کلیجے کا چھوؤ
آگ مٹھی میں دبی ہے نہ سمجھنا پانی

رس ہی رس جس میں ہے پھر بھی ذرا سی بھی نہیں
مانگتا ہے کہیں ان آنکھوں کا مارا پانی
رستا اس کو جو چپ رہ کے بھرے ٹھنڈی سانس
یہ ہوا کرتی ہے پتھر کا کلیجا پانی
یہ پسینہ وہی آنسو ہیں جو پی جاتے تھے ہم
آرزو لو وہ کھلا بھید وہ ٹوٹا پانی

مترنم رنگ میں آپ کے دو مجموعے ”جہانِ آرزو“ اور ”فغانِ آرزو“ کے نام سے ہیں خالص اردو میں بھی ایک مجموعہ آپ نے ”سریلی بانسری“ کے نام سے شائع کیا ہے جو تمام تر متذکرہ بالا لب و لہجہ اور زبان کے اصول پر مبنی ہے

آرزو ایک مدت سے سینما کی دنیا میں لگ گئے اور مکالمے لکھتے تھے اور بمبئی میں قیام کر لیا تھا مگر مرنے سے پہلے کراچی چلے گئے تھے وہیں اپریل ۱۹۵۱ء میں انتقال ہوا

ریاض

ریاض کے جد امجد کرمان کے رہنے والے تھے۔ یہ نہیں کہہ سکتے اور کیوں ان کے بزرگوار ہندوستان آئے اور خیرآباد ضلع سیتاپور ہی میں کس لیے سکونت اختیار کی بہرحال ریاض کی ولادت اسی شہر میں سنہ ۱۲۷۰ھ میں ہوئی۔ ریاض نے ابتدائی تعلیم اپنے دادا سید طفیل احمد سے حاصل کی موصوف اپنے عہد کے مشہور عالم تھے

ریاض نے ابتدا میں اسیر سے فیض حاصل کیا اس کے بعد امیر کے شاگرد ہوئے ادب سے دلچسپی ان کو ابتدائے زندگی سے رہی، پہلے ایک اخبار ”ریاض الاخبار“ کے نام سے خیرآباد سے جاری کیا پھر جب گورکھپور گئے تو ریاض الاخبار بھی وہیں سے نکالنے لگے بلکہ اس کے ساتھ فتنہ

وعظ فتنہ بھی نکالنے لگے۔ ان اخبارات میں ریاض کا کلام بھی شائع ہوتا رہا اور ان کی شہرت کا باعث ہوا۔

ریاض نے گورکھپور کو وطن بنالیا تھا۔ زندگی کا زیادہ حصہ یہیں گزرا۔ اس سرزمین نے بھی داد پوری طرح دی۔ ان کے مرنے کے بعد ان کا مجموعۂ کلام ”ریاضِ رضواں“ کے نام سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔

ریاض کا کلام شروع سے آخر تک شباب کی رنگینیوں اور حسن و عشق کی عملی زندگی کی داستان ہے۔ کہیں معشوق سے چھیڑ چھاڑ ہے تو کہیں پیر مغاں و ناصح سے دل لگی۔ کبھی کسی کی اداؤں کا پُرلطف ذکر ہے تو کبھی کسی لمبی ڈاڑھی والے کی ہجو ملیح۔ غرض کہ ریاض ہر وقت سرشار معلوم ہوتے ہیں۔ وہ روزِ ازل سے ایسا دل لے کر آئے تھے جس کو بہارِ حسن کی دلچسپیوں سے کبھی سیری نہ ہوئی۔ ریاض نے دنیائے عشق میں عاشقِ ستم رسیدہ بن کر کبھی نہیں رہنا پسند کیا۔ دل پر اگر کبھی گہری چوٹ لگی ہے تو اس کا اظہار آہ و فغاں سے نہیں کیا بلکہ ایک معنی خیز تبسم سے اور ایک ایسی ادا سے کہ معشوق کو خود پیار آجائے۔ وہ معشوق کی خوشامد بہت کم کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو خود روٹھ جاتے ہیں کہ کوئی گدگدا کے ہنسا کے منالے۔

یہ سچ ہے کہ ریاض کے کلام میں سوز و گداز نہیں مگر اس کا کیا جواب کہ اس عنصر کے بجائے ان کے کلام میں کیف و سرور کی ایک لہر پڑھنے والے کے دل کو ہر وقت سرشار کیے رہتی ہے جس کی وجہ سے اتنا مزا آجاتا ہے کہ شاید ریاض کو ”میکدہ والی“ سے بھی مل کر نہ آتا ہو۔ ریاض کا یہ ایک خاص کارنامہ ہے کہ انھوں نے معشوق کے کردار کو اسی کے الفاظ، حرکات و سکنات سے اپنے اشعار میں اس خوبی سے دکھایا ہے کہ پورا نقشہ ایک پُرلطف طریقے سے پیشِ نظر ہو جاتا ہے اور پھر یہ بھی قابلِ قدر مذاق ہے کہ ایسے موقعوں پر باوجود بلا کی شوخی کے متانت کا دامن خارزارِ ابتذال سے مجروح نہیں ہونے پاتا۔

خمریات اور اس کے متعلقات پر قریب قریب ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے

مگر ریاض نے اس خوبی سے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے کہ اُن ہی کا حصہ ہو گیا ہے جب کبھی وہ میکدہ کا ذکر کرتے ہیں تو اس انداز سے کہ لفظ لفظ سے شراب و بادہ چھلکی پڑتی ہے یہاں ان کا ہر قدم سراپا متوالی چال ہے۔ طرزِ بیان سے وہ سماں پیدا کر دیتے ہیں کہ ساقی صراحی سبو پیر میکدہ، بلکہ در و دیوار تک مست نظر آتے ہیں اور وہ مزہ تو کبھی نہیں بھول سکتا جب وہ شراب کو کبھی میکدہ والی، اور کبھی "وہ" کہہ کر اس کا پتہ دیتے ہیں، گویا ایک معشوق ہے کہ جس کا نام صرف اشاروں سے بتانا چاہتے ہیں ریاض کا ظرف اسا عالی ہے کہ وہ پی کر کبھی سرشار یا بدمست نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کسی ایسے شخص کا نتیجۂ فکر ہے کہ جو سرمستی میں از خود رفتہ ہو گیا ہے اور آپ کو بھی اتنی پلا دینا چاہتا ہے کہ آپ بھی بے ہوش نظر آئیں

ریاض کے تمام کلام کو پڑھ کر ایک خاص بات آپ کو نظر آئے گی کہ اُن کا معشوق مثالی یا خیالی نہیں، نہ ان کا عشق غیر معمولی انسان کا عشق ہے وہ اپنے معشوق کو ایک حسین اور دلچسپ ہستی سمجھ کر پیار کرتے ہیں نہ اس کو سراپا ظالم بیان کرتے ہیں، نہ اتنا بلند کر دیتے ہیں کہ گدایانہ بستاں سے بھی آستاں پر گزر نہ ہو سکے وہ اُسے اپنے برابر کا ایک جلیس لطیف سمجھتے ہیں جس سے شوخی، چھیڑ چھاڑ، ہنسی، مذاق سے پوری دل بستگی حاصل کر سکیں وہ اس پر فقرے بازی بھی کرتے ہیں، اس کو طنز سے کبھی کبھی سرمندہ کر کے محجوب ہوتے ہوئے بھی دیکھنا باعثِ لطف سمجھتے ہیں اور کبھی کبھی اس سے آتش کی طرح بگڑ بھی جاتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی شوخی، پُرلطف طنز، مزے دار تیر ادب اور محبت تنکھا اور حقیقت آمیز معاملات کی دنیا نظر آتی ہے

اصغر

اصغر کا اصلی وطن گورکھپور کے ضلع میں تھا لیکن آپ کے والد سلسلۂ ملازمت اتنے عرصۂ دراز تک گونڈہ میں رہے کہ لوگ اصغر کو گونڈوی کہنے لگے۔ اصغر ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی۔ کچھ دنوں انگریزی مدرسوں میں تعلیم پا کر اسکول چھوڑ دیا۔ انٹرنس کے امتحان کے لیے تیاری کی لیکن ہوا یہ کہ پرچے [illegible] کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے۔ تاہم اس تھوڑی سی مدت میں فطری صلاحیت کی وجہ سے اتنی استعداد پیدا ہو گئی کہ انگریزی کی ادبی کتابوں کا کافی لطف اٹھا سکتے تھے۔ یہی حال عربی اور فارسی کا تھا۔ جو کچھ قابلیت انھوں نے پیدا کی وہ صرف ان کے ذاتی مطالعۂ کتب اور غور و فکر کا نتیجہ تھی۔

اصغر ابتدا میں اپنا کلام منشی خلیل احمد وجد بلگرامی کو دکھاتے رہے بعد میں کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو دکھائیں۔ اخلاقی حیثیت سے اصغر ایک نہایت قابلِ قدر آدمی تھے۔ باوجود زہد و تقویٰ کے مزاج میں رنگینی اور ظرافت کا عنصر کافی تھا۔ بادۂ تصوف کے خاص طور سے خواستگار رہے۔ چنانچہ ان کو قاضی شاہ عبدالغنی سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ عرصہ تک آپ کا قیام الٰہ آباد میں سلسلۂ ملازمت رہا۔ ہندوستانی اکیڈمی کے رسالہ ہندستانی کے ایڈیٹر عرصہ تک رہے۔

اسلوبِ بیان کے لحاظ سے اصغر سب سے الگ ہیں اور اس میں شک نہیں کہ جہاں تک زبان و بیان و خیال کا تعلق ہے اتنا غیر تقلیدی اور نرالے اندازِ تغزل کا نمونہ اردو میں کمیاب ہے۔ ممکن ہے کہ اس دشوار گزار راہ میں کہیں کہیں شاعر کے قدم ڈگمگا گئے ہوں لیکن ان کے کارنامے کی اہمیت اور اس کی قدر و منزلت اس سے کم نہیں ہو سکتی۔

اصغر بہت کم گو اور دقت پسند شاعر تھے۔ اتنا کم کہنے پر بھی اہلِ نظر کو اپنی طرف خاص طور پر متوجہ کر لینا اس بات کی کافی دلیل ہے کہ ان کے کلام میں قابلِ قدر چیزیں کافی ضرور ہیں۔

دوسرا دیوان یعنی "نشاطِ روح" اور اس کے بعد کا کلام ان کی ابتدائی شاعری سے بالکل الگ ہے۔ اُن کی پرانی شاعری میں تقلید و تتبع کا عنصر غالب ہے لیکن نشاطِ روح سے عنصرِ تقلیدی رنگ کا آغاز ہوتا ہے جو اصغر کی امتیازی خصوصیت ہے۔ جن شعرا نے امیر و داغ و جلال کے بعد اردو غزل میں نئی روح پھونکی وہ حسرت، محشر، عزیز اور ثاقب ہیں۔ ان حضرات نے سنجیدگی، تاثیر، ترنم اور معنویت کے لحاظ سے غزل کو اتنا بلند کر دیا کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن "تنگنائے غزل" کی وسعتیں لامحدود نہیں۔ اس لیے ایک حادثیت کی وجہ سے اصغر، جگر، فانی، فراق کو اس طرف رجوع کیا تاکہ اس کے علاوہ کچھ اور باتوں کا اضافہ کریں، چنانچہ طرزِ بیان میں زیادہ تر اُن شعراء نے بالکل نئی روش اور نیا لب و لہجہ اختیار کیا۔

اصغر کے کلام میں سب سے پہلی چیز لب و لہجہ کی وہ حدت آمیز رنگینی ہے جو پڑھنے اور سننے والوں کو ایک خوشگوار طریقے سے ٹھہر کر متاثر کر دیتی ہے۔ دوسری چیز سکون و اضطراب کی وہ معتدل آمیزش ہے جو ایک خاص کیف پیدا کر دیتی ہے۔ اکثر ایک لطیف ترنم اور دلکشی بھی کلام میں پائی جاتی ہے۔

اصغر کی غزلوں میں عاشق و معشوق کے باہم اختلاف اور ٹھیٹھ انسانی جذبات تو بہت کم ملتے ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ موجودہ غزل گوئی میں اس چیز کا قریب قریب فقدان نظر آتا ہے۔ چنانچہ اصغر کے یہاں بھی یہی چیزیں مختلف عنوان سے جلوہ گر ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان خیالات اور تجربات میں ایسے مضامین ڈھونڈتے ہیں جو ایک لطف و کیفیت رکھتے ہیں۔

سامنے کی باتیں ہوں یا عام وارداتِ قلبی ہوں ان سب کو اصغر بیان کرکے ایک خاص انداز سے بیان کر دیتے ہیں جس سے کلام میں ایک نوچ اور ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے اشعار باریک نشتر کی طرح دل میں اُترتے تو ضرور ہیں اور دل کو زخمی بھی کرتے ہیں لیکن دل کو چھیڑتے اور گدگداتے ہوئے شعرا کی ماورائی فضا میں محو ہو جاتے ہیں جہاں سے غالباً یہ پیدا ہوتے تھے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ انسان ہمیشہ دل پر چوٹ کھانے کے لئے سینہ سپر بھی نہیں رہتا بلکہ ان میں بھی اُسے ایک خاص لُطف آتا ہے اور تیر نشانے کو چھُوتا ہوا مُڑ کر نکل جاتا ہے

اصغر کے پورے کلام میں ایک نشاط اور سرمستی ہے جو ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور بصر لوازمِ وجداں ہوتے وہ عشق کی منزلیں طے کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ کہا ہے ؎

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

اصغر کے کلام میں فلسفیانہ تخیل حقائق و معارف کے رموز شعریت لئے ہوئے نہایت خوبی کے ساتھ جگہ پاتے ہیں تمام کلام میں خیالات کی پاکیزگی، متانت و لطافت کا پہلو لئے ہوئے ہے اور یہ خصوصیت ان کی فارسی ترکیبوں سے بہت زیادہ نمایاں اور دل آویز ہو جاتی ہے اصغر کے وہ اشعار خاص طور پر دلکش ہوتے ہیں جن میں "عبودی روح" اشیاء یا کیفیاتِ مجردہ کو روح فرض کر لیا جاتا ہے۔

اصغر تشبیہ و استعارے میں خاص کاوش کرتے ہیں عامیانہ و فرسودہ چیزوں سے گریز کرکے نہایت غور و خوض کے بعد ایسی لطیف و نادر چیزیں پیدا کرتے ہیں کہ بعض لحاظ سے اس اُدھیڑ ادب میں ایک اضافہ سمجھا جا سکتا ہے

اصغر کا انتقال ۱۹۳۶ء میں الہ آباد میں ہوا اور یہیں دفن ہوئے

جگر

نام علی سکندر ہے وطن مراد آباد ہے ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے بزرگوں کا وطن دہلی
تھا آپ کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع شاہجہاں کے اُستاد تھے لیکن عتابِ شاہی کی وجہ سے
دلّی چھوڑ کر مراد آباد آنا پڑا اور وہیں کے ہو رہے۔ عرصے سے اس خاندان میں علم کا چرچا تھا
جگر کے والد مولوی نظر علی بھی شاعر اور صاحبِ دیوان تھے۔ خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے

جگر کی ابتدائی تعلیم و تربیت بہت معمولی ہے عربی سے بالکل ناواقف ہیں فارسی
یوسف زلیخا اور سکندر نامہ تک دیکھی ہے انگریزی بھی بہت کم جانتے ہیں

جگر نہایت شگفتہ مزاج اور رنگین طبع آدمی ہیں ایک عمر تک حسنِ مجازی کی تلاش
و جستجو میں مختلف مقامات کی سیر کرتے رہے یہی وجہ ہے کہ وہ حسن کی ایک داستان سے واقف
ہیں اسی سیر و سیاحت کے سلسلے میں آگرہ میں پانچ چھ برس تک مقیم رہے۔

جیسا اوپر بیان ہوا ہے جگر کو شاعری ترکہ میں ملی بچپن ہی سے اس کا شوق ہوا
۱۳، ۱۴ برس کے سن سے شعر کہنا شروع کر دیا ابتدا میں اصلاح اپنے والد سے لیتے
رہے ان کے بعد داغ کو کلام دکھلانے لگے اور داغ کے بعد منشی امیر اللہ تسلیم کو کئی
غزلیں دکھلائیں

جگر کی قدیم شاعری پر سب سے زیادہ داغ کا رنگ نظر آتا ہے شوخی، معاملہ
بندی، الفاظ کی تکرار، معشوق کا سراپا اثر پذیر الفاظ میں بیان کرنا، یہ داغ کے پرتوِ فیض
کا نتیجہ ہیں جگر نے نہایت خوبی سے ان چیزوں کو اپنے کلام کا جزو بنا لیا ہے یہی نہیں کہ یہ
خصوصیت دنیاوی حسن و عشق کے واقعات تک محدود ہو بلکہ حقائق و معارف کو بھی نہایت
کیف آور و پُر معنی طریقے سے بیان کر کے کلام کی تاثیر کو بڑھا دیتے ہیں

جگر کی شاعری میں کیف وارفتگی اور بے خودی کی لہر قریب قریب ہر جگہ ہے جو کلام میں ایک امتیازی شان اور شاعر کے انہاکِ ذوق و جوشِ فکر کا پتہ دیتی ہے اُن کی آنکھیں حسن کی ادا شناس ہیں اور ان کا دل لذتِ عشق کا سرمایہ دار ہے حسن کے اثر سے کلام میں رنگینی و دلکشی کا ایسا اضافہ ہوجاتا ہے جس سے پڑھنے والے پر ایک خاص محویت طاری ہوجاتی ہے

جگر کو حسن سے محبت ہے وہ اس شراب سے اس قدر سرشار ہیں کہ کبھی کبھی اپنے کو خود معشوق سمجھنے لگتے ہیں کبھی کبھی مومن کی طرح معشوق سے طنزیہ گفتگو کرکے اس کو چھیڑ دینا بھی ایک خوشگوار فرض خیال کرتے ہیں آپ کے کلام میں جہاں کہیں درد ہے اس میں حسرت کا پہلو بھی شامل نظر آتا ہے جس سے تاثیر کے ساتھ ایک وجدانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور دل پر ایک ایسی چوٹ لگتی ہے جو اسی جگہ پر خود پُر لطف ہوتی ہے

جگر کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت سادگی و روانی ہے وہ ثقیل الفاظ کبھی استعمال نہیں کرتے جو فارسی ترکیبیں کلام میں لاتے ہیں وہ عموماً مناسب اور دلنشیں ہوتی ہیں جس سے روانی اور لطف میں اضافہ ہوجاتا ہے، محاورات کے برمحل صرف سے کلام میں برجستگی اور ایک خاص مزہ پیدا کرتے ہیں جگر کو ایک اچھا سلیقہ ہے "داغِ جگر" کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جگر کو رعایتِ لفظی اور ہوش کا بھی کسی قدر چسکا ہے

الفاظ کی تکرار سے وہ اپنے اشعار میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں شک بھی نہیں کہ عموماً کامیاب ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ تکرار بھدی اور زائد بھی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ سب خرابیاں اُن کے موجودہ کلام میں بہت کم ہوگئی ہیں اُن کا رجحان اب زیادہ تر مضمون آفرینی کی طرف ہے

جگر کا موجودہ رنگِ شاعری پرانی شاعری سے کسی قدر الگ ہے "شعلۂ طور" (دوسرا دیوان) "داغِ جگر" سے بحیثیتِ مجموعی بہتر ہے، اس میں زیادہ متانت، درد اور پختگی ہے تخیل میں بھی پہلے سے زیادہ بلندی ہے حقائق و معارف کے مسائل اکثر بڑی خوبی اور

تشدد مدے ات بات میں سطح عام پر آگئے ہیں جہاں میں فارسیت زیادہ آگئی ہے کہیں کہیں تو پورے مصرعے فارسی کے ہوگئے ہیں

حکمؔ نے عمیق مضامین کی تلاش میں قابل قدر کوشش کی ہے لیکن کہیں الفاظ ان کے مفہوم کو پوری طرح واضح کرنے میں قاصر نظر آتے ہیں اور پُر گوئی کی وجہ سے خیالات میں تکرار آگئی ہے

سائل دہلوی

سراج الدین احمد خاں نام، سائلؔ تخلص تھا ولادت ۱۸۶۸ء اور وفات ۵ ستمبر ۱۹۴۵ء میں ہوئی آپ کا خاندان دہلی کا قدیم و صاحب اعزاز خاندان تھا سائل نے اپنی قابلیت و وضعداری سے خاندانی وقار کو قائم رکھنے کی کامیاب کوشش کی انسانیت کے لحاظ سے وہ نہایت حسن اخلاق و پُر خلوص آدمی تھے

سائل کو مرزا داغؔ دہلوی کی دامادی کا بھی شرف حاصل ہے جس کا اظہار وہ بار بار کرتے رہیں داغؔ ہی سے کلام پر اصلاح بھی لی تھی اپنی قابلیت اور استاد کی شفقت سے بہت جلد خود اُستاد ہوگئے غزل کو حُسن و عشق کے لطیف مضمون تک محدود رکھی۔ نہ تو فلسفہ کے اَدق مضامین نظم کرنے کی فکر کی ہے اور نہ تصوف کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، ایک صاحبِ دل کی طرح دساتے محبت میں قدم رکھا اس کے بارد بیار کو دیکھ کر خاموشی سے مضمون لیا اور اثر لینے والی طبیعتوں کے سامنے نہایت مزے کے ساتھ پیش کر دیا۔

سائل کی غزلوں میں شوخی اور لطافت ساتھ ساتھ ہیں کلام شگفتگی اور انبساط کا مخزن ہے مگر ابتذال اور عامیانہ پن سے کوسوں دور، معشوق سے چھیڑ چھاڑ بھی ہے

لیکن حفظ مراتب کے ساتھ جہاں اشعار مزے دار گفتگو کا مرقع پیش کرتے ہیں وہاں دلکشی کی حد نہیں رہتی اُن کی پُرگوئی کا یہ عالم تھا کہ سخت سے سخت زمین میں بہت سے شعر کہہ دینا معمولی بات تھی استادی کا یہ حال تھا کہ جس مضمون کو چاہتے نہایت خوبصورتی سے عاشقانہ رنگ میں رنگ دیتے تھے شعر کی مضبوطی اور الفاظ کے دار و بست کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔

سائل کی زبان کا کیا پوچھنا، پُرانی دلّی کی شستہ اور شیریں زبان کا مکمل نمونہ ہے۔ کبھی ثقیل الفاظ لاتے تھے اور نہ کبھی بے لطف ترکیبیں اس وجہ سے روانی اور لطف میں کمی نہیں ہوئے پاتی اس زمانہ میں کم لوگوں کو محاورات پر اتنا عبور ہوگا جتنا سائل کو تھا، ان محاوروں کا برمحل صرف مصرعوں کو نہایت مزے دار بنا دیتا ہے

مومن کی طرح سائل بھی اپنے تخلص سے اکثر فائدہ اٹھاتے ہیں خوبی اس بات کی ہے کہ ہر جگہ لطف قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ رعایت لفظی کی تکرار ایسی پائی نہیں ہونے پاتی کہ سننے والوں کو اُلجھن ہو جائے بلکہ ہر جگہ ایسے مزے کے ساتھ سائل کا لفظ آتا ہے کہ ایک سا لطف پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ کلام میں کہیں کہیں سوقیت بھی ہے، لیکن اس حسن کے ساتھ کہ اس کا کھرا پن تکلیف دہ نہیں ہوتا بلکہ ایسے موقع پر صفائی اور مزے کی آمیزش ایک لطافت کی صورت اختیار کر لیتی ہے افسوس کہ اب تک آپ کا دیوان شائع نہیں ہوا، حالانکہ کلام کی ضخامت اتنی ہے کہ ایک کیا کئی دیوان تیار ہو سکتے ہیں چونکہ آپ کا کلام ابھی تک مستقل کتاب کی صورت میں نہیں ہے اس لئے ہم یہاں چند غزلیں اور اشعار نمونہ کے طور پر نقل کئے دیتے ہیں

وفا کا بندہ ہوں اُلفت کا پاسدار ہوں میں
حریف قمری دیرینہ و ہزار ہوں میں
چمن میں حسن کے ہم نغمہ ہزار ہوں میں
ادا سے تیر لگا دے کوئی شکار ہوں میں

خدا ہُوا نظر آتی ہے جلوہ کی تاثیر
قرار ہو گیا موسیٰ کو بے قرار ہوں میں

خمار حسن سے نہ واقف ہو وہ سرور ہیں آپ
سرور حسن سے نہ آگہ ہو وہ خمار ہوں میں

سما گیا ہے یہ سودا عجیب سر میں مرے
کرم کا اہلِ ستم سے اُمیدوار ہوں میں

عوض دوا کے دعا دے گیا طبیب مجھے
کہا جو میں نے کہ غمِ ہجر سے دوچار ہوں میں

ستم ہائے کر دیا میرا تماشہ اُلفت نے
خزاں کے ہاتھ کی لوٹی ہوئی بہار ہوں میں

قرار دادِ گریباں ہوئی یہ دامن سے
کہ پُرزے پُرزے اگر تو ہو تار تار ہوں میں

مرے مزار کو سمجھا نہ جائے ایک مزار
ہزار حسرت و ارماں کا خود مزار ہوں میں

ن

رفیق کرتے ہیں امداد کیوں مخلص پر
ہُنر کو چھوڑ کے نسبت سے باوقار ہوں میں

ظہیر و ارشد و غالب کا ہوں جگر گوشہ
جناب داغ کا تلمیذ و یادگار ہوں میں

ادب کرتے ہیں عزت مری ہوں وہ سائل
گُلوں کے پہلو میں رہتا ہوں ایسا خار ہوں میں

ساٸل دہلوی

فصلِ گل اب آگئی وحشت کا ساماں دیکھئے
سنگِ طفلاں دیکھئے، چارۂ ساماں دیکھئے
اشکِ خونیں کی بہاریں نوکِ ناخن دیکھئے
دیکھنا ہے آپ کو میرا گریباں دیکھئے
دعوئے آہن گداری میرا گر باور نہیں
تیر کچھ دل میں چبھو کر اُن کے پیکاں دیکھئے
کیوں کسی سے پوچھئے خستہ سری کا ماجرا
قفل کھلوا کر درِ دیوارِ زنداں دیکھئے
عزتِ اہلِ ورع کو دیکھئے گا تا کجا!
اب گنہگاروں کا رنگِ شرمِ عصیاں دیکھئے
ایکساں ہیں جو ہرِ اہلِ سکون و اہلِ درد
صورتِ بلبل بہ نکہت گل کو پریشاں دیکھئے
ناخنوں سے ملتمس ہوں توڑ کر تارِ نفس
کار فرمائے جنوں مسِ رگِ جاں دیکھئے
جائے آسیبِ ہستی ہے اُسی کو مطمئن
ذرہ ذرہ خاک کا جس کی پریشاں دیکھئے
کھل گیا غنچہ کا جامہ پھٹ گیا گل کا دل
آگیا عہدِ درازیٔ گریباں دیکھئے
جامہ زیبی جسم ہے سودائیانِ عشق پر
اختصارِ دامن و طولِ گریباں دیکھئے

عاشق و گلشن[1] کے در کو جا کے کر ساقی بخیر
نوح[2] کے اشعار کا پر جوش طوفان دیکھئے

ہمیں کہتی ہے دنیا زخم دل زخم جگر والے
ذرا تم بھی تو دیکھو تم بھی ہو آخر نظر والے

یہ لبِ پیغام بر پر یا سخن یا نام تھا — آس نا ممکن تھا آنا آج دل کو کام تھا
محتسب تسبیح کے دانوں پہ یہ گنتا رہا — کس نے پی کس نے نہ پی کس کس کے آگے جام تھا
اہلِ محشر دیکھ لوں قاتل کو تو پہچان لوں — بھولی بھالی شکل تھی اور کچھ بھلا سا نام تھا

(۳) یگانہ

مرزا واجد حسین پہلے یاس تخلص کرتے تھے بعد میں یگانہ ہوگئے۔ آپ کے جدِ امجد ایران سے ہندوستان آئے اور سلطنت مغلیہ سے … اس سے سلسلۂ سپہ گری وابستہ ہوئے پرگنہ حوالی عظیم آباد میں جاگیر پائی اور وہیں سکونت پذیر ہوگئے

۱۳۰۱ھ میں مرزا واجد حسین کی ولادت عظیم آباد کے مشہور و معروف محلہ مغلپورہ میں ہوئی۔ مرزا یگانہ کی ابتدائی تعلیم وطن ہی میں ہوئی۔ جب فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو ایسے

---

[1] پروفیسر سید عباس علی صاحب ... ان صاحب الہ آباد میں ہمیشہ آپ ہی کے یہاں مہمان ہوتے تھے
[2] وہ دیوان ہاتھ میں لے کر گلشن کے متعلق یہ غزل پڑھی گئی
[3] نوح ناروی

استاد مولوی سید علی خان بیتاب سے اصلاح سخن لینے لگے کچھ دنوں کے بعد مرزا صاحب کو
حضرت بیتاب نے اپنے استاد مولانا شاد عظیم آبادی کے سپرد کر دیا جن کے فیضِ صحبت
نے سب سے زیادہ مرزا صاحب کی دماغی نشو و نما میں مدد پہنچائی

سنہ ۱۹۰۴ء میں یگانہ مٹیا برج کلکتہ تشریف لے گئے اور وہاں ایسے بیمار پڑے
کہ صحت درست بھی باقی نہ رہی علاج کے لیے لکھنؤ آئے اور ایسے آئے کہ اچھے ہو کر بھی
یہاں سے جانا گوارا نہ کیا بلکہ اسی کو اپنا وطن بنا لیا اور یہیں ایک معزز گھرانے میں شادی کر لی
یگانہ کا لکھنؤ میں قیام کرنا نہایت ہنگامہ خیز ثابت ہوا جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا
ایک وقت میں لکھنؤ کے اکثر شعراء سے اور یگانہ سے شعر و شاعری کے سلسلے میں بے لطفی
ہوگئی افسوس اس کا ہے کہ اس جنگ کا خمیازہ مرزا غالب کو بھگتنا پڑا کچھ ایسے اسباب
ہوگئے کہ یگانہ مرزا غالب سے بھی خفا ہو گئے اور ایسے خفا ہوئے کہ آج تک دل سے غبار
نہ گیا کبھی ایسے اشعار اور مضامین میں اب تک ان کو ایسے الفاظ سے یاد کر لیے ہیں
جن کو سن کر اہلِ زبان کو حیرت ہوتی ہے

یگانہ کی شاعری میں جو چیز سب سے پہلے دل پر اثر کرتی ہے وہ زورِ کلام ہے
بندش کی چستی کے علاوہ بلند مضامین کے لئے ایسے الفاظ لاتے ہیں جو پوری طرح مفہوم کو
ذہن نشین کرا دیں اور خیال کو اُبھار دیں دوسری چیز جو آپ کے کلام میں دلکشی پیدا کرتی
ہے وہ "طنز" ہے یہ عنصر کہیں کہیں اتنا تیز اور تیکھا ہے جو زورِ بیان کا لطف دوبالا کر دیتا ہے

یگانہ کے کلام میں تخیل کی بلندی اور ذہن کی پرواز نمایاں ہے وہ حقائق و معارف
کو خیالات کے عالمِ بالا سے چن کر لاتے ہیں اور نہایت صفائی کے ساتھ اشعار میں پیش
کر دیتے ہیں معنی و مطلب آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں الفاظ اور ترکیب کی پیچیدگی کی بنا
مفہوم اُلجھنے نہیں پاتا "آپ عموماً حسن کو کسی ذات میں تصور کر کے اس کے اثرات نہیں بیان
کرتے بلکہ حسن کو سراپا مجسم ایک مستقل ہستی سمجھ کر حالات کا اظہار کرتے ہیں جس سے مان

میں جدت اور اشعار میں معنویت بڑھ جاتی ہے کلام میں زیادہ تر ہمت افزائی اور جوش
کی لہریں نظر آتی ہیں مصیبتوں میں گھر جانے پر بھی یہی پیام ملتا ہے کہ ہمت نہ ہارنا چاہیئے
ان کے یہاں یاس کے مضامین بھی ملتے ہیں مگر بہت کم ایسے موقع پر اکثر وہ انسانی مجبوریوں
کا ذکر نہیں کرتے بلکہ "فطرت مجبور" پر طنز کرتے ہوئے حسرت کے ساتھ اپنی بے بسی پر
ہاتھ ملتے ہیں

یگانہ کا کلام صفائی اور بے باکی کے اعتبار سے آتش کے کلام کا اکثر دو آتشہ معلوم
ہوتا ہے خیالات میں آتش کے کلام سے زیادہ بلندی ہے مگر کیف و سرمستی کا وہ عالم نہیں
جو خواجہ آتش کے یہاں ہے حسن و عشق کے وہ واردات جو محبت کی عملی زندگی میں پیش آتے
ہیں ان کی بہت کمی آیات وجدانی (دیوان یگانہ) میں نظر آتی ہے جس کی وجہ سے ایک
گونہ دلچسپی میں کمی ہو گئی ہے۔ بلند خیالی کی تلاش نے تغزل کا عنصر کافی نہیں پیدا ہونے
دیا۔ بلکہ جوش اور جدت بیان نے غزلوں میں بھی ایک حد تک نظم کا انداز بیان پیدا
کر دیا ہے

یگانہ فارسی ترکیبوں کے دل دادہ ہیں اکثر تشبیہوں کی جدت سے طرز بیان میں
تازگی پیدا ہو جاتی ہے زبان صاف و شیریں ہے زیادہ تر فارسی و عربی کے الفاظ استعمال
ہوتے ہیں مصرعے نہایت چست ہوتے ہیں بندش الفاظ سے اشعار میں ایک خاص ابھار
پیدا ہو جاتا ہے

رباعیات میں یگانہ نے ایک اجتہاد کی کوشش کی ہے کہ اور شعراء سے اُن کا
رنگ الگ ہو جائے مگر قبول عام میں رکاوٹیں اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ الفاظ اور محاورے
ایسے آ گئے ہیں جو ترشے ہوئے نہیں ہیں اور جن پر زبان کی صفائی نے ابھی تک جلا نہیں کی
(یا یوں سمجھئے کہ جن کو انگریزی میں سلینگ (SLANG) کہتے ہیں) اُردو میں "سلینگ" کا استعمال
ابھی تک بہت کم ہوا ہے غالباً اکبر الہ آبادی اور ظریف لکھنوی کے علاوہ اس کی نمایاں مثال

اور کہیں نہ ملے گی یگانہ کے "سلینگ" ہیں اور اکبر و ظریف کے سلینگ میں یہ فرق ہے کہ یگانہ
کا مقصد محض ظرافت و تفریح نہیں ہے بلکہ روزمرہ بات کہنا ہے اور ادبی طور پر غیر مستعمل الفاظ
و محاورات کی پذیرائی کے امکان کو نمایاں کرنا ہے جملہ باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی
نہیں کہنے میں تامل ہے کہ یگانہ کی رباعیاں سرے سے ناکامیاب ہیں

فراق

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپور کے رہنے والے ہیں وہیں ۱۸۹۶ء میں پیدائش ہوئی
آپ کے والد منشی گورکھ پرساد عبرت مشہور وکیل اور اچھے شاعر تھے
فراق کی ابتدائی تعلیم گھر پر اردو سے شروع ہوئی، سات سال کے تھے کہ انگریزی
تعلیم کے لئے اسکول میں داخل کر دیئے گئے ذہین تھے اسی وجہ سے ہر درجہ میں نمایاں کامیابی
حاصل کرتے رہے بی اے میور سنٹرل کالج الہ آباد سے امتیاز کے ساتھ پاس کیا گورنمنٹ
نے فوراً ڈپٹی کلکٹری کے لئے منتخب کر لیا مگر قبل ڈپٹی کلکٹر بننے کے آپ کانگریس میں شریک
ہو گئے اور مجلسے درود کو حاصل جانے پیچھے کے خود جیل چلے گئے
فراق کا ذوق شاعری اس وقت زیادہ بڑھا جب وہ الہ آباد تحصیل علم کے لئے آئے
یہاں کی فضا میں رہا سہا شاعرانہ ماحول دیکھا تو خود شعر کہنے کی امنگ دل میں پیدا ہوئی ادب
کے چرچے اور پروفیسر ناصری کی دلکش صحبتوں نے فراق کے دل میں دبی ہوئی آگ کو روشن
کر دیا جب بی اے کلاس میں آئے تو پہلی بار آپ نے غزل لکھ کر ناصری کی خدمت میں
برائے اصلاح پیش کی ناصری نے نہ صرف غزل پر اصلاح دی بلکہ اردو شاعری اور اس
کے اصول پر باقاعدہ لکچر دیئے جو فراق کی راہِ شاعری میں شمع ہدایت ثابت ہوئے
چند دنوں تک ناصری صاحب کی صحبت نہ رہی اور آپ نے وسیم خیرآبادی سے

اصلاح لینا شروع کی

شعروشاعری کا چسکا اب گویا فراق کے دم کے ساتھ تھا جیل چلے گئے تو وہاں بھی یہ سلسلہ جاری رہا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قید خانہ شعروشاعری کا مدرسہ ہو گیا' یہاں نہ صرف شعراء سے ملاقات ہوئی بلکہ علم دوست احباب سے برابر صحبتیں رہیں مدآح 'عارف ہسوی حکیم آشفتہ' مولانا محمد علی' حسرت موہانی' مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی آئے دن کی صحبتوں نے بزم سخن کی گرم بازاری میں اور زیادہ مدد کی ایک غزل میں کہتے ہیں سہ

اہل زنداں کی یہ محفل ہے ثبوت اس کا فراق
کہ بکھر کر بھی یہ شیرازہ پریشاں نہ ہوا

۱۹۲۷ء میں جب فراق قید سے چھوٹ کر آئے تو کرسچین کالج لکھنؤ میں ملازم ہو گئے پھر اس کے بعد سناتن دھرم کالج کان پور نے اردو پڑھانے کے لئے بلا لیا اس درمیان میں آپ نے ایم. اے پاس کر لیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہو گئے اب آپ کا مستقل قیام الہ آباد میں ہے

فراق کی ابتدائی غزلوں میں امیر مینائی کا رنگ جھلکتا ہے لیکن اس سے ذرا بعد میں عزیز لکھنوی کا رنگ نظر آتا ہے کچھ عرصہ کے بعد میر کے کلام کا فراق پر اثر پڑا اور اُن کی تقلید کرنے لگے مگر اب موجودہ حالت میں ان کا خود ایک رنگ ہو گیا ہے جس میں الفاظ کی تلاش فقروں کی برجستگی اور مضمون و بیان کی ہم آہنگی خاص طور سے نمایاں ہیں ان کی غزلوں میں اکثر کیفیات کا تدریج' محسوری حیات کے اظہار نا سعد' غم انگیز پہلو کی ترجمانی قابل دید ہے جذبات نگاری میں رقت فکر کا عنصر شامل کر کے فراق نہ صرف تاثیر کلام میں اضافہ کر دیتے ہیں بلکہ معنویت بھی ملی نظر آتی ہے ان کی نظر جذبات نگاری سے گزر کر کبھی کبھی جذبات کی نفسیات و حقیقت پر بھی پڑتی ہے جو اُردو ادب میں ایک خاص چیز ہو جاتی ہے

۱ فراق کا سرچشمہ معانی ادب خاص کر ڈرامہ و ناول وغیرہ کا مطالعہ ہے

غزلوں کے علاوہ فراق نے نظمیں بھی کہی ہیں کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کی شہرت کی باعث غزلیں ہیں جو اپنی معنویت، طرزِ تخیل اور اظہارِ خیال کی ندرت کی وجہ سے اردو ادب کے لئے ایک خاص سرمایہ ہو گئی ہیں اس کارنامہ کی وجہ سے فراق نے اپنی جگہ اردو کے صفِ اول کے شعراء میں قائم کر لی ہے کوئی دس سال سے فراق نے رباعیات پر زورِ فکر صرف کرنا شروع کر دیا ہے اس صنف میں بھی انھوں نے گل بوٹے کھلائے ہیں فراق کی غزلوں کی جھلک ان کی رباعیوں میں لطیف انداز سے نظر آتی ہے جہاں کہیں اس صنف میں حقائق بیان کرتے ہیں وہ نہایت بصیرت افروز ہو جاتے ہیں لیکن باوجود اس کے ان کی شہرت کا باعث ان کی غزلیں ہیں جو ان کو صفِ اول کے شعراء میں جگہ دلاتی ہیں

تلوک چند محروم

ہرچند ۱۹۰۵ء سے محروم اردو کے رسالوں میں اپنا کلام بھیج کر دادِ تحسین لے رہے تھے لیکن ان کے مجموعۂ کلام کے شائع ہو جانے کے بعد سے اور بھی لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر بڑھ گئی ہے انھوں نے گوناگوں مسائل پر طبع آزمائی کر کے اپنی وسعتِ نظر کا بہت بڑا ثبوت دیا ہے اور ایک خاص طرز کو رواج دیا ہے ان کے کلام میں ادبی، اخلاقی اور نیچرل مضامین کا ذخیرہ شامل ہے، اکثر انگریزی فارسی کے پاکیزہ خیالات کو اردو کا جامہ پہنا کر ان کو مالدار بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے

محروم کے یہاں یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان کے بعض مشاہیر کے حالات مثلاً بدھ، سنت دیو وغیرہ نہایت خوبی کے ساتھ عنوانات سے بیان ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے جواب جہانگیر، نور جہاں کا مزار، مرزا غالب، مہاتما بدھ، سیتا جی کی فریاد وغیرہ قابلِ دید نظمیں ہیں غالباً اسی خوبی سے متاثر ہو کر سر عبدالقادر نے کلامِ محروم کے متعلق تحریر فرمایا ہے

کہ اس میں صلح و محبت کی تلقین ہے ٗ دنیا کے سب سے بڑے بڑے ہی مینیتواؤں کی خوبیاں مخدوم کے پیش نظر ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان والے سب کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور ان کی پیش بہا زندگیوں سے سبق حاصل کریں۔ منظر نگاری کے وقت مخدوم کردار کی اہم خصوصیات نہایت خوبی سے بیان کرتے ہیں جس سے نہ صرف ان کی دقت نظری کا پتہ چلتا ہے بلکہ شعر میں بھی دلکشی کا اضافہ ہو جاتا ہے

غم والم کے جذبات مخدوم اس خوبی سے نظم کرتے ہیں کہ یاس ودرد کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے جو دل کو ایک خاص کیفیت سے متاثر کئے بغیر نہیں رہتی جدا جانے ان کا دل کس مٹی سے بنایا گیا ہے کہ بقول مرعبدالقادر" بہار ہو یا خزاں قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر ان کے دل کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے "

تمام کلام پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخدوم کو زبان کی صفائی طرز بیان کی سنجیدگی کا بہت زیادہ خیال رہتا ہے صفائی و پختگی کے پھول ہر جگہ اشعار میں باعث زینت ہیں مذاق سلیم اور زبان پر عبور ہونے کی وجہ سے پختگی و روانی کلام میں عام طور سے نمایاں ہیں بحروں کے انتخاب میں بھی روانی و شگفتگی کا خاص لحاظ معلوم ہوتا ہے جس سے الفاظ کی سجاوٹ سے ترنم دلکشی پیدا کر کے دلوں کو در تک مسحور رکھا جاتا ہے

منظر نگاری کے وقت مخدوم کا قلم مصور کے قلم سے کم نہیں بلکہ اور زیادہ تصویر کشی کا کام کرتا ہے کلام کی رعنائی اور بحروں کی شگفتگی کی وجہ سے ان تصویروں میں ایک خاص دلکشی پیدا ہو جاتی ہے اور خود بخود ایک وجدانی کیفیت دلوں پر طاری ہو جاتی ہے۔ معمولی مناظر مظاہر قدرت پر بھی اس خوبی سے خامہ فرسائی کرتے ہیں کہ ان کی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے

مخدوم اکثر بے جان چیزوں اور مناظر قدرت کے تمولی کرشموں میں روحانی تعلیم وتسکین قلب کا اثر محسوس کرتے ہیں جس کا ذکر وہ نہایت پر کیف اور پر لطف طریقہ پر بیان کرتے ہیں

لے دیوان گنج معانی سے

آنند نرائن ملّا

آنند نرائن ملّا[1] کشمیری ہیں۔ کشمیریوں کی ذہانت اور جمالیاتی احساس کو دنیا جانتی ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترقی میں ان کا جتنا حصہ ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ آنند نرائن ملّا کے والد پنڈت جگت نرائن ملّا لکھنؤ کی مشہور شخصیتوں میں سے تھے۔ ملّا ۱۹۰۱ء یعنی بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ پیدا ہوئے۔ جوبلی اسکول اور کیننگ کالج کی انگریزی تعلیم کے علاوہ اردو اور فارسی گھر پر پڑھی۔ انگریزی میں ایم اے کرنے کی وجہ سے انھیں عالمی ادب کے رجحانات و میلانات سے بھی واقفیت کا موقع ملا۔ وکالت اس لیے اختیار کی کہ آبائی پیشہ تھا۔ اور اس میں بھی امتیاز حاصل کیا مگر ملّا کی سلامتِ طبع کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ وکالت کے ہو کر نہ رہ سکے اور نہ کلب اور جدید سوسائٹی کی تفریحات ان کے دل کی خلش اور دردمندی کو مٹا سکیں۔ فی الحال (۱۹۵۵ء) میں وہ الہ آباد ہائی کورٹ کے جج ہیں۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی ملّا لکھنؤ کے کسی شاعر سے زیادہ متاثر نہیں ہیں، نہ دے کے چکبست کا کچھ رنگ ہے ورنہ وہ غالب اور اقبال سے زیادہ متاثر رہیں۔ انھوں نے کسی سے باقاعدہ اصلاح بھی نہیں لی اور صرف اپنی انفرادیت کو سہارا بنایا۔ ملّا کے یہاں اس طرح لکھنؤ کے عام ماحول سے بغاوت ملتی ہے مگر لکھنؤ کی تہذیب کے اثرات ان کی شخصیت اور مزاج میں ایک نکھرے اور ستھرے رنگ سے ملتے ہیں۔ دنیا نے اس سے اچھا سلوک کیا۔ انھیں خالی جیب اور ٹوٹے ہوئے دل ہی پر قناعت نہ کرنی پڑی جو ایک نقاد کے الفاظ میں شاعروں کو خوب راس آتی ہے۔

"انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں انیس، غالب اور اقبال کے اشعار کے ترجمے

[1] دیباچہ جوئے شیر (دیوانِ ملّا، از آل احمد سرور)

کئے اور انگریزی میں کچھ نظمیں کہیں۔ پنڈت منوہر لال زتشی کے اشارے سے اس ذہنی آوارگی کو ایک فطری راستہ مل گیا اور انھوں نے اُردو شعر کہنے شروع کئے۔ مُلاّ کی شاعری میں حُسن و عشق، انسان دوستی اور نئی دنیا کے محور ملتے ہیں۔ ان کی شاعری ہمارے ادب کے تمام صالح میلانات کی آئینہ دار ہے اور ان کی شخصیت ہماری تہذیب کی وسیع المشربی اور ہمہ گیری کی ایک زندہ اور تابندہ تصویر۔"

مُلاّ کی غزلوں میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہے۔ ایک خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ وہ اظہارِ عشق کرتے ہیں اور امتیازی پہلو ان کی غزلوں کا یہ ہے کہ معنویت سے لہجہ کا اُبھار اتنا ہم آہنگ ہوتا ہے کہ دل و دماغ یکساں متاثر ہوتے ہیں۔ اسی انداز بیان کا اثر یہ ہے کہ سپردگی و وارفتگی کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ جائے عشق میں کھو جانے کے وہ عشق کے وقار و آداب کو غزلوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بایں ہمہ اُن کی غزلوں میں تازگی اور رنگینی ضرور ہے۔

مُلاّ نظم کہنے پر بھی قادر ہیں، اگر اُن کے دیوان "جوئے شیر" کا مطالعہ کیجئے تو ایک نظمیں پُراثر و قابلِ قدر نظر آئیں گی۔ سیاسی، سماجی اور رومانوی نظموں کی اُن کے یہاں کمی نہیں، لیکن جوش و ولولہ کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ طنز اور شدید احساس کا جہاں کہیں اظہار ہوتا ہے وہ ان نظمیں بڑی دلکش ہو جاتی ہیں۔ نظموں میں بھی مُلاّ بلا کی تخیل اور باریک بینی سے کام لیتے ہیں، اقبال کی طرح وہ بھی معمولی باتوں کو، عام مناظر کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ فلسفہ و فکری عنصر ان کی نظم کو وسیع بنا دیتے ہیں۔

مُلاّ کی زبان بڑی رچی ہوئی زبان ہے۔ فارسی محاورات اور تراکیب نہایت خوبی کے ساتھ برمحل استعمال کرکے لب و لہجہ کو بڑی انفرادیت عطا کر دیتے ہیں۔ مسدس پر مُلاّ کو خاص قدرت حاصل ہے۔ عموماً اسی شکل میں ان کی نظمیں بیشتر ہیں۔ مجموعی حیثیت سے مُلاّ کے کلام میں بڑی پختگی و روانی ہے۔

حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری ۱۹۰۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شمس الدین حافظِ قرآن
تھے چنانچہ حفیظ نے بھی پہلے قرآن ہی پڑھا پھر انگریزی تعلیم کے لیے گھر والوں نے اسکول بھیجا لیکن
وہ ساتویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکے۔ ابتدا ہی سے حفیظ کو شعر و شاعری کا چسکا لگ گیا تھا
اس لئے انگریزی زیادہ نہ پڑھ سکے شعر و شاعری کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا محنت مزدوری کر کے پیٹ
پالتے رہے لیکن بہت قلیل عرصہ میں اپنی شاعری کا سکہ ملک میں رواں کر دیا۔ شاہنامہ اسلام لکھ
کر ایک خاص شہرت کے مالک ہو گئے۔ کلام کو قبول عام کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ فردوسی نے
محمود غزنوی کے اشارے سے شاہنامہ لکھ کر ایران کے بادشاہوں کی عظمتوں کو پھر سے زندہ
کرنے کا جو کام انجام دیا تھا وہ سب پر ظاہر ہے۔ حفیظ نے اپنے مذہبی جذبات سے
متاثر ہو کر اسلام کی قدیم عظمت و جذبات کو از سر نو لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے
جس میں شاعرانہ حیثیت سے بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ شاہنامہ شاعری اور اردو کی تاریخی
روایتی واقعات کو نظم کرنا اور سلاست و سرعت سے محفوظ رکھنا اس میں منظر نگاری کے ساتھ ساتھ
ایک خاص آن بان اس کام کے لئے درکار ہے۔ حفیظ قابلِ ستائش ہیں کہ اس مہم کو بڑی خوبی
سے سر کر گئے ہیں۔ اسلامی تاریخ کا [illegible] کی لہر بھی دوڑا دی ہے جس سے کلام میں ایک عظمت
و دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ واقعات دلنشیں ہو جاتے ہیں اور بیانات پُر اثر

شاہنامہ اسلام کے علاوہ ان کی نظموں کے اور مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں مثلاً
نغمہ زار، سوز و ساز جن میں علاوہ اور چیزوں کے [illegible] کیف و روانی کی ہے
جس کے بہاؤ میں [illegible] کو بار ساز کے لئے [illegible]
کا خاص خیال رکھا گیا ہے جن کی خاص خوبی ترنم آفرینی ہے، [illegible] کی لطافت، ملک کے مقامی

اثر نے ان نظموں کو ایک خاص انفرادیت عطا کر دی ہے۔ سنجیدگی و سرشاری کی روانی ان کے کلام کے مخصوص جوہر ہیں جو دل و دماغ کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ غالباً ان ہی خصوصیات کے بیان کرنے کی فکر، تخیل میں بلند پروازی اور کلام میں عمق نہیں پیدا ہونے دیتی جس کی کمی کبھی کبھی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔

تعجب ہے کہ جو شخص نظم کے میدان میں اتنا بے فکر و غم دنیا کو ہر قدم پر ٹھکرا کر مستانہ وار گزر جاتا ہو وہ غزل کی دنیا میں بالکل قنوطیت، دردمندی و مایوسیوں کا شکار نظر آئے۔ غالباً سوز و گداز کی فکر جو غزل کے لئے لازمی سمجھے جاتے ہیں ان کو اس بیان پر مجبور کرتے ہوں۔ بسط کی غزلوں میں درد و گداز بہت کافی ہے۔ زبان نہایت نرم و صاف ہے جو غزل کے لئے پوری طرح موزوں ہے۔

حفیظ کے گیت بھی بڑے موثر ہیں، خصوصاً بحروں کی دلکشی کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اسی وجہ سے اثر اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ نرم و شیریں الفاظ کو سادگی کے ساتھ سلیقے سے جوڑ کر گیت کو سراپا نغمہ بنا دیتے ہیں۔ ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح، شہسوار کربلا، اٹھو ایسی نظمیں ہیں جن کو پڑھ کر حفیظ کی نظم نگاری کی صلاحیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ سیاسی، تاریخی، مذہبی اور مجلسی کارناموں میں مسرت نگاری، صداقت و شریت کا ایک جگہ ایسا کامیاب معیار ہے جو ہر شخص کا کام نہیں۔

سیماب

سید عاشق حسین نام، سیماب تخلص ۱۸۸۰ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم [illegible] میں ایک اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد کالج کی تعلیم شروع ہوئی۔ ابھی ایف اے میں تھے کہ والد کے انتقال نے سلسلہ تعلیم قطع کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۸۹۹ء میں داغ سے تلمذ حاصل کیا

اس وقت سے شعر و شاعری کی طرف زیادہ انہماک ہوا۔ آپ کا کمال دیکھ کر مختلف لوگ، مختلف اطراف سے فخرِ شاگردی حاصل کرنے لگے علمی مشغلہ زور کے ساتھ جاری ہوا چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے ہیں

"تصنیف و تالیف کا شوق مجھے عہدِ طفولیت سے ہے اس وقت تک (۱۹۳۵ء) ۲۸۴ کتابیں مختلف موضوعات پر میرے قلم کی رہینِ کشش ہیں۔"

اپنے شاعرانہ معتقدات کو ایک مقام پر خود تحریر فرماتے ہیں " اوائل مشقِ سخن تک مجھے قدیم تغزل سے دلچسپی تھی لیکن زمانے کے ساتھ علم و معلومات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا رنگِ قدیم سے لگاؤ کم ہوتا گیا اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی خدمات کی ترجمانی کا حامی ہوں میں شاعری میں فلسفہ حقائق و معارف کے نکات پسند کرتا ہوں میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت اور اس کے متعلقات ہوں جو امرد پرستی کے تعیات پر مشتمل ہو میری شاعری کا موضوع حسن محض اور عشق محض ہے، میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں"

سیماب کے یہاں جذبات سے زیادہ خیالات اور فلسفہ کے مضامین آپ کو ملیں گے وہ انگریزی شاعری کے بورب ورڈز ورتھ اور حالی کے کلاسیکی اسکول سے زیادہ ملتے ہیں لیکن سادگی کی اُن کے یہاں کمی ہے جو ورڈز کی ممتاز صفت ہے وہ اگرچہ اختصار پر رہنا چاہتے ہیں تو ان کی کوشش کا عنصر نمایاں ہو جاتا ہے

آپ کا کلام علاوہ اور خوبیوں کے زبان کی لطافت اس کی تکمیل کی پوری تصویر ہے۔ آپ کا دوسرا مجموعہ "کارِ امروز" نظموں کا ذخیرہ ہے جس کے دیکھنے سے آپ کی وسیع النظری اور ہندوستان بلکہ دنیا کے ہمہ گیر مسائل سے دلچسپی کا ہر جگہ ثبوت ملتا ہے آپ کی متانت و سنجیدگی کی وجہ سے نظموں میں جوش و حرارت زیادہ نہیں پیدا ہو سکا مگر ان کا یہ صاف پتا چلتا ہے کہ ہر طبقہ و مسئلہ پر آپ کی نظریں باقاعدہ اور اسی سے پڑی ہیں سیماب کا انتقال ۱۹۵۱ء میں کراچی میں ہوا

فطرت واسطی

اُردو کی نظموں میں جب حالی و آزاد، اکبر وغیرہ کے بعد نوجوان شعراء کو نئی شاعری کی ضرورت محسوس ہوئی تو لطافت و رنگینی کے ساتھ اپنے محسوسات کو پیش کرنے کی فکر ہوئی۔ فطرت واسطی بھی اُن ہی لوگوں میں نمودار ہوئے۔ فطرت نے مختلف مناظر اور حسن و عشق کے متعدد مظاہر ایک خاص لطف کے ساتھ قلم بند کرنے لگے۔ ان کی شاعری ہندوستان کے متوسط طبقہ کے جذبات کی ترجمانی تھی چنانچہ اُن کے کلام کا مجموعہ "حدیث ..." قدم قدم پر اس کا ثبوت دیتا ہے۔ حسن و شباب، رنگ و نور، ادب و خواہش اُن کے کلام کی جان ہے۔ محبت کی داستان ہو یا منظر نگاری، وہ تشبیہات و استعارات کا ایسا جلسی دیباچہ لاتے ہیں جو اسی گوشت و پوست کی محبت اور مجازی ملکہ نسوانی حسن سے جلی ہوتی ہیں۔

فطرت کی زبان نہایت پاکیزہ اور پُراثر ہوتی ہے۔ وہ تشبیہ و استعارے میں بھی جدت پیدا کرتے ہیں۔ بحروں کے انتخاب میں بڑی کاوش سے کام لیتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ پورا کلام عمو راشمس ہو جاتا ہے۔ استعارہ میں درد و سردگی بہت کافی ہے۔ انھوں نے انگریزی صنف شاعری سانیٹ کو بھی اُردو میں متعارف کرانے کی کوشش کی لیکن باوجود کاوش اور محنت کے اُردو شاعری میں یہ صنف مقبول نہ ہو سکی۔ فطرت کی نظموں میں تغزل اور ... کا رنگ دلکشی کا باعث ہے۔

فطرت کے مجموعۂ کلام میں ایک کمی خاص طور پر محسوس ہوتی ہے یعنی غم جاناں کے سوا غمِ دوراں کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ ملکی و قومی مسائل پر جیسے فطرت کی نظر ہی نہیں، حسن و شباب کی مصیبتوں میں دیکھ کر فطرت کا حسن پرست دل بے چین ہو جاتا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک مخصوص حد تک وہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ عوام سے اس احساس کا کوئی واسطہ نہیں اور اسی کمی نے غالباً ان کو

شاعری کی دنیا میں اس فروغ سے محروم رکھا جس کے وہ مستحق ہو سکتے تھے کیونکہ اُن کو زبان و بیان پر
ایسا عبور تھا کہ اُن کے ہم عمر شاعروں میں کم لوگوں کو رہا ہوگا اب ادھر پانچ سات برس سے
تو ایک خرابی اور اُن کی ترقی میں سدِّ راہ ہو گئی ہے اُن کا کلام کہیں دیکھنے میں نہیں آتا شاید وہ
کچھ کہہ نہیں رہے ہیں حالانکہ ابھی اُن کو ترکِ شاعری سے گریز کرنا تھا کیونکہ عمر زیادہ
سے یہ کلام ۔

مجازؔ

۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک علی گڑھ یونیورسٹی میں ترقی پسند طلبا کا ایک گروہ موجود تھا
جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز حاصل کیا مگر ادب کی طرف سب سے زیادہ توجہ
کی ان نوجوان ادیبوں اور شعراء میں مجازؔ کی کافی اہمیت ہے یونیورسٹی سے بی اے پاس کرنے
کے بعد کچھ دنوں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اور پھر کچھ دنوں حکومتِ بمبئی کے محکمہ اطلاعات
میں ملازم رہے پھر حلقۂ ادب لکھنؤ کے سرگرم کارکنوں اور "نیا ادب" کے ادارہ میں رہنے
کے بعد ہارڈنگ لائبریری دہلی میں ملازم ہو گئے

آج کل کی دنیا میں رہ کر کوئی حساس شخص یا ادیب ہو نہیں سکتا جو اپنے ماحول سے
متاثر نہ ہو، ملک کی بڑھتی ہوئی، متوسط طبقہ کی ابتری، بے روزگاری کا بھوت جو تعلیم یافتہ
نوجوان کو ڈرا رہا ہے روز مرہ کی جنگ اور خون بہنا اور اسی طرح سینکڑوں ایسی چیزیں
ہیں جن کو دیکھ کر ہر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایسا ہیبت ناک منظر ہمیں اس
نظام کے بدل دینے کے لئے دعوتِ عمل دیتا ہے ایک حقیقت نگار شاعر کا دل ان چیزوں کا
اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا مجازؔ بھی اس ہیبت ناک سماج کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور
دعوتِ انقلاب دیتے ہیں وہ بیداری کا پیغام سناتے ہیں اور ہمیں اس فرسودہ نظام کے

خلاف جنگ کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہیں

مگر اپنی شاعری کے ابتدائی دور سے گزر کر مجاز نے محسوس کیا کہ شاعری کا مقصد خطیبانہ نظمیں لکھنا ہی نہیں ہے۔ ایک فنکار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اردگرد کی حالات کا مطالعہ کرے انہیں سمجھنے کی کوشش کرے اور ان باتوں کے اثرات جو جذبات کو برانگیختہ کر دیتے ہیں انہیں ایک پیکر لطیف میں سامعین کے سامنے پیش کرے۔ مجاز نے ڈرامائی رنگ میں شعر کہنا شروع کیا وہاں اٹھ کر ملا، مثلاً [illegible] سر اٹھا [illegible] کھڑکی کی دنیا [illegible] دامن [illegible] اپنے جذبات کو اس طرح بیان کرنے لگے کہ ان میں گہرائی آگئی

یہ کہنا غلط [illegible] کہ مجاز [illegible] مقصود [illegible] کا [illegible] لیکن کچھ [illegible] آزادی کے بعد [illegible] ان کی [illegible] شاعری [illegible] شاعری کی [illegible] ایک [illegible] ان کے کلام [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] عوام کے [illegible] مسائل [illegible] تہذیب و تمدن کی [illegible] کا [illegible] نہیں [illegible] کے آرام اور ملازمت [illegible] اگرچہ [illegible] کے [illegible] کی [illegible] اردو شاعری میں [illegible] مجاز کے [illegible] کے ساتھ اس قسم کی شاعری آئی وہ [illegible] رومانیت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے وہ نوجوان طبقے کے جذبات [illegible] کے جذبات [illegible] اور [illegible] کے [illegible] سچائی اور [illegible] کے ساتھ بیان کرتے ہیں [illegible] کے ہیتناک مناظر یا سرمایہ داری کے ظلم کا [illegible] کھینچتے ہوئے بھی [illegible] کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے اُن کے کلام میں روانی [illegible] اور [illegible] بہت ہے

ان کی رومانی نظموں میں ایک خاص ربودگی ہے۔ ایک [illegible] ناامیدی اسے کو فنا کرنے کا جذبہ اور قنوطیت کے عناصر ان میں بہت کم ہیں۔ جوانی کی سرمستی اور

آہنگی ان کے کلام کو ایک خاص دلکشی بخشتی ہیں

مجاز کے کلام کا مجموعہ ۱۹۱ء میں "آہنگ" کے نام سے شائع ہوا اور کافی مقبول ہوا ان کی کئی نظمیں مثلاً "رات اور ریل" "آوارہ" "اندھیری رات کا مسافر" وغیرہ اردو داں نوجوان جماعت کی زبان پر ملیں گی ۱۹۴۵ء میں اپنے پرانے مجموعے "آہنگ" میں کچھ نظموں کا اضافہ کرکے اُسے "شب تاب" کے نام سے شائع کر دیا ہے اور اسی طرح ایک مجموعہ اور نکالا ہے جس کا نام "ساز نو" رکھا ہے۔ مجاز کا انتقال ۱۹۵۵ء میں بمقام لکھنؤ ہوا۔

روِش

روش جوالاپور ضلع سہارنپور کے رہنے والے ہیں اور شاہد عزیز نام ہے آپ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے گھر پر اردو فارسی اور انگریزی سے واقفیت پیدا کی اور اپنے والد سے مشورہ سخن کرنے لگے

رومانی شعرا میں روش کو خاص اہمیت حاصل ہے آپ ایک نظم گو شاعر ہیں ان کی نظمیں شیرینی اور لوچ کے علاوہ اپنے ترنم کے لئے بھی مشہور ہیں۔ نظموں کا پیرایہ عموماً ترجیع بند کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ طرز روش کی شاعرانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے کیونکہ اُن کے خیالات و جذبات کے پیچ و خم کو پوری طرح ادا کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور شکل نہیں ہو سکتی تھی ایک مصرعہ کو بار بار آنے سے ایک تکرار پیدا کرتا ہے اور یہ تکرار ایک خاص حسن پیدا کر دیتی ہے۔

روش کی شاعری میں مذہبی جذبات و تاثرات کا غلبہ ہے حالانکہ ان کی شاعری بنیادی طریقہ سے دور جدید کی پیداوار ہے اور طبقہ متوسط کی (یہی) رومانی زندگی میں جو مشکلات پڑی ہیں وہ بڑے عمدہ شاعرانہ انداز سے روش کے یہاں بیان ہو جاتی ہے ہمارے سماجی جکڑ بند کے ٹوٹنے کی آواز اس میں بھی صاف سنائی دیتی ہے

روش کی شاعری میں سیاسی تخیل زیادہ پر زور نہیں ہے آواز بازگشت کی طرح صدائیں آتی ہیں انقلاب کے نعرے سنائی دیتے ہیں، فریاد کی آوازیں آتی ہیں مگر ہماری سیاسی شاعری جوش و مجاز وغیرہ کے ہاتھوں اس سے آگے بڑھ چکی ہے کہ اب اس قسم کی آوازیں داستانِ پارینہ ہو کر رہ جاتی ہیں، سیاسی دنیا میں انقلاب کا تخیل، اتنا زیادہ حقیقت پسند و صاف ہو چکا ہے کہ روش کا نظریہ اس کے سرا سر منافی سمجھا جاتا ہے

روش کی شاعری کا امتیازی پہلو نرم و لطیف الفاظ و تشبیہات کی بہتات ہے اُن کی نظموں میں تغزل و روانی خاص طور پر قابلِ قدر خصوصیات ہیں محبت کی دنیا میں سرشار ہونے کی کیفیت کو اتنی خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ کم لوگ اُن کے مقابلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں

احسان دانش

احسان الحق کا خاندانی وطن باغپت ضلع میرٹھ ہے لیکن آپ کے والد قاضی دانش علی نے کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں سکونت اختیار کر لی تھی یہیں ۱۹۱۴ء میں احسان الحق کی پیدائش ہوئی اب عموماً لاہور میں رہتے ہیں آپ نے افلاس کی آغوش میں آنکھ کھولی اور اسی کے زیر سایہ پل کر جوان ہوئے ہمت و استقلال نے رہبری کی اور آپ نے مزدوری، معماری، باغبانی اور پہرہ داری کی سخت منزلوں سے گزر کر بھی دنیائے شاعری میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی ہے

ذاتی تجربہ کی وجہ سے احسان مزدوروں اور مفلسوں کی ایسی عبرتناک تصویر پیش کرتے ہیں کہ بعض اوقات آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں واقعات و مناظر کو ہو بہو پیش کرنا آپ کا امتیازی پیرایہ بیان ہے تصویر کشی بھی وہ ایک فنکار کی طرح کرتے ہیں اور تصویر کے خدوخال اس طرح نمایاں کرتے ہیں کہ ضرورت و خواہش کے مطابق اثر کم یا زیادہ ہوتا

رہتا ہے۔ اگر اس اثر کو زیادہ تیز کرنے کے لئے احسان ایک بہت دلکش تمہید یا پس منظر دے کر
مفلسی کی کوئی دلسوز تصویر پیش کرتے ہیں یا امیروں کی عیش و شادمانی کے مقابلہ میں غریبوں
کی بے کسی اور حرماں نصیبی دکھاتے ہیں یا کبھی فطرت کی مسرت بخش آغوش میں کسی مصیبت زدہ
کو اس طرح دکھاتے ہیں کہ تمام کائنات روئے رنج زدہ ہو جاتی ہے

احسان نے جو کچھ محسوس کیا اسی سب سے آپ تک پہنچانے کی کوشش کی اب
ان کا ایک کا کیا علاج ہو یہ آپ خود سوچئے اس علاج کے لئے وہ چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے
ہیں، کبھی خدا سے دریافت کرتے ہیں کبھی اقبال کی بات مانتے ہیں کبھی جوش کی طرف جھکتے ہیں
کبھی خود ہی انفرادی ترقی کو موت سمجھ کر غریبی کا علاج علم میں تلاش کرتے ہیں کبھی اصلاح پسندوں
سے کہتے ہیں کہ بے روزگاری کا علاج کرو ورنہ سنا ہے بھوکے لوگ انقلاب لے کر اٹھیں گے

احسان کی کوئی باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی انہوں نے بڑی عمر ریزی کے بعد مزدوری
سے وقت بچا کر جتنا ممکن ہو سکا خود علم حاصل کیا اس لئے ان کے خیالات منظم نہیں ہو سکے وہ
رسمی و مذہبی قیود سے باہر نکل کر حیات و سماج کے سارے مسائل پر علمی و تحقیقی نگاہیں نہیں
ڈالتے اسی جمالی اُبھار کی وجہ سے وہ اپنے طبقاتی تعلق کی اہمیت کو زیادہ نہیں سمجھے
جو کہتے ہیں "میری ادب ہے پر آنکھیں کھلی ہیں اور قائلیں پر دم نکلے گا"

احسان انقلاب تو ضرور چاہتے ہیں لیکن اس کا تصور بالکل مذہبی اور کبھی کبھی بالکل
رومانی ہوتا ہے ان کا انقلاب کسی طبقاتی کشمکش کا نتیجہ نہیں ہوتا کبھی مشیت ایزدی پر مبنی
تو کبھی کسی ایک باغی کا خواب ہوتا ہے اور اس میں بے ظالم، سفاک، دھوکے باز، جاگیردار،
سرمایہ دار، مُلّا، لیڈر، یہاں تک کہ اس باغی کو ہر نقصان پہنچانے والے کا خون بہتا ہوا نظر
آتا ہے اور بڑی بھیانک تصویریں اور خوفناک منظر نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔

احسان کی زندگی کے اس رخ پر ... نے شاید ان کے تخیل کو اتنے خوفناک مناظر
پیش کرنے کے قابل بنا دیا ہے ورنہ "باغی کا خواب" یا "سادھو کی چتا" جیسی بھیانک نظمیں

ایسی ادبی لطافتوں کے ساتھ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے بس کی ہو سکتی ہیں

پھر بھی اقبال اور جوش کے اثر کی جھلک اتنی الگ اور سر نہیں، کہ احسان کی شاعرانہ انفرادیت دب جائے اُن کا ذاتی مشاہدہ اُنھیں غریبوں کا ساتھ دینے پر مجبور کر رہا ہے گو عملاً وہ متوسط طبقہ کی طرف ہی کیوں نہ کھینچے چلے جا رہے ہوں

احسان نے دیگر موجودہ شعراء کی طرح رومانی نظمیں بھی کافی کہی ہیں حسن و عشق کی دنیا میں ان کا انداز محبت والہانہ ہوتا ہے شاعرانہ کیف اور اثر میں ڈوبے ہوئے شعر اُن کی رومانی نظموں میں بہت ملتے ہیں اُنھوں نے غزلیں بھی کافی کہی ہیں لیکن تغزل کم ہے غزل کی زبان بھی نہیں، ردیف و قافیہ کی قید میں عاشقانہ نظمیں معلوم ہوتی ہیں کچھ گیت بھی لکھے ہیں لیکن وہی پرانی روش ہے امتیازی شان نہیں پائی جاتی

ترنم احسان کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور وہ خود بھی بڑی دلکش لحن سے پڑھتے ہیں جدید تشبیہات اور لطیف شاعرانہ اشارات کثرت سے ملتے ہیں بعض تشبیہات تو ایسی لے آتے ہیں کہ ابھی تک اُردو اُن کا انتظار کر رہی تھی واقعات و مناظر کے خد و خال پر ان کو آرٹسٹ کی طرح قابو ہے، جذبات کے لطیف فرق کو نمایاں کرنے میں اُن کو ید طولیٰ حاصل ہے

اُن کے یہاں سیدھے سادے مگر دلکش اور بہت مانوس الفاظ ملتے ہیں، جوش اور اقبال کی طرح فارسیت کا رنگ غالب نہیں ہے احسان میں ابھی بہت کچھ ترقی کی صلاحیتیں باقی ہیں تھوڑے سے ذہنی نکھار کے بعد وہ اردو کے بہت بڑے شاعر ہو سکتے ہیں

اختر شیرانی

اختر خان نام، اختر تخلص حافظ محمود خان شیرانی کے فرزند، ۱۹۰۵ء میں ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے مگر ہوش لاہور میں سنبھالا، ابتداء میں اپنے اتالیق صابر علی خاں شاکر

سے سوا کیا لیکن ان کا ذوق فطری سے مدد لیے ہے آپ خالصتاً رومانی شاعر ہیں والہانہ انداز بیاں سے نظموں کو حقیقی معنوں میں غزل سا دیتے ہیں، وہ ایک خوش دل عاشق کی طرح معشوق سے دیوانہ وار گفتگو کرنے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں جس سے اُن کے کلام میں ایک لُطف و سپردگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اُن کی نظمیں زیادہ تر تکلّمانہ انداز کی وجہ سے دلکش ہو جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حسین دوشیزہ کا تصور اُن کے دل میں اکثر گُدگُدیاں پیدا کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اگر "گھرات" پر بھی نظم کہتے ہیں تو وہاں بھی اُن کے جذبات کی رنگ آمیزی سے سرزمین گھرات ایک دُلہن بن جاتی ہے۔

اختر شیرانی کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ طرزِ بیان یا کلام میں اتنا گداز نہیں ہوتا کہ ناقابلِ برداشت ہو جائے۔ اور نہ اتنا کم ہوتا ہے کہ طبیعت بے کیف ہو جائے، اُن کی نظمیں عموماً مترنم دسترس ہوتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اُن میں وہ گہرائی یا درد نہیں جو کسی شاعر کو حیاتِ ابدی عطا کر سکے۔ اکثر کلام کے ناہموار ہونے کی بھی لوگوں کو شکایت ہے لیکن سب سے زیادہ کمی اس کی محسوس ہوتی ہے کہ اُن کے جذبات میں کوئی تلاطم، کوئی تند و تیز طوفان، کوئی بے چین کر دینے والا تموّج نہیں ہوتا۔ اُن کی نظمیں اپنی ساخت کے لحاظ سے آورد کا شبہ دیتی ہیں لیکن یہی ساخت کی نوعیت اکثر اسی نادر و پُرکار ہو جاتی ہے کہ آورد کے احساس کو اُبھرنے بھی نہیں دیتی۔

اختر کے کلام کے مجموعے شعرستان، صبح بہار، نغمۂ حرم، طیورِ آوارہ، اخترستان اور لالۂ طور کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

اختر[1] کی رومانی شاعری اُداس اور درد آفریں نہیں رکھتی اور رجائی ہے اس میں ایک رجا دیتی ہے لذت سمیت ہے حسن پرستی ہی نہیں حسن کاری اور حسن آفرینی کا احساس ہے اور عریانی

---

[1] اُردو ادب میں رومانوی تحریک۔ مصنفہ ڈاکٹر محمد حسن ص ۵۹-۵۸

ادبیات میں اس پر مستولی نہیں وہ ایک ماورائی سرمستی اور تصور پرست کیف کا پرستار ہے

فیض

یہ بات کہ پوری اردو شاعری میں کلام کی اسی قلیل ضخامت پر کسی نے اتنا نام نہیں پیدا کیا جتنا فیض احمد فیض نے ان کا مجموعۂ کلام مختصر ہے مگر اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے جو کچھ ہے انتخاب معلوم ہوتا ہے فن کاری اور ندرت تخیل کا اتنا حسین امتزاج دورِ جدید میں کسی شاعر کے یہاں نہیں دکھائی دیتا سیدھے سادے الفاظ کو بغیر زیادہ تشبیہ و استعارے کے سحر کی صورت میں مس کرنا اور تاثیر و معنویت پیدا کر دینا فیض کا خاص کارنامہ ہے اور یہی فیض کی شاعری کا امتیازی پہلو ہے جو ان کی نظموں میں قریب قریب ہر جگہ نظر آتا ہے

فیض نے اپنی شاعری کی ابتدا غزلوں سے کی مگر کوئی خاص شہرت حاصل نہ کر سکے وجہ یہ تھی کہ وہاں خیال میں ندرت نہ تھی فرسودہ نظریہ عشق کو غزلوں میں جگہ دیتے رہے جس احساس کی کمی نے تاثیر کو ابھرنے نہ دیا روداد محبت کے نازک پہلو بھی بیان نہ ہو سکے مگر یہ ان کی روش کہاں تک نہ دکھتی جب روایتی شاعری سے الگ ہو کر نالوں سمجھے کہ [illegible] انہوں نے اپنے نظریۂ عشق کو حسب عملی زندگی کی کسوٹی پر رکھ کر اظہار خیال کی کوشش کی تو ان کا [illegible] ان کی اس دور کی شاعری [illegible] احساس کی شدت بھی [illegible] نظامیہ بھی غزلوں [illegible] وہ صرف اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے [illegible] ایسی ہوتی تھی اور نظموں میں غم جاناں کے بجائے غم دوراں کو زیادہ جگہ ملی ہے مگر معاملہ [illegible] ان کی شاعری نے گہرائی و توانائی عطا کر دی ایسا معلوم ہوا کہ پہلے وہ آپ بیتی بیان کرتے تھے اب نظموں میں جگ بیتی بیان کرنے لگے مگر یہ اس وقت ہوا جب فیض نے عالمگیر ساجوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور یہ محسوس کیا کہ [illegible] غم ہمارے [illegible]

یہ محسوس کرتے ہی فیض نے اپنے تخیل بیان کو پوری طرح شاعری کے لئے صرف کردیا نتیجہ یہ ہوا کہ احساس
میں شدت بھی پیدا ہوگئی اور بیان میں پُرسریت بھی آگئی فیض کے انداز بیان میں ایک ایسا تیکھا پن ہے
جو اس دور میں کم ہی نظر آتا ہے اُن کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ دل و دماغ کو متاثر کرتی
ہے وہ اختصار و جامعیت ہے نظم میں اختصار اور بیان میں جامعیت وہ
محسوسات کو چھو کر نہیں نکل جاتے بلکہ ذہن کو اس طرح سے چھیڑتے ہوتے جاتے ہیں کہ جیسے تریم کش
کسی دل کو حس کا ارتعاش کا باقی رہتا ہے اور ذہن بار بار اس سے لطف اندوز ہوتا ہے
فیض کے کم کہنے کا بھی راز یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ شدت سے کسی بات کو محسوس کرتے ہیں
تب ہی جذبات کو نظم بند کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ شعر کو حسین بنانے اور مفہوم کو وضاحت
کے ساتھ پیش کرنے کے لئے فن کاری پر پوری توجہ اور محنت سے کام کرتے ہیں کم سے کم الفاظ
میں زیادہ سے زیادہ مفہوم پیدا کرنے کی فکر بھی ہے جس کے لئے مختلف صلاحیتوں کو یکجا کر پانا ہے
جس کے لئے وقت کا سوال ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اشعار حسب خواہش زیادہ تعداد میں نہیں ہو سکتے
لیکن اشعار کی یہ قلت سینکڑوں کے سطحی اشعار و پُرگوئی سے کہیں زیادہ وقیع ہے

فیض کے یہاں چند نظمیں ایسی بھی ہیں جو اُردو ادب میں اضافہ معلوم ہوتی ہیں اور اُن کے
طرز تخیل کا بہترین نمونہ مثلاً 'تنہائی' 'رقیب' یہ اُردو ادب میں روز ازل سے چلے آتے تھے۔
ہر ادیب نے ایک ہی طرح سے اِن موضوعات پر طبع آزمائی کی تھی فیض نے تنہائی میں نفسیاتی
مطالعہ اور احساس حقیقت کا جیسا اچھا نمونہ پیش کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے یہی حال
ان کی اس نظم کا ہے جس کا عنوان رقیب ہے رقیب کی برائی اور ذلت اردو شعراء کا عام
مسلک تھا لیکن فیض نے جس محبت و احترام سے اس کو یاد کیا ہے اور جس خوبی سے اس نظم کو
نبھایا ہے اس کی مثال اب تک اُردو شاعری میں نہیں ملتی

۱۹۵۲ء میں فیض کا دوسرا مجموعہ 'دست صبا' شائع ہوا اُسے دیکھ کر اُن کی
فن کاری کا اور زیادہ اندازہ ہوا اختصار اور جامعیت کے ساتھ حسین الفاظ حسین احساسا

میں اس طرح ظاہر ہوئے کہ دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو گیا تشبیہات و استعارات کا فیض نے سہارا نہیں لیا بلکہ دلکش انداز میں الفاظ کے خوبصورت دام میں خیالات کو پیش کیا ہے تاریکی شعور اور نفسی الجھنوں کو شاعرانہ انداز میں سمو کر شعر بنایا ہے اشارے اتنے صاف اور مفہوم اسا واضح ہے کہ دل و دماغ یکساں متاثر ہوتے ہیں اس دور میں اتنی تیزی سے کسی اور شاعر کے کلام کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی شروع میں ایک سال کے اندر "دست صبا" کے کئی ایڈیشن چھپ گئے

علی سردار جعفری

سردار جعفری بلرام پور ضلع گونڈہ (اودھ) کے رہنے والے ہیں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت زیادہ تر لکھنؤ میں ہوئی یہیں کے ماحول میں پرورش پائی اور اسی یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا سردار جعفری ایسی طالب علمی کے زمانے میں بڑے ہونہار طالب علم تھے تقریر کرنے اور مضامین لکھنے میں اکثر انعامات حاصل کر چکے تھے یونیورسٹی میں جب پڑھتے تھے تب ہی سے اُردو ادب سے خاص لگاؤ تھا نظم و نثر دونوں میں یکساں کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ابتدائے شعور سے ترقی پسند ادب سے وابستہ تھے ایک زمانے میں صوبائی ترقی پسند انجمن کے سیکریٹری بھی تھے

سردار جعفری کا سیاسی شعور، ادبی مذاق کے ساتھ برابر بڑھتا رہا اُردو ادب کے علاوہ انگریزی ادب کے وسیع مطالعہ نے اُن کی ذہنی نشوونما کو بڑی بلندی عطا کر دی اُنھوں نے اپنے مطالعہ کو اُردو ادب میں مضامین افسانے اور نظموں کی صورت میں پیش کیا دوسرے ادب کی ترقی یافتہ اور قابلِ قدر نئی تحریکوں سے فائدہ اُٹھا کر

اردو ادب کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے جعفری کے کلام کا ایک مجموعہ 'پرواز'
کے نام سے پہلے ہی نکل چکا ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ خیال و بیان
کی ندرت اُن کو اُردو شاعری میں ایک دن ممتاز جگہ دے گی ادھر اُن کی جو نظمیں
شائع ہوئی ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خیال صحیح تھا مارکسی نظریۂ حیات کو
جس خوبی سے جعفری نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے اس طرح ہمارے نزدیک ابھی تک
اُردو کے کسی اور شاعر نے نہیں کیا وجہ یہ ہے کہ اُن کا سیاسی شعور اور ان کی زندگی
ہم آہنگ ہو گئے ہیں جس طرح وہ سوچتے ہیں اسی طرح زندگی بسر کرنے کی بھی کوشش
کرتے ہیں اس ربط نے احساس اور صداقت دونوں کو اُبھار دیا ہے نتیجہ یہ
ہے کہ خلوص و مشاہدہ اُن کی شاعری کے دو خاص جوہر بن گئے ہیں اور شعریت مزاج
میں پہلے ہی سے موجود تھی اس لئے کلام میں تاثیر کی بھی کمی نہ رہ گئی

جعفری کی شاعری میں خیالات کی وہ بلندی ابھی نہیں آئی جو اُن کو وہ
بلندی عطا کر دے کہ وہ اقبال کے قریب پہنچ سکیں لیکن جس بے باکی اور جوش کے
ساتھ وہ نظریۂ حیات پیش کرتے ہیں اس میں ایک خاص گہرائی و دلکشی ہے اُن کی
نظموں میں الفاظ اور ہمہ گیری دو ایسے عناصر ہیں جو اقبال کے دور کے ماحول کی رعنائی
کے لئے بے حد ضروری تھے صاف صاف ہے تاکہ ہر ایک بات کو بغیر تشبیہ و استعارے
کے پردوں کے، ایسا لئے ہوئے بیان کر دینا جعفری کا خاص حصہ ہے

جوش نے جہاں اپنی سیاسی شاعری کو ختم کیا تھا وہ ایسا موڑ تھا کہ
آگے راستہ نہیں سجھائی دیتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُردو شاعری میں ایک جمود
آ گیا ہے اس جمود کو جعفری نے ختم کیا اور ایک نئے باب کا اس طرح اضافہ
کیا کہ مشینوں اور گولی بارود اور بندوق وغیرہ کی حرکات و سکنات کو شعر کے
سانچے میں ڈھال کر ادب کو ایک نیا راستہ آگے چلنے کا بتا دیا اس موضوع پر نظموں

نے وہ شعریت پیدا کر دی ہے کہ بہتیں اور اس کے متعلقات حسین سے حسین تر اور مکروہ سے مکروہ تر نظر آنے لگتے ہیں پورا مسئلہ فن کاری کا نمونہ بن جاتا ہے

عصری کے اس وقت تک کئی مجموعے 'پر دار' کے علاوہ شائع ہو چکے ہیں مثلاً دھول کی لکیر، نئی دنیا کو سلام، اپنا جاگ اٹھا، اس کا سارہ، پھر کی دیوار

احمد ندیم قاسمی

۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو ضلع شاہ پور (پنجاب) کے ایک گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے جس گھر میں احمد ندیم پیدا ہوئے یہ کبھی دنیوی حشمت کی وجہ سے بہت ممتاز رہا۔ مگر ان کی ولادت کے زمانے میں وہ حشمت ختم ہو چکی تھی اور بقولِ خود "جب میں نے آنکھ کھولی تو میرا گھر افلاس و بدحالی کا عجب مرقع تھا" ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں ہوئی ۱۹۲۳ء میں باپ کے مرجانے کے بعد تعلیم و تربیت اُن کے چچا نے دی، چچا با وجود سرکاری ملازمت کے علم و ادب کے دلدادہ تھے عربی فارسی سے بڑا شغف تھا، اردو سے کافی دلچسپی تھی اقبال کے ہم سبق رہ چکے تھے اس لئے اقبال کی شاعری کا ذکر اکثر کیا کرتے اُن کے کلام سے بڑا انس تھا اور یہی انس احمد ندیم قاسمی کو منتقل ہو گیا

احمد ندیم نے بارہ سال کی عمر ہی میں علمی ذوق کا عملی ثبوت دیا۔ ایک چھوٹا سا ناول ۸ صفحے کا لکھ ڈالا اور کچھ اشعار بھی کہہ ڈالے۔ یہ ذوق رفتہ رفتہ بڑھتا رہا ۱۹۳۵ء میں بی اے پاس کرکے بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی نوکری کی تلاش میں سرگرداں رہے کبھی بیس روپے کی ملازمت ملی کبھی چالیس کی غرض کہ مدتوں تک پنجاب کے مختلف اضلاع میں کسب معاش کے لئے دوڑتے رہے ۱۹۳۹ء میں ملتان کے محکمۂ آبکاری میں کام کرنا شروع کیا لیکن تین سال بعد اس ملازمت سے دست بردار

ہو گئے ۱۹۴۲ء میں تہذیب نسواں، اور پھول کے ایڈیٹر ہو گئے یہ احمد ندیم کی ادبی زندگی کا بنیادی دور تھا ایک سال بعد ادب لطیف کے مدیر ہو گئے ۱۹۴۹ء میں اس سے بھی دستبردار ہونا پڑا۔ اس وقت احمد ندیم قاسمی لاہور میں ادبی و علمی مشاغل کی زندگی بسر کر رہے ہیں علاوہ اور کاموں کے آپ کل پاکستان ترقی پسند انجمن مصنفین کے سیکریٹری بھی ہیں

احمد ندیم قاسمی اپنے کلام کی بدولت اُردو ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے ہیں اُن کا مجموعۂ کلام "جلال و جمال" شائع ہو چکا ہے جس کے دیکھنے سے اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے سب سے پہلی چیز ان کے اس مجموعۂ کلام میں جو ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ "تنوع" ہے مضامین میں بھی تنوع ہے اور اصناف و بحور کے انتخاب میں بھی یہ خوبی صرف ایک ذہین اور زمانہ شناس فن کار ہی کے یہاں پیدا ہو سکتی ہے ورنہ تقلید سے شاعر کو بچنا مشکل ہوتا ہے ندیم کے طرزِ بیان میں بھی ایک خاص نُدرت ہے لب و لہجے کے انداز میں ایک ایسا تیکھا پن ہے جو سارے کلام میں تازگی پیدا کر دیتا ہے زبان ٹکسالی و بامحاورہ کم ہے فارسی و عربی کی تراکیب سے عموماً کام لیتے ہیں لیکن روانی میں فرق نہیں آتا اُن کا انداز تخاطب بہت دلکش اور پُر تاثیر ہے وجہ غالباً یہ ہے کہ جب کسی بات کو محسوس کرتے ہیں تو شدت کے ساتھ اس کا اثر لیتے ہیں اور یہ احساس صداقت، بے باکی اور برجستگی کے علاوہ کلام میں خلوص اور جوش اُبھار دیتا ہے

چونکہ ندیم کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور زندگی اب تک دکھ اور درد کا شکار ہوتی آئی ہے اس لیے موضوع ما حول میں نہ تو تکرار ہے اور نہ تازگی کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ شاعری کو ہمیشہ بے زاری اور واعظانہ انداز سے بچاتے ہیں کلام میں درد، کسک پیدا کرنے کی کوشش ہر جگہ نمایاں ہے، اسی سے اُن کے کلام میں للکار اور خطیبانہ خروش بہت کم ہے عموماً وہ رقیق السطری سے کام لے کر اپنی شاعری میں عظمت و معنویت پیدا کرنے کی فکر کرتے ہیں تشبیہہ و استعارے بڑے حسن سے نظم کرتے ہیں۔ مگر

منظر نگاری میں بھی اُن کا قلم وہ پُرکاری نہیں پیدا کر سکا جو جوشؔ یا علی سردار جعفری کو حاصل ہے البتہ صاف و سنجیدگی سے کلام مالا مال نظر آتا ہے

ندیم کی غزلوں میں فطری عنصر زیادہ ہے عشقیہ مضامین یا رازِ محبت زیادہ نہیں اس صنفِ شاعری میں ندیم کے یہاں سپردگی و ربودگی کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے غالباً "غمِ دوراں نے غمِ جاناں کو زیادہ پنپنے کا موقع نہیں دیا لیکن پھر اُس کے بھی ندیم کی غزلوں میں تغزل بھی ہے اور برجستگی بھی

وامق

احمد مجتبیٰ وامقؔ جون پور کے ایک وضع کے گاؤں میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے اُن کے والد مصطفےٰ حسن صاحب کلکٹر تھے گھر پہلے سے بھی خوش حال تھا دولت سے زیادہ ادبی سرمایہ خاندان میں تھا وامقؔ کے دادا مجتبیٰ حسن نہ صرف عربی و فارسی کے عالم تھے بلکہ سنسکرت و جوتش کے بھی زبردست ماہر سمجھے جاتے تھے باپ کی ملازمت کی وجہ سے وامقؔ کی تعلیم ایک جگہ نہ ہو سکی، کبھی فیض آباد میں پڑھا، کبھی بارہ بنکی اور کبھی لکھنؤ میں بی اے کے بعد ایل ایل بی کر کے وکالت شروع کی اور اسی کے ساتھ ساتھ شاعری بھی وکالت چھوڑ کر نوکری کر لی مگر شاعری نہ چھوڑ سکے یہاں تک کہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے کی ایک خاص وجہ شاعری تھی کیونکہ جس قسم کی باتیں وہ کہنا چاہتے تھے وہ سرکاری ملازمت میں ممکن نہ تھیں

یوں تو وامقؔ کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی کچھ قطعات، رومانی نظمیں اور غزلیں وہ پیشتر بھی کہہ چکے تھے مگر اُن کے جوہر اس وقت تک نہ کھلے تھے دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اُن کی شاعری و شہرت میں ترقی ہوئی وجہ یہ ہوئی

واثق

کہ واثق نے اپنی دیہات اور فطری دردِ دل سے متاثر ہو کر ہندوستان کے اس کرب کو محسوس کر لیا جس میں وہ اس وقت مبتلا تھا لوٹ، قحط، استحصال کی گرم بازاری، رجعت پسند طاقتوں کا اُبھار، تعمیر کے بجائے تخریب کی ہیں یہ وہ کوششیں ایسی مصیبتیں تھیں جنھوں نے اکثر درد مندوں کے حساس دلوں کو چوٹ پہنچائی چنانچہ واثق کو بھی ہندوستان کی بدقسمتی پر افسوس اور فاشسٹی قوتوں پر غصہ آ گیا انھوں نے اس شاعری کو دشمن کی للکار بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور چونکہ مجموعی سیاسی دنیا کا ایک خوبصورت اجتماع کلام میں نظر آتا ہے لہٰذا واثق کی شہرت بہت جلد دنیائے ادب میں ہو گئی

اب تک واثق کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ایک کا نام "شخص" اور دوسرے کا "حرس" ہے ان مجموعوں کے شائع ہونے سے پہلے ہی واثق نے اپنی بعض نظموں کی بنا پر اُردو شعراء میں ممتاز جگہ پالی تھی بھوکا بنگال، بیتا بازار، تقسیم پنجاب یہ نظمیں اتنی مقبول ہوئیں کہ واثق نئے شاعروں کی صفِ اول میں شمار ہونے لگے

واثق کے کلام میں دلکشی بھی ہے اور پُرکاری بھی وہ جو بات کہتے ہیں محسوس کر کے کہتے ہیں اور چونکہ شاعرانہ صلاحیتیں اچھی طرح موجود ہیں اس لئے کلام پُرتاثیر ہو جاتا ہے وہ اپنے مقصد یا نقطۂ نگاہ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ قلم بند کرتے ہیں عموماً جامعیت اور صاف گوئی اُن کی شاعری میں ہر جگہ جاذبِ نظر ہیں الفاظ اور بحر دل کا انتخاب واثق بڑے سلیقہ سے کرتے ہیں موضوع بحر سے ہم آہنگ ہو کر مضمون کو زیادہ سے زیادہ اُبھار دیتا ہے

واثق کے مجموعے میں آزاد و پابند نظمیں دونوں ہیں ہر جگہ شائستگی اور قدم قدم پر مقصد نمایاں ہے غزل بھی واثق نے طبع آزمائی کی ہے مگر حسن و عشق سے زیادہ سیاسی نظریئے اور عوامی تحریک و جذبات ان میں ملتے ہیں عشقیہ عناصر کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے لیکن صحت مند جذبات اور لب و لہجہ کی تازگی اُس کا بدل

پیش کر دیتی ہے عرض کہ بقول احتشام حسین ۔

"دامق کی شاعری برابر ترقی کرتی، زندگی کے مسائل کو سمجھتی سمجھاتی، وسعت اور گہرائی پیدا کرتی بڑھ رہی ہے۔ اگر انھوں نے اسی سرجھ بوجھ اور فن کوری سے کام لیا تو یقین ہے کہ وہ اُردو کی صفِ اوّل کے شعراء میں جگہ پانے کے مستحق ہو جائیں گے

موجودہ دور کی خصوصیات

۱ موجودہ دور میں مغربی اثر اور سائنس اور فلسفے کے مطالعے سے اُردو شاعری زیادہ متاثر ہوئی اس لئے اصلیت اور واقعہ نگاری شعراء کے کلام میں زور بر زیادہ ہوتی گئی ہے ۔ تکلیف مبالغہ اور تصنع شاعری سے کم ہوتا جا رہا ہے صداقت اور اصلیت سطر نگاری اور واقعہ نگاری کے علاوہ جذبات و واردات کے اظہار میں بھی مدنظر رہی ہے اس معرکہ میں جہاں کہیں شعراء ناکامیاب رہے ہیں وہاں کلام خشک اور بے رنگ ہو گیا ہے لیکن جہاں مستقل کئے ہیں وہاں زور، تاثیر اور شاعری کے محاسن کافی پیدا ہو گئے ہیں

۲ موضوعاتِ شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے مسلسل اور مستقل نظموں کا ایک قابل قدر ذخیرہ ہمارے ادب میں نظر آنے لگا اس دور کے قبل مسلسل نظمیں، مثنویاں، ہجویات، واسوخت قصائد و شہر آشوب، سکار نامہ ساقی نامہ ایسے ہی اور موضوعات تک محدود تھیں فن اور محاسن شاعری کے زیرِ عنوان اس کو بڑے مستقل نظموں کی عظمت اور اہمیت و ہر دلعزیزی حس حد تک بڑھا دی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں لیکن موضوعات کو الگ الگ قائم نہیں کیا آزاد

حالیؔ، اسمٰعیلؔ کے ہاتھوں مسلسل نظموں کی تعداد اور اقسام اور عنوانات کی تحدید ختم ہوئی اور مساد ذخیرہ مسلسل نظموں کا گزشتہ پچاس برس میں ہوا ہے اتنا اردو شاعری کی عمر بھر میں نہیں ہو سکا۔ ملک کے مختلف حصوں سے اردو رسائل کا نکلنا، انگریزی نظموں کی مثال اور سیاسی و تمدنی بیداری نے شاعری کو وسعتِ نگاہ عطا کر دی۔ اسی وجہ سے اردو شاعری کو گوناگوں وسائل اور عنوانات ہاتھ آئے۔

۳۔ نظموں کے سلسلہ میں ان مستقل ترجموں کا ذکر کرنا ضروری ہے جو اس دور کے شاعرانہ کارناموں میں خاص چیزیں ہیں۔ سب سے چمکتی ہوئی مثال طباطبائی کی نظم "گورِ غریباں" ہے جو انگریزی شاعر تامس گرے کی انگریزی نظم کا ترجمہ ہے۔ سلیم پانی پتی نے چترنجن داس کے "ساگر سنگیت" کا ترجمہ "بحرِ ترنم" کے نام سے اس خوبی سے کیا کہ اہلِ مذاق نے نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ ان کے علاوہ متعدد انگریزی اور سنسکرت کی نظموں کا منظوم ترجمہ ہوا، مثلاً "گیتا" کا ترجمہ اور کالیداس کا "رت سنگھار" کا ترجمہ "عروسِ سخن" کے نام سے اور اسی مصنف کے "میگھ دوت" کا ترجمہ "پیکِ ابر" کے نام سے۔ ان کے علاوہ انگریزی اور دیگر زبانوں کے ڈراموں کے ترجمے ہوئے جن میں بعض منظوم ہیں اور اچھے ہیں۔ کبھی کبھی نظمیں تصویروں کو دیکھ کر بھی لکھی گئی ہیں جن میں سے کئی ایک اچھی ہیں۔

۴۔ دورِ جدید میں غزل نے بھی نئے انداز سے نغمہ سرائی کی۔ ماہرِ ترنم، داخلی پہلو، ہمواری، یک رنگی، جذباتی اور ذہنی کیفیات کے اظہار پر خاص توجہ کی گئی ہے۔ تصنع اور لفظی پھیر اور پرکار چالوں کے بجائے شعریت، روانی، بندش کی چستی اور موسیقیت کو جگہ دی ہے۔ لطف پُرمعنی کنایات موجودہ اردو غزل کی امتیازی خصوصیتوں میں سے ہیں۔ عام طور پر غزلوں میں فلسفۂ حیات اور حقیقتِ ہستی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے۔ جو واقعات و امور مادی النظر میں مخصوص و محدود نظر آتے تھے اُن کو دوربیں نگاہوں نے عمومیت دے دی یا یاں دیکھ کر شعراء کے کلام میں حسرت کے عنصر کو بہت بڑھا دیا ہے۔

۵ تصوف نے اصولی اور رسمی پیرایۂ بیان سے قدم بڑھا کر زیادہ رنگین اور شاعرانہ شکل اختیار کر لی۔ مسائلِ تصوف کا اطلاق سینکڑوں نئے عنوان سے شعراء کرنے لگے ہیں اپنی شخصیت اور انفرادیت اور لہجہ کو قائم رکھنے کی کوشش بھی دورِ حاضر کی ایک مخصوص چیز ہے متعدد غزلیں عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں عنوانوں سے الگ ہو کر محض مسئلۂ حیات کے موضوع پر ملیں گی

۶۔ موجودہ دور کی غزلوں کی ایک امتیازی شان نفسیات کا گہرا مطالعہ اور انسان اور زندگی کے متعلق پُرلطف اظہارِ خیال ہے مگر ایسے موقع پر کبھی کبھی شعراء کا قدم مہملیت کی طرف بھی جا پڑتا ہے

۷۔ فرسودہ اور مبتذل مضامین، تصنع اور محض رسمی باتیں مفقود ہو چلی ہیں جو الفاظ و ترکیبیں کثرتِ استعمال سے پامال ہو چکی تھیں ان سے گریز اور نئی ترکیبوں اور نئے اندازِ بیان سے کلام کو سنوارنے کی جدوجہد جاری ہے

۸ یہ تو سب کچھ ہوا مگر قدما کے کلام کی سادگی، بھولا پن، معصومیت اور خالص تغزل کے تیر اثر کو لوگ ہیں موجودہ غزلوں میں ڈھونڈتے ہیں لیکن مایوس ہو کر واپس آتی ہیں لطافت ورنگینی تو ملتی ہے، ناشر و صداقت اور وسعت نظری بھی موجود ہے کیف ولطف کی بھی کمی نہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ تکلف اور خوشگوار آورد کی جھلک بھی بڑھتی جارہی ہے سہلِ ممتنع کی مثالیں بہت کم ہوتی جارہی ہیں فارسی اور عربی کی نئی ترکیبوں کی تلاش و استعمال میں لوگوں کو کبھی کبھی لغزش ہو جاتی ہے اور قدم ڈگمگا کر راہِ راست سے غلط راستہ پر جا پڑتا ہے

۹ دورِ حاضر کی ایک خصوصیت ترقی پسند تحریک ہے جو ہندوستان میں منظم طریقہ پر ۱۹۳۵ء میں ظہور پذیر ہوئی اس تحریک کا مقصد حیات کو زیادہ سے زیادہ ادب سے قریب کرنا ہے اس نظریئے پر کاربند ادیب زیادہ تر مارکسی اور اشترا کی اندازِ فکر پر عامل

ہیں دورِ حاضر میں اس تحریک نے اُردو ادب پر بڑا اثر ڈالا ہے زیادہ تر ادیب اسی نظریے کے تحت میں کام کر رہے ہیں ان ادیبوں کو ترقی پسند مصنفین سے عموماً براہِ راست واسطہ ہے اکثر غلط فہمی ہوتی ہے کہ جو شخص بھی دورِ جدید میں لکھ رہا ہے وہ ترقی پسند ہے یہ خیالی غلط ہے بلکہ جیسا ہم نے اوپر لکھا جو شخص مارکسی اور اشتراکی نظریئے سے کام کر رہا ہے صرف وہی ترقی پسند کہلانے کا مستحق ہے باقی لوگ یا تو رجعت پسند ہیں یا کم از کم ترقی پسند نہیں ہیں

۱۰۔ دورِ حاضر کی ایک خصوصیت آزاد نظم کی صورت میں بھی ظاہر ہوئی جس میں قافیہ و ردیف کی خاص قید نہیں ہے بحر کے ٹکڑے کر کے آہنگ کی صورت میں چھوٹے بڑے مصرعے لکھے جاتے ہیں لیکن ایک ہی بحر کا شروع سے آخر تک التزام رہتا ہے ورن البتہ کم زیادہ ہوتے رہتے ہیں اس تھوڑی مدت میں یعنی جب سے یہ وجود میں آئی ہے کئی ایک قابلِ قدر نظمیں آزاد نظم کی شہرت میں آچکی ہیں جن کے ذمہ دار علی سردار جعفری، فیض، ن م راشد اور وامق ہیں

۱

نثر

نثر کی تاریخ

جیسے جیسے تحقیقات کی جاتی ہے اردو نثر کی عمر عام خیال سے زیادہ ہوتی جاتی ہے پہلے لوگوں کو خیال تھا [illegible] کی "دہ مجلس یا کربل کتھا" اردو نثر کی [illegible] سے پہلی کتاب ہے جو ۱۱۴۵ھ [illegible] شاہ [illegible] لکھی گئی مگر اب تحقیق و [illegible] سے پتا لگا [illegible] بہت پہلے دکن [illegible] نثر کا دور [illegible] ہو چکا تھا۔ [illegible] کہا جاتا ہے کہ [illegible] [illegible] [illegible] کی تحریر [illegible] خواجہ بندہ نواز گیسو دراز [illegible] کے رسالے [illegible] [illegible] تاریخ اردو [illegible] [۱۹] [illegible] [illegible] شمس [illegible] ء میں تصنیف کیا" اور اس [illegible] یہاں [illegible] کہ یہ سوال [illegible] ہے کہ دکن میں اردو کی [illegible] کے [illegible] تصنیف کی [illegible] [illegible] کا پتہ [illegible] [illegible] [illegible] کے لئے ضروری تھا کہ اس [illegible] [illegible] [illegible] لحاظ سے [illegible] [illegible] ہوتی ہے اس کا [illegible] ضروری تھا [illegible] یہ کتاب کیوں [illegible]۔

قدیم ہیں شیخ موصوف کا انتقال ۷۹۵ھ میں ہوا[51] افسوس ہے کہ ان کے رسالے
ہمارے پیش نظر نہیں لہذا زیادہ وثوق کے ساتھ کچھ اور نہیں کہا جا سکتا ہے البتہ
خواجہ بندہ نواز حضرت سید محمد گیسو دراز کی ایک تصنیف "معراج العاشقین" شائع ہو گئی
ہے خواجہ صاحب کا انتقال ۸۲۵ھ میں ہوا لہذا یہ کتاب یقیناً اس سے پہلے
لکھی گئی ہوگی یہ کتاب مذہبی امور پر مبنی ہے عبارت کا نمونہ یہ ہے[52]

'ایک بادشاہ کی تعظیم ایک امیر کوں بڑی کرتا ہے تو اول حاجب
آرائش کرتا ہے، سو محمد کو یا بچہ تن سلوار کر سات اسماں کے
اوپر لائے آگے ہو کے عروج لے کر جائے ناسوت کی منزل سوں"

اس کتاب کے دیکھنے سے یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ نثر کی ابتدا کم سے کم
آٹھویں صدی ہجری سے ہو گئی تھی مگر فی الحال کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قطعی تاریخ
ہے بہت ممکن ہے کہ تلاش و فکر سے ابھی کچھ اور آگے کا بھی پتہ چلے لہذا ابھی
عرصہ درکار ہے کہ یقین کے ساتھ کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ خواجہ گیسو دراز تک موقوف نہیں رہا بلکہ اس میدان
میں کچھ اور بھی اہل قلم نظر آتے ہیں مثلاً خواجہ صاحب کے نواسے سید محمد عبد اللہ حسینی
جو سلطان احمد شاہ ثانی کے زمانے میں گذرے ہیں آپ نے غوث الاعظم حضرت شیخ
عبد القادر جیلانی رح کے رسالہ "نشاط العشق" کا دکھنی میں ترجمہ کیا تھا اور اس
کی شرح بھی لکھی تھی[53]

دکن کے ایک دوسرے بزرگ جن کا کارنامہ ملتا ہے وہ میراں جی شاہ شمس العشاق
ہیں انھوں نے ۹۰۲ھ میں انتقال کیا ان کا قلم نظم و نثر دونوں میدانوں میں[54] ان
بہتا چنانچہ کئی رسالے نثر میں بھی ہیں چند کے نام یہ ہیں۔

---

۵۱ اردوئے قدیم ص ۴۱ ۴۲ ۵۲ معراج العاشقین ص ۱۵ ۵۳ اردوئے قدیم ص ۴۴

۱ حل ترنگ ۲۔ گل باس ۳ شرح مرغوب القلوب ان سب میں شاہ صاحب نے تصوف کے مسائل بیان کئے ہیں۔ ادبی نقطۂ نگاہ سے اس دور کی کتابوں میں وجہی کی "سب رس" قابل ذکر ہے اس کتاب کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے مولوی عبدالحق نے اس کو مع ایک مبسوط مقدمہ اور فرہنگ کے شائع کیا ہے۔ عبدالحق ایک جگہ صفحہ ۲۶ میں لکھتے ہیں کہ "یہ کتاب ادبی نظر سے قدیم اردو میں خاص ممتاز حیثیت رکھتی ہے" قصہ بھی عجیب ہے اور طرز بیان بھی عجیب مصنف نے ایک عام اور عالمگیر حقیقت کو مجاز کے پیرائیے میں بیان کیا ہے اور حسن عشق کی کش مکش اور "عشق و دل" کے معرکے کو قصے کی صورت میں پیش کیا ہے اس کتاب کی عبارت مقفیٰ و مسجع ہے لیکن روانی اور سلاست بہت کافی ہے قصے کے درمیان مصنف حکایت و نصائح سے بھی کام لیتا رہتا ہے یہی نہیں بلکہ جابجا اس زمانے کی طرز معاشرت کا بھی بیان آجاتا ہے عبارت کا نمونہ یہ ہے

"عقل بغیر دل کو نور نہیں، عقل کو جدا کہنا بھی کچھ دُور نہیں ذات
تے صفات ہے ذات تے جو کچھ نکلیا سو بے ذات ہے جوں رتناہ
ہو ہرا اس کا نور کیوں ہوئے مشہور"

۱۰۸۰ھ کے قریب ایک بزرگ میراں یعقوب نے شمائل الاتقیا اور دلائل الاتقیا کا ترجمہ دکھنی زبان میں کیا مولف اردوئے قدیم کا بیان ہے کہ یہ ترجمہ نہایت صاف اور سادہ زبان میں ہے مترجم نے کتاب میں کسی قسم کا تصرف نہیں کیا ہے مضامین اور ان کی تقسیم اصل کے بالکل مطابق ہے [1]

اورنگ زیب کے زمانے میں ایک بزرگ سید شاہ محمد قادری گزرے ہیں۔ جو رائے پور (جس کا نام عالمگیر نے پیر پور رکھا) کے ایک خاندان "نوبہ دیا"

---

[1] اردوئے قدیم صفحہ ۱۱

سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے بھی کئی مذہبی رسالے لکھے ہیں۔ اسی زمانے میں ایک
اور بزرگ سید شاہ میر نے ایک کتاب "اسرار التوحید" کے نام سے لکھی۔ نام سے ظاہر
ہے کہ توحید کے متعلق ہے۔

ان بیانات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ نثر کی ابتدائی نشوونما کا فخر دکن کو
ہی حاصل ہے۔ گو کہ ان میں زیادہ تر کتابیں مذہبی ہیں جو ادبی نقطۂ نگاہ سے زیادہ
اہمیت نہیں رکھتیں مگر پھر بھی زبان کی عہد بعہد ترقی کا کافی پتہ چلتا ہے۔ شمال میں
نثر کی ابتدا اس لحاظ سے کم و بیش ایک صدی کے بعد ہوئی۔ کیونکہ فضلی کی
دہ مجلس ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی۔ یہاں فارسی کا غلبہ اس قدر تھا کہ اردو میں لکھنا لوگ
ننگ و عار سمجھتے تھے۔ اس کے بعد بھی عرصے تک خطوط وغیرہ فارسی میں لکھے جاتے
تھے۔ یہاں تک کہ مرزا غالب نے بھی ریختہ کو اپنے لئے باعثِ ننگ سمجھا اور پہلے
دور میں صرف نظم کی ہر دلعزیزی تھی۔ رقعے وغیرہ بھی نظم ہی میں لکھے جاتے تھے۔ اسی
شاعری کا یہ اثر اور فارسی کا اثر تھا کہ اردو نثر بھی عرصے تک مقفیٰ و مسجع لکھی جاتی رہی
ہے۔ دہ مجلس کی عبارت اس قسم کی ہے:

"تدبر دل میں گزرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیئے کامل اور مدد کسو طرف
کی ہووے شامل کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احمدی یہ
مشکل صورت پذیر نہ ہووے اور گہر مراد رشتۂ امید میں نہ آوے"

سودا نے اپنی کلیات کی ابتدا میں جو نثر لکھی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ
عبارت عموماً رنگین، مشکل اور مقفیٰ ہوتی تھی۔ اس دیباچہ کی چند سطریں یہ ہیں:

"سبب تحریر آنکہ ارباب معنی کے معروض ہو کہ مخلص عباس حق تعالیٰ کی
سے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو لیکن یہ چند مصرعے کہ از قبیل ریختہ
در رشتۂ نظم دو زباں اپنی سے معجزہ کا عہدۂ تحریر پائے"

ایک اور مشہور کتاب جو اسی عہد میں لکھی گئی وہ نو طرز مرصع ہے۔ یہ کتاب قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے ۱۷۹۸ء میں اس مشہور کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی کلی عبارت رنگین اور مقفیٰ ہے

فورٹ ولیم کالج

آخر وہ وقت آگیا کہ سلطنت کو اردو کی امداد کی ضرورت پڑی اور یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس زبان کی سرپرستی کر کے حکام سرکاری کو اس زبان سے واقف کیا جائے بلکہ اگر ممکن ہو تو کوشش کی جائے کہ ہر شخص اس کو سمجھے اور استعمال کرنے لگے چنانچہ اس خیال کو پورا کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج مناسب سمجھا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں اردو ادب کا مرکز قرار دیا گیا اس کالج کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر جان گل کرسٹ تھے انھوں نے اردو کی ترقی کے لئے ان تھک کوشش کی ملک کے بہترین انشا پردازوں کو اکٹھا کر کے ایسی کتابیں لکھوائیں جو عام فہم اور دلچسپ ہوں رنگین عبارت اور مقفیٰ تحریر سے یکسر قلم گریز کیا بلکہ سلیس اور رواں عبارت پر زور دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو بہت جلد عام فہم اور دلکش نظر آنے لگی۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان قرار پائی۔ اس زمانے کی چند خاص ہستیاں یہ ہیں۔

میر امن سید علی افسوس میر بہادر علی حسینی۔ حیدر بخش حیدری میر کاظم علی جواں نہال چند لاہوری۔ مظہر علی خاں ولا۔ حفیظ الدین احمد للو لال جی بینی نرائن مرزا علی لطف۔

مرزا علی لطف

ان کے والد کاظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے ۱۷۴۱ء/۱۱۵۴ھ میں نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے اور یہیں رہ گئے مرزا علی لطف کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ نے ان کو بھی اپنے یہاں بلا کر جگہ دی اور ان سے وہ کام لیا جو شاید ابھی تک کسی سے نہ لیا تھا اردو شعرا کا تذکرہ لکھوایا جس میں اس وقت کے بہت سے شاعروں کے حالات اور کلام ہیں۔ اس تذکرہ کا نام "گلشن ہند" ہے جو ایک مدت تک دنیائے ادب کی نظروں سے اوجھل رہا بقول مرزا اتا قتہ۔

ہر اندھیرے میں اُجالا ہے اگر دل ہو نصیب

موسیٰ ندی کا وہ طوفان جس نے حیدرآباد کو بے شمار نقصان پہنچایا اسی نے اس تذکرہ کو "گنج ا۔ آورد" کی طرح دنیا میں پھر ظاہر کیا یعنی گلشن ہند کی ایک جلد سیلاب عظیم میں بہتی چلی جا رہی تھی کہ ایک صاحب کے ہاتھ لگی جس کو مولوی عبدالحق نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے

فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان کی جو سرپرستی کی ہے اس احسان سے اردو ادب سبکدوش نہیں ہو سکتا متعدد قابل قدر اہل قلم کو بلا کر کوئی ادبی خدمت ان کے سپرد کر دی گئی جس سے ایک بیش بہا ذخیرہ تیار ہو گیا نہ صرف قصہ کہانی کی کتابیں لکھی گئیں بلکہ اخلاق، مواعظ، تاریخ، سوانح عمری لغت علم اللسان پر بھی توجہ کی گئی اور کچھ نہ کچھ ان کے متعلق بھی سرمایہ اکٹھا کر دیا گیا۔

اس کالج کے اشاریہ اردو کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مقفیٰ و مسجع عبارت سے گریز کر کے انھوں نے سیدھی سادی عبارت کا رواج دیا۔ (میر امن کے تذکرہ

کے سلسلے میں ہم نے جو تنقید بیان کی ہے کم و بیش وہ اس کالج کے حلقہ منشیوں پر صادق آتی ہے)

اس کالج کا اثر تمام ملک پر پڑا۔ رفتہ رفتہ سبھوں نے فرسودہ طریقہ یعنی رنگین اور مغلق عبارت کو چھوڑ کر سادگی اختیار کی۔ دہلی والوں نے بہت جلد اس روش کو قبول کر لیا۔ البتہ اہلِ لکھنؤ نے اس راستہ کو اختیار کرنے میں کچھ دیر تردد و تکلف سے کام لیا۔

ایک اثر اس کالج کا یہ پڑا کہ فارسی اور عربی کے دقیق الفاظ کی اردو میں کمی ہو گئی۔ ہندی اور اردو کے وہ الفاظ کام میں آنے لگے جو عام طور سے کم پسند کئے جاتے تھے۔ مگر یہ محض اس لئے تھا کہ زبان عام فہم ہو جائے۔

اب اردو نثر کی طرف تمام ہندوستان کی نظریں پڑنے لگیں۔ اطراف و جوانب سے بھی لوگوں نے قلم اٹھایا۔ سید انشاء اللہ خاں نے اردو زبان کی قواعد "دریائے لطافت" ۱۸۰۲ء میں لکھی۔ ۱۸۲۳ء میں مولوی محمد ابراہیم نے صرف و نحو کی ایک کتاب "تحفۂ الفصحٰی" تحریر کی۔ اسی طرح سے منشی کریم الدین کی قواعد المبتدی ۱۸۴۵ء میں لکھی گئی۔ اور اسی سلسلہ میں مولانا محمد حسین آزاد نے جامع القواعد لکھ کر لاہور میں شائع کی۔ علاوہ ان کے چند اور لوگوں نے چھوٹے چھوٹے رسالے مختلف موضوع پر قلم بند کئے۔

للّو لال جی

یہ گجراتی برہمن تھے اوائل عمر میں شمالی ہند آ گئے تھے مگر اردو کے بھی ادیب تھے خوش قسمتی سے یہ بھی اس کالج کے منشیوں میں کام کرتے تھے ان کا بڑا کام یہ تھا کہ ہندی کتابوں کے ترجمے کرنے میں اردو والوں کو مدد دیں اور ہندی کی کتابیں بھی لکھیں ان کی ایک مستقل تصنیف سنگھاسن بتیسی اردو میں بھی ہے۔

میر امّن

اس عہد کے سب سے ممتاز مصنف میر امّن دہلوی ہیں اور ان کا مشہور کارنامہ "باغ و بہار" ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امّن کا زبان پر پوری قدرت حاصل ہے روانی اور سلاست کے علاوہ محاوروں کا صرف اور زبان کی لوچ نہایت خوبی کے ساتھ ساتھ ہیں میر عطا حسین تحسین نے چہار درویش کا فارسی سے پہلے اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا لیکن فارسی و عربی کے غیر مانوس الفاظ نے اردو میں مقبول عام نہ ہونے دیا۔

میر امّن نے نئے سرے سے اس کتاب کو فورٹ ولیم کالج میں لکھنا شروع کیا اور اس خوبی کے ساتھ لکھا کہ عوام اور خواص دونوں سے قبول عام کی سند حاصل کی۔ لوگوں کے جذبات حفظ مراتب کے ساتھ اس طریقہ پر ادا کیے کہ عورت اور مرد، نوکر اور آقا جس کا ذکر آیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سامنے دو بدو گفتگو کر رہے ہیں جہاں کہیں فارسی یا سنسکرت کے الفاظ آ گئے ہیں ڈ

بجائے ناگوار معلوم ہونے کے دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ میر امن نے کہیں کہیں ایسے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جو لغت کے لحاظ سے نامناسب ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ عوام کی زبان پر رائج تھے۔ لہٰذا انھوں نے اردو کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے اس بات کو روا رکھا

میر امن کے آبا و اجداد ہمایوں بادشاہ کے وقت سے مغلیہ سلطنت سے وابستہ تھے شاہی دربار سے ان کو جاگیر بھی عطا ہوئی۔ احمد شاہ درانی کے حملے کے وقت میر امن کا گھر بھی لوٹا گیا۔ اور سورج مل جاٹ نے ان کی خاندانی جاگیر بھی ضبط کر لی اس وقت ان کو مجبوراً وطن چھوڑنا پڑا۔ کئی برس عظیم آباد میں قیام کیا۔ پھر وہاں سے کلکتے پہنچے وہاں دو سال تک نواب دلاور جنگ کے بھائی میر محمد کاظم خان کے اتالیق رہے اسی زمانے میں میر بہادر علی حسینی نے ان کا تعارف ڈاکٹر گل کرائسٹ سے کرا دیا موصوف نے نہایت خوشی سے میر امن کو فورٹ ولیم کالج میں جگہ دی ۱۸۰۱ء میں قصہ چہار درویش کو سلیس نثر میں لکھنے کے لئے مامور کیا

اس کتاب کی خوبی کے لئے یہی دلیل کیا کم ہے کہ سو برس سے زیادہ ہو گئے مگر اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا اگر میر امن کو اس کارنامہ پر فخر تھا تو بجا نہ تھا ہمارے نزدیک یہ کتاب ان کے لئے حیات جاوید سے کم نہیں میر امن کی دوسری کتاب گنج خوبی ہے یہ انوار سہیلی کا ترجمہ ہے اس کتاب کو شہرت نہیں نصیب ہوئی

میر شیر علی افسوس

میر افسوس دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد نواب عمدۃ الملک امیر خان کی سرکار میں ملازم تھے۔ امیر خاں کے انتقال کے بعد افسوس کے والد یعنی میر علی مظفر خاں

پٹنہ چلے گئے وہاں نواب میر قاسم کے یہاں سلسلۂ ملازمت قائم ہو گیا اور یہ سلسلہ نواب میر جعفر کی حکومت تک باقی رہا۔ میر شیر علی افسوس اپنے والد کے ساتھ پٹنہ سے پھر لکھنؤ واپس آئے لکھنؤ کی فضا میں اس وقت شاعری ہر طرف جلوہ گر تھی افسوس نے بھی اپنے کلام کی داد اہل فن سے لی۔

لکھنؤ کے دوران قیام میں افسوس کو موقع ملا کہ کرنل اسکاٹ کے دل پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھائیں کرنل صاحب نے دو سو روپیہ ماہوار افسوس کو کلکتہ بھیجا اور پانچسو روپے زاد راہ کے لئے دئے کلکتہ پہنچ کر وہ فورٹ ولیم کالج کے سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ انھوں نے کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ گلستاں کا ترجمہ اردو میں کیا جس کا نام باغ اردو رکھا اور یہی سال اختتام کا مادہ تاریخ بھی ہے اس ترجمہ میں میر شیر علی افسوس نے زبان کی سلاست اور ترجمہ کی خوبی کو مدنظر رکھتے ہوئے دلچسپی قائم رکھنے کی کوشش کی ہے

ان کی ایک اور کتاب ہے جو ہندوستان کے جغرافیائی حالات اور کسی قدر تاریخی واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا نام آرائش محفل ہے اس کو حیدر بخش کی آرائش محفل (قصہ حاتم طائی) سے کوئی تعلق نہیں میر شیر علی افسوس نے سودا کے کلیات کو صحیح کر کے دوبارہ شائع کیا ان کا خود بھی ایک دیوان ہے جو اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ افسوس کا سال انتقال ۱۸۰۹ء ہے

سید حیدر بخش حیدری

دلی کے رہنے والے اور سید ابوالحسن کے بیٹے تھے۔ بزرگوں کا وطن نجف اشرف تھا سید ابوالحسن نے دلی کو خیرباد کہہ کر بنارس میں سکونت اختیار کر لی تھی حیدری

کی ذہنی نشوونما اس میں ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کی علمی قدردانی کا حال سن کر حیدری
نے ایک کتاب لکھی اور اس کو ڈاکٹر گل کرائسٹ کی خدمت میں پیش کیا ڈاکٹر صاحب
نے اس کتاب کو بہت پسند کیا اور حیدری کو فوراً ملازمت کی جگہ دی

حیدری نے اپنے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیئے اور ایک بڑا کارنامہ اپنی
یادگار میں چھوڑا ان کی کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے

۱ قصۂ لیلیٰ مجنوں، امیر خسرو کی مثنوی کا اردو ترجمہ ۲۔ طوطا کہانی یہ قصوں کی
کتاب ہے اصل کتاب سنسکرت میں ہے جس کا ترجمہ فارسی میں بھی ہوا تھا اور فارسی سے
حیدری نے اردو میں لیا ہے ۳ آرائش محفل۔ یہ حاتم طائی کا ترجمہ ہے حیدری نے
اس کی زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ رکھی ہے جس کی وجہ سے قصوں کے پیچیدہ
ہونے کا اثر کم پڑتا ہے اور دلچسپی قائم رہتی ہے قصہ کی پیچیدگی کا ذمہ دار حیدری
کو ٹھہرانا نامناسب ہے۔ اس لئے کہ وہ محض مترجم تھے ۴ تاریخ نادری فارسی
تصنیف "جہاں کشائے نادری" کا ترجمہ ہے اصل مصنف مرزا مہدی ہیں ۵۔
گل مغفرت یہ روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے اس کا سن تصنیف ۱۲۱۸ھ ہے ۶
"گلزار دانش" یہ فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش مصنفہ شیخ عنایت اللہ کا اردو ترجمہ
ہے جس میں عورتوں کی بد دیانتی اور مکاری کے قصے درج ہیں۔ ۷ ہفت پیکر
نظامی کی مشہور مثنوی ہفت پیکر کا جواب ہے ۸ قصہ مہر و ماہ یہ کتاب نایاب
ہے ۹ گلدستۂ حیدری متفرق تالیفات ہیں مزاقی حکایات لطائف
غزلیات و قصائد وغیرہ شامل ہیں یہ کتاب بھی کمیاب ہے

نہال چند لاہوری

اس کے متعلق صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ دلی کا رہنے والا تھا لیکن لاہور میں زیادہ رہنے کی وجہ سے لاہوری کہلائے کپتان ولورٹ کی سفارش سے ڈاکٹر گل کرائسٹ نے ۱۸۰۱ء میں کلکتہ بلا کر فورٹ ولیم کالج میں جگہ دی۔ نہال چند لاہوری نے کئی ایک کتابیں لکھیں ان میں سے زیادہ مشہور مذہب عشق ہے جس کا دوسرا نام قصہ گل بکاؤلی ہے جو فارسی کے قصے کا ترجمہ ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۸۰۳ء ہے

مرزا کاظم علی جوان

مرزا کا وطن دہلی تھا مگر لکھنؤ کی قدر دانی اور دلکشی نے اپنی طرف رجوع کیا اور یہیں آکر رہنے لگے۔ جب ان کی قابلیت کے جوہر نمایاں ہوئے تو کرنل اسکاٹ نے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے لئے ان کو منتخب کیا۔ لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر مرزا نے کلکتہ آباد کیا اور وہاں اکثر کتابوں کا ترجمہ کیا فہرست حسب ذیل ہے

ا شکنتلا یہ کالیداس کا سنسکرت میں لکھا ہوا مشہور ڈرامہ ہے جس کو کہ نواج شاعر نے برج بھاشا میں پیش کیا تھا۔ جواں نے برج بھاشا سے اردو میں منتقل کیا۔ کاظم علی جواں کی یہ شکنتلا اردو کا ڈرامہ ہے ۲ بارہ ماسہ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں کا بیان ہے ۳ تاریخ فرشتہ اس مشہور تاریخ کے ایک حصہ کا کاظم علی جواں نے اردو میں ترجمہ کیا۔

ان کتابوں کے علاوہ جواں نے قرآن مجید کے اردو ترجمے کو بھی درست

کیا مولوی حفیظ الدین کی کتاب خرد افروز پر نظر ثانی کی اور شعراء کے کلیات
کے انتخاب میں بھی مدد دی

مظہر علی خاں ولا

ان کا اصل نام مرزا لطف علی تھا مگر عرف عام میں مظہر علی خاں کہلاتے تھے
ان کے والد کا نام سلیمان علی خاں تھا اور وداد تخلص فارسی کے اچھے شاعر تھے وطن
دلی تھا مظہر علی خاں ولا فارسی سنسکرت، ہندی کے عالم تھے مرزا جان طپش اور نن کے
شاگرد تھے خوش قسمتی سے ان کو بھی فورٹ ولیم کالج میں جگہ مل گئی یہاں رہ کر انہوں
نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا مثلاً ا مادھونل اور کام کندلا موتی رام کوی تیسر
کی ہندی کتاب کا ترجمہ جو ۱۸۰۰ء میں ختم ہوا ۲ ہفت گلشن ناصر علی خاں کی فارسی کتاب
کا ترجمہ ۱۸۰۱ء میں ختم ہوا ۳ بیتال پچیسی بیتال نامی ایک شخص کی ۲۵ کہانیاں سنسکرت
میں لکھی گئی تھیں پھر کسی نے برج بھاشا میں اس کو منتقل کیا ولا نے برج بھاشا
سے اردو میں ترجمہ کیا ۴ تاریخ شیر شاہی فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ترجمہ
۱۸۰۵ء میں ختم ہوا ۵ جہانگیر نامہ تزک جہانگیری کے ایک حصے کا ترجمہ ہے
ولا کا ایک دیوان بھی اردو میں ہے مگر نایاب ہے ۔

بینی نرائن

جہاں تخلص کرتے تھے لاہور کے رہنے والے تھے، انھوں نے ایک فارسی قصہ کا ترجمہ کر کے
"چہار گلشن" نام رکھا جس میں بادشاہ کیواں اور فرخندہ کے حالات ہیں ۱۸۲۹ء میں
"تنبیہ الغافلین" کا بھی ترجمہ اردو میں کیا دیوان جہاں کے نام سے ایک تذکرہ بھی ان کی یادگار ہے

۲

فورٹ ولیم کالج سے باہر

فورٹ ولیم کالج کا اثر تمام ہندوستان پر پڑا مگر اس سے انکار نہیں کیا
جا سکتا کہ دہلی اور لکھنؤ بھی اردو ادب کے لئے آفتاب اور ماہتاب
کا کام کر رہے تھے۔ یہاں کے رہنے والوں نے بھی کچھ کم کام نہیں کیا۔
چند ممتاز نثر نگاروں کا حال اور کارنامہ قابل ذکر ہے

فقیر محمد خاں گویا

ان کا نام فقیر محمد خاں تھا اور گویا تخلص۔ فن شعر میں ناسخ کے شاگرد تھے
شاہی زمانے میں رسالدار تھے اور حسام الدولہ خطاب عطا ہوا تھا۔ زمانے کا
انقلاب کہئے یا اردو کی خوش قسمتی سمجھئے کہ اس بہادر سپاہی نے تیغ قلم سے بھی وہ کام
لیا کہ میدان ادب میں آج تک ان کا نام نمایاں ہے فارسی کی انوار سہیلی ایک زمانے
میں مقبول عام تھی چنانچہ ایک روز شیخ ناسخ اور میاں فرح وغیرہ ایک صحبت میں
بیٹھے انوار سہیلی کی تعریف کر رہے تھے تعریف میں کچھ ایسا مبالغہ ملا کہ چند لوگوں
نے کہا کہ یہ کتاب اگر اردو میں بھی آجائے تو کیا عجب کہ زبان کے لئے مفید

اور دلچسپ ساماں ہو جائے سب کی منظر انتخاب فقیر محمد خاں گویا پر پڑی جنھوں نے
اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا بلکہ حقیقت میں گویا نے ترجمہ ہی تک اپنے ذہن رسا کو
محدود نہیں رکھا بلکہ غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ برائے نام ترجمہ ہے ورنہ گویا نے
عبارت کے لحاظ سے تصرف سے کام لیا ہے جہاں یہ دیکھا کہ اصل کتاب میں قصہ
کسی موقع پر طولانی سے طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے تو وہاں اختصار سے کام لیا ہے
جہاں اصل کتاب میں کوئی مزیدار بات مختصر لکھ دی گئی ہے وہاں دلچسپی کو مدنظر رکھتے
ہوئے بیان کو کسی قدر طول دیا ہے

اس کتاب میں گویا نے عربی اور فارسی الفاظ ضرورت سے زیادہ استعمال
کئے ہیں جس کی وجہ سے روانی اور شگفتگی کم ہو گئی ہے مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ
گویا کا زمانہ آج کا زمانہ نہ تھا کہ جس میں لوگ فارسی اور عربی سے بیگانہ ہو گئے
ہیں بلکہ اس وقت فارسی اور عربی کا عام چرچا تھا۔ اسی وجہ سے گویا کی یہ کتاب
بہت مقبول ہوئی ابھی اس کتاب کے متعلق گویا نے جو خود رائے ظاہر کی ہے
وہ بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں :۔ جس نے انوار سہیلی کو دیکھا ہوگا اور اس سطر
تامل سے مطالعہ کرے گا اس پر خود منکشف ہو جائے گا کہ گویا صورت کتاب کی
اور ہی ہو جائے گی برائے نام ترجمہ کیا جاتا ہے ورنہ یہ کتاب حقیقت میں جدا
جدا ہے لیکن حق یوں ہے کہ یہ احسان نقاش اول کا ہے۔ ورنہ مجھ سے بے مایہ
کو کہاں طاقت اس کے بیان کی تھی۔"

اس لحاظ سے گویا کے اس ترجمہ کو جس کا نام انھوں نے بستان حکمت رکھا ہے
تصنیف کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا بستان حکمت سنہ ۱۲۵۱ھ بوقت صبح صادق
ختم ہوئی گویا کا انتقال سنہ ۱۲۶۶ھ مطابق سنہ ۱۸۵۰ء میں ہوا ان کا دیوان ان
کے مرنے کے بعد شائع ہوا

مرزا رجب علی بیگ سرور

ان کے والد کا نام مرزا اصغر علی تھا۔ سرور لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ سال پیدائش ۱۲۰۱ھ ہے سرور نے محض عربی اور فارسی کی تعلیم یہیں حاصل کی مختلف فنون مثلاً خطاطی، موسیقی میں بھی وہ دستگاہ رکھتے تھے۔ مزاج میں شگفتگی، ظرافت کی حد تک تھی نہایت یار باش آدمی تھے مرزا غالب ان کے دوستوں میں تھے۔ چنانچہ ان کی دو کتابوں پر مرزا نے تقریظیں بھی لکھی ہیں۔

۱۲۴۰ھ میں غازی الدین حیدر نے کسی بات پر ناراض ہو کر سرور کو جلاوطن کر دیا لیکن نصیر الدین حیدر نے پھر سرور کو لکھنؤ بلا لیا اور ۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ نے اپنے درباری شعرا میں پچاس روپے ماہوار کی جگہ دی لیکن جب سلطنت کو زوال ہوا تو سرور کا بھی کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ کچھ دنوں تک ادھر ادھر سے اعانت ہوتی رہی بالآخر ۱۸۵۷ء میں کوئی بھی سہارا نہ رہ گیا۔ ۱۸۵۹ء میں مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ والئی بنارس نے اپنے یہاں بلا لیا۔

سرور کو اکثر دہلی، لکھنؤ، میرٹھ اور راجپوتانہ بھی جانا پڑا جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے آنکھ کے علاج کے لئے کلکتہ بھی دیکھ آئے تھے ۱۸۶۷ء میں بنارس میں انتقال ہوا۔

سرور کا سب سے بڑا کارنامہ فسانۂ عجائب ہے یہ ایک حسن و عشق کا افسانہ ہے جس کی عبارت نہایت پرتکلف مقفیٰ اور مسجع ہے ہر جگہ رنگینی اور دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کسی زمانے میں یہ رنگ پسند عام تھا۔ یہ کتاب نہایت پسندیدہ نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ اب زمانہ کا رنگ بدل گیا جس طرح سرور وغیرہ سیدھی سادی عبارت کو ہنستے تھے اسی طرح اب ان کی تصنیفات کی عبارت

کی وجہ سے ناپسندیدگی کی شکار ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ طرزِ تحریر تکلیف دہ اور غیر فصیح ہے یعنی خیالات کو آسانی اور آزادی کے ساتھ نہیں لکھ سکتے کیونکہ ہر قدم پر قافیہ، تشبیہ، استعارے کے علاوہ وزن کی تلاش رہتی ہے اس میں قابلیت اور زبان پر پوری دسترس کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ فسانہ عجائب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک معمولی قصے کو بھی ایک اچھا انشا پرداز کیونکر دلکش اور رنگین بنا سکتا ہے

سرور کی تصانیف کئی ایک ہیں شمشیر خانی کا ترجمہ واجد علی شاہ کے حکم سے ۱۸۴۷ء میں کیا اور اس کا نام سرور سلطانی رکھا یہ فردوسی کے شاہ نامہ سے ماخوذ ہے 'حدائق العشاق' کا ترجمہ مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ کی فرمائش سے کرکے "گلزار سرور" نام رکھا ان کے علاوہ چند کتابیں اور بھی ہیں جن میں کہ چھوٹے چھوٹے قصے ہیں "افسانۂ سرور" اور "شگوفہ محبت" بھی ان کی یادگار ہیں

سرور کی تحریر کا ہر جگہ وہی عالم ہے جو فسانہ عجائب کے متعلق لکھا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس رنگ کے لکھنے والوں میں سرور کا پایہ سب سے بلند ہے۔

غالب

خدا کی دین کہ جس طرح ان کا مرتبہ نظم میں عدیم المثال ہے ویسا ہی نثر کے میدان میں بھی اپنی سادگی، الٹے لہجہ اور بیباکیت کی وجہ سے بے نظیر ہے تعجب تو یہ ہے کہ نظم میں جو شخص دقیق الفاظ کا گرویدہ ہو وہ نثر کے میدان میں آکر اس قدر سہل سلیس، شیریں اور دلچسپ طرز کا دلدادہ کیونکر ہوا۔

سب سے قابل قدر اور اہم بات جس کا اثر اردو پر پڑا وہ غالب کے خطوط

اور رقعات ہیں جس میں انھوں نے ایک نرالا ڈھنگ اختیار کیا ہے یعنی القاب آداب کا فرسودہ طریقہ چھوڑ کر وہ روش اختیار کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سامنے بیٹھا ہے جس سے مخاطب ہوتے ہیں کبھی میاں کبھی مہاراج اور کبھی مکتوب الیہ کا نام لے کر حال لکھنا شروع کر دیتے ہیں حالات بھی اس قدر دلچسپ پیرائے میں لکھتے ہیں کہ دل پر فوراً اثر ہو۔ موقع اور محل کا ہر جگہ لحاظ رہتا ہے جہاں کسی منظر کا نقشہ کھینچتے ہیں وہاں معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز پوری طرح ہماروں کے سامنے آ گئی۔

ان کے خطوط سے ان کے مزاج کی شوخی اور مزاح جا بجا مترشح ہیں جس سے شگفتگی دوبالا ہو جاتی ہے۔ ان ہی خطوط میں ایسے خطوط کی بھی کافی تعداد ہے جس میں ادبی اور علمی بحث ہے۔

خطوط کے علاوہ بھی مرزا غالب کا نثر میں کارنامہ ہے جس میں چند تقریظیں دیباچے اور رسالے ہیں جو برہان قاطع کی موافقت میں لکھے گئے ہیں لیکن تقریظوں اور دیباچوں میں مسجع اور مقفی عبارتیں ہیں جو کم و بیش رجب علی سرور کے رنگ میں ہیں۔ غالباً اس زمانے کے لوگوں کا مذاق دیکھ کر مرزا غالب نے اس تحریر کو بھی روا رکھا سب سے بڑی چیز ان کے خطوط اور رقعات ہیں جن کی وجہ سے اردو نثر میں سادگی صفائی اور روانی پیدا ہو گئی اور اس کی دلکشی اتنی عام ہوئی کہ اردو ادب کو ایک نیا میدان مل گیا جس پر آج تک لوگ گامزن ہیں۔

ماسٹر رام چند

ان کا ذکر "سیر المصنفین" جلد اول میں یوں لکھا ہے کہ پہلے آپ سرکار انگلشیہ کی

ملازمت میں بہ عہدہ مدرسی علوم انگریزی کی تعلیم دہلی کالج میں دیتے تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ وغیرہ آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ انہوں نے تحت مباحثے کے بعد عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا آپ ریاست پٹیالہ میں ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم بھی مقرر ہو گئے تھے

ماسٹر رام چندر کی علمی قابلیت انگریزی تک محدود نہ تھی بلکہ عربی، فارسی، اردو میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے اور انہیں زبانوں کے فیض سے آپ نے ایک کتاب ایسی تصنیف کی جس نے ان کا نام اب تک زندہ رکھا ہے اس کتاب کا نام تذکرۃ الکاملین ہے۔ اس میں دنیا کے بہت سے نامور اہل فن کا تذکرہ ہے

آپ نے اردو کی صرف یہی خدمت نہیں کی بلکہ اصول علم ہیئت اور عجائب روزگار دو اور کتابیں لکھ کر اردو کے خزانے میں اضافہ کیا۔ یہ کتابیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہ صرف اس وقت قابل قدر تھیں بلکہ آج بھی کارآمد اور ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ کئی ایک کتابوں کے ترجمے بھی ماسٹر رام چندر کی یادگار ہیں۔ ان ترجموں کا موضوع زیادہ تر ریاضی ہے

ماسٹر رام چندر کا طرز تحریر نہایت سلیس اور رواں ہے۔ نہ مقفی و مسجع عبارت ہے اور نہ تشبیہ و استعارات کی بھرمار۔ عربی کے الفاظ خاص خاص ضرور ہیں لیکن نہایت احتیاط کے ساتھ صرف کئے گئے ہیں۔ زیادہ تر عام فہم اور روزمرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں ماسٹر رام چندر کی ولادت غالباً ۱۸۱۶ء میں ہوئی تھی وفات کا سال معلوم نہیں۔

غلام امام شہید

ان کے والد کا نام شاہ غلام محمد تھا قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے

لکھنؤ کے سربرآوردہ شعرا میں شمار کئے جاتے تھے سلم میں قتیل اور مصحفی کے شاگرد تھے
فارسی نثر و نظم میں آغا سید اسمٰعیل مازندرانی سے اصلاح لی تھی
الہ آباد میں بیکار رہتے لیکن آپ کی قدر و منزلت ہر چہار طرف ہوتی تھی،
چنانچہ حیدرآباد سے چار سو تیس روپے سالانہ بطور وظیفہ کے مقرر تھے جو آخیر
وقت تک ملتے رہے

نواب کلب علی خاں بھی آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ تہید اپنا کلام جمع
نہیں کرتے تھے لیکن زمانہ کے دست برد سے جو کچھ بچ رہا ہے۔ وہ مجموعہ
میلاد شریف "الکتاب" بہار بے خزاں اور چند قصائد و غزلیات ہیں۔
آپ کی تحریر پرانے زمانے کے رنگ کی تھی یعنی قافیہ پیمائی اور رنگینی
سے عبارت خالی نہیں لیکن پھر بھی سلاست اور دلچسپی ہاتھ سے نہیں جانے
پائی بیان میں شاعرانہ تصرف ضرور ہے لیکن زور بھی کافی ہے تاج گنج
کے روضہ کی جو تعریف لکھی ہے وہ اس رنگ کے لحاظ سے بہتر ہے مگر لفظی
عنصر تصنع اور مبالغہ کے پردے میں پارہ ہو جاتا ہے

غلام غوث بیخبر

ان کے والد کا نام خواجہ حضور اللہ تھا بزرگوں کا اصلی وطن کشمیر تھا
لیکن خواجہ حضور اللہ کشمیر سے تبت چلے گئے تھے اور وہاں سے ریاست
نیپال میں آکر بود و باش اختیار کرلی تھی یہیں غلام غوث ۱۲۴۰ھ میں پیدا
ہوئے ابھی ان کی عمر صرف چار سال کی تھی کہ ان کے والد کو نیپال چھوڑ کر
بنارس آنا پڑا چنانچہ ان کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت یہیں ہوئی اور ۱۸۴۲ء

میں اپنے چانوجان بہادر مولوی سید محمد جان کی ماتحتی میں جو نواب لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی تھے ملازم ہو گئے اور نہایت خوبی کے ساتھ فرائض منصبی انجام دیتے رہے ۱۸۸۸ء میں پنشن لی اور خان بہادر و ذوالقدر کا خطاب عطا ہوا۔ اور ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا

بیخبر کی دو تصنیفیں یادگار ہیں ایک کا نام "فغان بیخبر" اور دوسری کا "فغان بے خبر" ہے۔ اس وقت کے انشا پردازوں میں سے خبر بہت مشہور تھے۔ ان کی عبارت میں رنگینی اور تصنع ضرور ہے لیکن مقفیٰ و مسجع نہیں نہ فارسی اور عربی کی بھرمار ہے تشبیہہ اور استعارے سے بیخبر کو کافی دلچسپی ہے رعایت لفظی اور مبالغہ سے بھی کام لیتے ہیں چنانچہ ایک جگہ غلام امام شہید کی تعریف میں کہتے ہیں "اب ان کی اردو سے سودا کی روح کو سودا ہوگا میر اپنا مرثیہ کہتے جائے گا ہوس کو پہلے ہی سے سوجھی جو یہ تخلص اختیار کیا یعنی دریردہ معذرت چاہی کہ میں تو ہوس کرتا ہوں کمال حق اور کسی کا ہے۔ ستم کو بھی ان کی خبر پہنچ گئی تھی کہ آتش رشک سے جل کر یہ تخلص اپنے حسب حال رکھا یا سچ اب ہوتا تو مصحفی سے تخلص اپنا منسوخ مشہور کرتا۔ آتش نہ مرتا تو کیسا جلتا۔

یہ مختصر سی فہرست اور کارنامہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے حدمت قدیم کے ماہر رہ کر اردو کی خدمت کی تھی۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ادیب ہیں جن کو طول کلام کی وجہ سے نظر انداز کر دینا پڑا یہاں تک ضرور یہ کہنا مقصود تھا کہ غدر یا غدر کے قریب تک اردو زبان کس حد تک ترقی کر چکی تھی لیکن تاریخ نامکمل رہ جائے گی اگر ہم دہلی کالج سوسائٹی کا تذکرہ نہ کریں۔ یہ سوسائٹی ۱۸۴۲ء میں قائم ہوئی تھی اور انگریزی سے اردو میں بہت سی کتابیں اس کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

جون ۱۹۲۰ء کے معارف میں سید سلیمان ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں موصوف نے اردو کی ان کتابوں کی فہرست دی ہے جو انڈیا آفس لندن میں انھوں نے دیکھی تھیں اسی فہرست کے متعلق لائق مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "مطبوعہ اردو کتابوں کی اہمیت بھی یہاں میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے مغرور ہونا پڑا الحمد اللہ اللہ ہماری زبان بھی اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ تین سو صفحے میں اس کی فہرست تیار ہوئی ہے یہ فہرست ۱۹۰۰ء میں چھپی ہے اس لئے موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں اس فہرست میں شامل نہیں ہیں اس فہرست کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ اردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی دوسری بات یہ نظر آئی کہ اس زبان کو علمی زبان بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہل علم کا برابر کا ساجھا ہے"

فہرست مذکورہ بالا میں چھ موضوعات پر کتابیں نظر آتی ہیں اور ہر ایک کا نام اور قابل قدر ہر ایک عنوان ملاحظہ ہو۔

۱۔ علوم و فنون جس میں زراعت صنعت و حرفت ہیئت و نجوم، اخلاق علم الحرب، موسیقی طبیعیات وغیرہ شامل ہیں ۲ تاریخ و جغرافیہ اس میں عام تاریخ اور سوانح عمری بھی ہے۔ ۳ ادبیات اس میں ڈراما تنقید، دواوین قصص وغیرہ ہیں ۴۔ کتب تعلیمی اس تحت میں قواعد مختلف زبانوں کی ریاضیات، علم المساحت علم وزن و پیمائش سب ہی کچھ ہیں ۵ الٰہیات مختلف مذاہب کے عقائد و مسائل کے علاوہ مذاہب و مناظرہ کی کتابیں بھی ہیں ۶ متفرقات اس میں تقریروں اور مضمونوں کا مجموعہ ہے بچوں اور عورتوں کی تعلیم کے متعلق رائے دی گئی ہے اس فہرست میں کتابوں اور مضمون کے نام بھی دئیے ہیں اور جملہ کتابیں چھپی ہوئی "انڈیا آفس لندن" میں موجود ہیں مگر بدقسمتی سے غالباً ہندوستان میں نہیں

اس کہ کوئی تنقید کی جائے۔ بہر حال یہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ اردو زبان
غدر سے پہلے ہی علمی زبان بن گئی تھی اس فہرست کو چھوڑ کر جن کتابوں اور مصنفوں
کا ذکر ہم نے اس دور میں کیا ہے ان کو دیکھتے ہوئے اگر فورٹ ولیم کالج سے باہر
نکلئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی عبارت عام طور پر رنگین اور کبھی کبھی مقفیٰ اور مسجع
بھی ہے۔ زور کلام بیشک پہلے سے زیادہ ہے

مطبع اور زبانوں کے حصوں نے اردو کی ترقی میں مدد دی ایک چھاپہ کی ایجاد
بھی تھی ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کے وقت میں لوہے کے حروف کا رواج ہوا جن
میں فورٹ ولیم کالج سے اکثر کتابیں شائع ہوئیں مگر اول تو خرچ زیادہ پڑتا
اور دوسرے حروف زیادہ خوبصورت نہ تھے جس سے مقبول عام نہ ہو سکے۔

۱۸۳۰ء میں لیتھو کا کارخانہ کانپور میں کھولا گیا۔ جو لوہے کے حروف
سے بہتر ثابت ہوا۔ دلی میں بھی ایک ایسا ہی چھاپہ خانہ ۱۸۳۷ء میں کھولا گیا
نصیر الدین حیدر نے کانپور سے مسٹر آرچر (جنھوں نے کانپور میں لیتھو کی ابتدا
کی تھی) کو لکھنؤ بلایا اور یہاں بھی ایک عمدہ چھاپہ خانہ قائم کر دیا جس کی وجہ
سے کتابوں کی اشاعت میں بہت بڑی سہولت ہوگئی۔ چھاپہ کی بدولت اردو
میں اخبارات بھی نکلنے لگے جس سے لوگوں کو نہ صرف حالات ہی معلوم ہونے
لگے بلکہ مغربی خیالات کا بھی اندازہ ہوا۔ جس سے متاثر ہو کر اردو کا انداز بیاں
بھی بدلا جانا ضروری سمجھا گیا اب اردو کی یہ قدر و منزلت ہوئی کہ ۱۸۳۲ء میں
بجائے فارسی کے سرکاری زبان قرار دی گئی کیونکہ فارسی سے بے نیاز ہو کر اس
وقت تک اردو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوگئی تھی

۳

نثر کی ترقی

سرسید

آپ کی ولادت دہلی میں ۱۸۱۷ء میں ہوئی۔ ان کے آباؤ اجداد شاہجہاں کے وقت میں ہمدان اور ہرات میں کام کرتے ہوئے ہندوستان آئے اور اسی وقت سے شاہی دربار میں رسائی ہوئی جس کا سلسلہ عالمگیر ثانی کے وقت تک قائم رہا۔ جنھوں نے سرسید کے دادا کو جواد الدولہ کا خطاب بھی دیا۔ اکبر شاہ ثانی نے سرسید کے والد میر متقی کو عہدۂ وزارت کے لئے نامزد کیا مگر انھوں نے اپنی قناعت پسندی کی وجہ سے انکار کر دیا

سرسید کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ کے زیر سرپرستی ہوئی ۱۸۳۷ء میں سرسید نے ملازمت کر لی اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے صدر امین کے درجہ تک پہنچے

علم کا ذوق ایسا نہ تھا جس کو کبھی وہ بھول سکتے کتابوں کا مطالعہ ہمیشہ کرتے رہے چنانچہ ملازمت ہی کی حالت میں اپنی مشہور کتاب "آثار الصنادید" تصنیف کی اور بھی کئی کتابیں نوکری کے زمانے میں لکھیں ۱۸۶۲ء میں حق عادی اور

بدل کر آئے تو یہاں ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان عصر کی ترقی اور خیالات سے آگاہ ہوتے رہیں، اس سوسائٹی میں اکثر رسالے مختلف موضوع پر نکالے گئے جس میں زراعت اور اقتصادیات بھی شامل ہیں

۱۸۶۱ء میں انگریزی اسکول مراد آباد میں اور ۱۸۶۴ء میں دوسرا اسکول غازی پور میں کھولا اور ایک انجمن قائم کی جس کا نام برٹش انڈیا ایسوسی ایشن تھا ان کو مسلمانوں کی اصلاح کا خیال شروع سے تھا چنانچہ ۱۸۶۹ء میں ولایت جا کر وہاں کے لوگوں کے اخلاق اور طرز معاشرت کا معائنہ اس لئے کیا کہ ہندوستان چل کر یہاں کی عمدہ باتوں کو مسلمانوں میں رائج کیا جائے سال بھر کے بعد ہندوستان واپس آئے اور یہاں آ کر منصوبے کی تکمیل کے لئے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس میں مدنی اور اخلاقی مضامین ہوتے تھے۔ منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کے خیالات میں وسعت اور ترقی پیدا ہو جائے۔

سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ کالج ہے پنشن لینے کے بعد انھوں نے اس کالج کی ترقی کے لئے ہمہ تن کوشش ہو کر کام کیا ۱۸۷۷ء کے شروع میں کالج کا بنیادی پتھر لارڈ لٹن کے ہاتھوں سے رکھا گیا۔ اس وقت سے سرسید نے مرتے دم تک جس جانکاہی اور دور اندیشی سے اس کالج کی ترقیوں کی فکر کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ۱۸۹۸ء میں سرسید نے طویل عمر پا کر انتقال کیا اور اپنے محبوب کالج کی مسجد میں دفن کئے گئے۔

قوم اور ملک کے ساتھ جو کچھ سرسید نے احسان کیا وہ ہمارے موضوع بحث سے دور ہے فی الحال ہم کو اردو ادب سے سروکار ہے اور صرف یہ دیکھنا ہے کہ سرسید نے اردو کی کیا خدمت کی۔ مسلمانوں کی ترقی کے لئے ان کو یہ خیال ہوا کہ جب تک ان کی مادری زبان کی ترقی نہ ہوگی، قومی ترقی بھی مشکل

سے ہو گئی۔ لہذا انھوں نے اس کی بھی اصلاح کی فکر کی۔ سرسید سے پہلے جیسا آپ نے دیکھا ہوگا رنگین مقفیٰ اور مسجع عبارت پسند عام تھی۔ جس میں خیالات کا اظہار آسانی سے نہیں ہو سکتا تھا بےشک مرزا غالب نے خطوط میں سلاست اور سادگی اختیار کی لیکن کوئی علمی کارنامہ مشکل سے اس انداز بیان کے ساتھ لکھا گیا ہوگا۔ ہمارے نزدیک حالی "سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو نثر میں بھی مضامین کو سادگی۔ متانت کے ساتھ لکھنا شروع کیا

سرسید کی عبارت عام طور سے تشبیہات و استعارات وصنائع و بدائع سے پاک ہے جس بات کو لکھتے ہیں اس کو دلیل سے مضبوط کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور مشکل سے مشکل مضمون کو نہایت آسانی کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں ان کی تحریر میں سچائی اور بے باکی خاص جوہر ہیں الفاظ نہایت سیدھے سادے اور روزمرہ کے استعمال کرتے ہیں کہیں کہیں بذلہ سنجی اور شگفتگی بھی پائی جاتی ہے منظر اور موقع کی تصویر الفاظ سے نہایت خوبی کے ساتھ کھینچتے ہیں اتنا ضرور ہے کہ عبارت کبھی کبھی بے لطف و ناہموار ہو جاتی ہے وہ اپنے جوش اصلاح اور اظہار خیال میں اتنے آزاد تھے کہ قواعد کی پابندی اپنے لئے زیادہ ضروری نہیں سمجھتے تھے جو لفظ ان کا مفہوم پورا کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا اس کو وہ بلا استعمال کر جاتے تھے عبارت کبھی کبھی گنجلک اور اردو کا مزہ دے جاتی تھی محاورے بھی کبھی ثقیل آجاتے ہیں لیکن جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پہلا قدم اصلاح کے لئے اٹھتا ہے تو کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تب معمولی خامیاں بھی بے وقعت نظر آتی ہیں۔

یوں تو سرسید کی تصانیف کئی ایک ہیں مثلاً "خطبات احمدیہ" "آثار الصنادید" "تاریخ سرکشی بجنور" وغیرہ لیکن سب سے زیادہ اثر اردو پر تہذیب الاخلاق کا پڑا

جب مذہبی چھیڑ چھاڑ اس رسالہ میں شروع ہوئی تو جواب دینے والوں نے بھی
خوش قسمتی سے وہی طرز بیان اختیار کرنے کی کوشش کی جو خود سرسید کا تھا اور
چونکہ یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہا لہذا ایک اچھا ذخیرہ سلیس اور عام فہم اردو نثر
کا تیار ہو گیا۔ رفتہ رفتہ لوگ اسی رنگ میں لکھنے کے عادی ہو گئے چنانچہ اس
وقت سے ہر انشا پرداز نے یہی روش اختیار کر لی

محسن الملک

ان کا نام سید مہدی علی تھا۔ اٹاوہ کے رہنے والے تھے ۱۸۳۷ء میں وہیں
پیدا ہوئے عربی فارسی کی معمولی تعلیم حاصل کر کے دس روپیہ ماہوار پر کلکٹری میں ملازم
ہو گئے رفتہ رفتہ ترقی کر کے اہلکاری و سررشتہ داری کے مدارج کو طے کرتے ہوئے ۱۸۶۱ء
میں تحصیلدار ہو گئے۔

لکھنے پڑھنے کا شوق شروع ہی سے تھا چنانچہ ملازمت کی حالت میں قانون
کی دو کتابیں لکھیں جو عام طور پر پسند کی گئیں ۱۸۶۳ء میں مہدی علی ڈپٹی کلکٹری
کے عہدے تک پہنچ گئے

۱۸۶۷ء میں ریاست حیدر آباد نے ان کو اپنے یہاں کا انسپکٹر جنرل مالیات
بارہ سو روپیہ ماہوار پر مقرر کر دیا۔ اپنی کارگزاری کی بدولت ریاست میں بھی
انھوں نے بڑی ترقی کی رفتہ رفتہ اعلیٰ معتمد مال تین ہزار روپیہ ماہوار پر ہو گئے
حسن خدمات پر ریاست کی طرف سے محسن الدولہ، محسن الملک منیر نواز جنگ کا خطاب
عطا ہوا ۱۸۹۳ء میں پنشن لے کر علی گڑھ چلے آئے اور بقیہ عمر قومی خدمت اور
کالج کے انتظام میں صرف کی چنانچہ سرسید کے بعد علی گڑھ کالج کے سیکرٹری بھی ہو گئے۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں شملہ میں انتقال ہوا مگر علی گڑھ میں سرسید کے برابر دفن کئے گئے۔
سرسید کی جو خصوصیات محسن الملک میں بھی نظر آتی ہیں خواہ اس کو آپ سرسید کی
دوستی کا اثر سمجھیں یا ان کے ذاتی جوہر پر محمول کیجئے بہرحال انھوں نے بھی سرسید کی
طرح مذہب پر زیادہ گفتگو کی ہے اور بہت سے مضامین اس سلسلے میں لکھے ہیں۔
مضمون خواہ اخلاق پر ہو یا مذہب پر نہایت سلیس اور صفائی کے ساتھ لکھے ہیں عبارت
عام طور سے سلیس اور صاف ہوتی ہے کہیں کہیں پر ایسے طرز کی سنجیدگی یا رنگینی بھی
پیدا ہو جاتی ہے کبھی کبھی صنائع بدائع سے بھی کام لے لیتے ہیں سادگی اور
تاثیر محسن الملک کی دو خصوصیات ہیں جو اُن کی تحریر میں تمام نمایاں ہیں
محسن الملک اپنی خوش گویائی کی وجہ سے اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ ممتاز
تھے ان کی تقریر میں کہیں کہیں طنز کے ٹکڑے نہایت پُرلطف اور کارآمد نظر آتے ہیں
جوش بیان، زور تحریر، توازن عبارت و خیال جتنا محسن الملک کے یہاں ہے ان کے
کسی ہمعصر کے یہاں نہیں "ڈاکٹر عابد حسن بلگرامی اپنی تصنیف 'چند تنقیدی مضامین'
میں رقمطراز ہیں کہ ان کا اسلوب بیان اس صداقت کا اظہار ہے جو کہ خود اُن کا
ایمان تھا"

چراغ علی

چراغ علی کے بزرگوار کشمیر کے رہنے والے تھے لیکن ان کے دادا ایک سلسلۂ ملازمت
پنجاب چلے آئے بعد میں میرٹھ میں سکونت اختیار کرلی۔ چراغ علی کے والد کا نام
مولوی محمد بخش تھا چراغ علی سنہ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد کا انتقال
سنہ ۱۸۵۶ء میں ہوا گویا دس سال کے سن میں سایہ پدری سے محروم ہوگئے۔
چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیر سایہ ابتدائی تعلیم حاصل کی لیکن

بہت معمولی طور سے گو انگریزی فارسی اور دوسرے کچھ پڑھا لیکن ایک محدود درجے تک گھر کی ذمہ داریوں نے فرصت نہ دی کہ یکسو ہو کر تحصیلِ علم کرتے فکرِ معاش نے مجبور کر دیا چنانچہ گھر چھوڑ کر ضلع بستی کے محکمہ تعلیم میں بیس روپیہ ماہوار پر نوکری کر لی مگر علمی ذوق جو اُن کی فطرت میں تھا وہ چین نہ لینے دیتا تھا مطالعۂ کتب فرصت کے وقت جاری رہتا اور علمی قابلیت یہاں تک بڑھائی کہ کئی زبانوں کے ماہر ہو گئے نہ صرف عربی اور فارسی کے عالم تھے بلکہ انگریزی لاطینی اور یونانی سے بھی واقف تھے انگریزی زبان میں کتابیں بھی لکھیں جن کی تعریف انگلستان کے اخبارات میں بھی کی گئی۔

چراغ علی نے نہ صرف علمی ترقی کی بلکہ ملازمت میں بھی ممتاز عہدہ پر پہنچ گئے رفتہ رفتہ ترقی کر کے ڈپٹی مصری اور تحصیلداری تک پہنچے۔ ان کو مذہبی مباحث میں بھی کافی دلچسپی تھی تقریر بھی کرتے تھے اور مضامین بھی لکھے تھے جن کی وجہ سے سر سید سے تعارف حاصل ہو گیا جن کی کوششوں سے چراغ علی کو حیدر آباد میں جگہ مل گئی۔ اور وہاں نہ عہدۂ مددگار معتمد مال گذاری چار سو روپیے ماہوار پر مقرر ہو گئے لیکن وہ اپنی اعلیٰ قابلیت اور حسنِ اسلوبی سے انھوں نے انجام دیا کہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے معتمد مال کے جلیل القدر مرتبہ پر فائز ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۸۹۵ء میں ہوا۔

چراغ علی کی ترقی کا راز ان کی قابلیت، صداقت اور دیانتداری میں مضمر ہے سرکاری کام کو وقت پر انجام دیتے اس کے بعد جو وقت بچتا تھا اس میں پڑھنے لکھنے کا شغل برابر جاری رہتا مشکل سے کوئی لمحہ بیکار جانے دیتے تھے۔ بہت سی کتابیں سرکاری امور پر مثلاً بجٹ، جاگیرات وغیرہ پر لکھیں جو نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئیں علاوہ ان کے مذہبی کتابیں بھی کئی ایک ہیں۔

تہذیب الاخلاق میں بھی آپ کے مضامین برابر نکلتے رہے

چراغ علی کی تصانیف دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضامین کو دلائل سے مضبوط کرنے کے عادی ہیں ایسے برے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں ان کی نظر زیادہ تر نفس مضمون پر رہتی ہے ادھر ادھر کی باتوں میں نہیں الجھتے۔ واقعات کی چھان بین میں انتہائی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کی تصانیف میں ادبی شان بہت کم ہوتی ہے۔ عبارت عام طور سے روکھی پھیکی ہے عبارت آرائی و رنگینی مفقود ہے

چراغ علی کا انتقال ۱۵ جون ۱۸۹۵ء کو بمبئی میں ہوا۔ ان کو تمام باتوں سے زیادہ مذہب سے دلچسپی تھی اس لئے ان کی تصانیف کا موضوع زیادہ تر مذہب ہی ہے

آزاد

آزاد کے حالات نظم کے حصے میں لکھے جا چکے ہیں۔ یہاں ہم کو صرف ان کی نثری خدمات کا تذکرہ کرنا ہے حقیقت یہ ہے کہ آزاد کا مرتبہ خدمات اور احسانات کی وجہ سے قریب قریب اردو کے تمام انشاپردازوں سے بلند نظر آتا ہے۔

آزاد کی ہمہ گیری اور تبحر علمی اور اردو کی محبت نے اردو ادب کو تنگنائے خیال اور مضامین سے نکال کر کئی ایک نئے میدان دکھائے نظم کے سلسلے میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ نظم جدید کی ایجاد کا سہرا آزاد ہی کے سر ہے نثر میں آب حیات لکھ کر انھوں نے نہ صرف اردو ادب کی تاریخ کو صحیح راستہ پر لگا دیا بلکہ فن تنقید کا بھی معیار اردو میں قائم کر دیا آب حیات سے پہلے شعرائے اردو کے حو

تذکرے لکھے گئے تھے وہ اس قدر نامکمل تھے کہ صحیح حالات اور کمالات کا پتہ چلنا دشوار تھا آزاد نے اس کی درستی کے لئے ایک عمر تک جانفشانی اور کاوش سے کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آبحیات ایک ایسی جامع اور مکمل تاریخ ادب اردو دنیا کے سامنے پیش کردی کہ آج تک جو شخص تاریخ ادب اردو کے میدان میں قدم رکھتا ہے وہ بغیر آبحیات کی مدد کے قلم نہیں اٹھا سکتا۔ مصنف گل رعنا غالباً سب سے زیادہ آزاد کے نکتہ چیں ہیں لیکن آب حیات اور گل رعنا کے مضامین کو ساتھ رکھ کر پڑھئے تو بعض مقامات ایسے ملیں گے کہ جس میں مصنف نے نہ صرف واقعات آب حیات سے لئے ہیں بلکہ بارہ کا بارہ آب حیات ہی کی عبارت سے بغیر کسی اعتراف کے آزادی کے ساتھ لیا ہے۔ یحقیق کیا ہے کہ آزاد آب حیات لکھتے وقت میرانیس کا شعر پڑھتے جاتے ہوں ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اس کتاب سے اکثر لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ آزاد نے تحقیق سے کام کم لیا ہے اس کا جواب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا نے اپنی کتاب "سیر المصنفین" جلد دوم کے صفحات ۲۷۴ تا ۲۷۷ پر جس عنوان سے دیا ہے وہ قابل غور ہے۔ آزاد نے ایک دوسرا میدان بھی اردو ادب کو دکھایا ہے انگریزی اور یونانی ادب سے متاثر ہو کر ایسے اخلاقی اور نتیجہ خیز خیالی فسانوں کی بنیاد ڈالی جو غالباً اردو کے لئے قریب قریب بالکل ہی نئی چیز تھی کیونکہ آزاد کی نیرنگ خیال سے پہلے کوئی مستقل تصنیف اس موضوع پر نہیں ملتی انگریزی میں اس قسم کے افسانوں کا نام الی گیری (ALLEGORY) ہے جس کو اردو والے رمز یہ کہتے ہیں اس عنوان پر مولانا کی نیرنگ خیال ایک مستقل کتاب ہے جو مضمون اور طرز تحریر دونوں لحاظ

سے بہت دلچسپ ہے، یہ امر اور بھی قابل داد ہے کہ آزاد انگریزی علم سے بہت کم واقف تھے مگر اس کتاب کے لکھنے میں انگریزی ادب کی پوری پیروی کی ہے۔

تیسرا ایسا میدان جو آزاد نے اردو والوں کو دکھایا وہ علم السنہ یا فیلالوجی کا تھا جس میں علاوہ اور باتوں کے الفاظ کی پیداوار، ترقی، تغیر کا ڈھنگ بتایا ہے اس کتاب کا نام سخندان فارس ہے۔

دربار اکبری بھی آزاد کا مقبول کارنامہ ہے یہ شہنشاہ اکبر کے عہد کی تاریخ ہے۔ جس میں تفصیلی حالات کے علاوہ آزاد نے اس بات کے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ س تاریخ میں بھی ادبیت اور دلچسپی کیونکر قائم رکھی جاسکتی ہے۔ غالباً یہ کتاب لارڈ میکالے کی ضخیم کتاب تاریخ انگلستان کے تتبع میں لکھا ہے

ان کتابوں کے علاوہ آزاد کی اور بھی تصانیف ہیں مثلاً فارسی پڑھانے اردو کے قاعدے اور قواعد اردو قصص ہند قند پارسی نگارستان فارس سپاک اور بیاک، جانورستان وغیرہ۔

آزاد کی خصوصیات میں سب سے نمایاں اور دلکش جوہران کی طرز تحریر ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور زبان کی شیرینی، محاوروں کی صحت اور رعایات تلمیح اور استعاروں کی گلکاری سے وہ حسن پیدا ہو جاتا ہے کہ پڑھتے چلے جایئے اور سیری نہیں ہوتی رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ ان (آزاد) کی عبارت کی یہ شان ہے کہ بھاشا کی سادگی اور بے تکلفی، انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کی خوبصورتی اس میں ملی جلی ہوتی ہے وہ تصنعات اور تکلفات سے گو کہ عاری ہے مگر لطیف استعارے اور خوبصورت تشبیہیں اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں، وہ ایک موسیقیت رکھتی ہے ان کے معاصرین (شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، حالی وغیرہ)

سلہ۔ مصنف تاریخ اردو (بزبان انگریزی)

ان کو نہایت قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے سنتے ہیں کہ ان کی موت پر ان کو خدائے اردو کہہ کر یاد کیا گیا تھا۔

آزاد کے قلم کا یہ ادبی کرشمہ ہے کہ مواد خواہ کتنا ہی کم ہو صفحے کے صفحے لکھے چلے جاتے ہیں اور تاثیر و لطف میں کمی نہیں آتی، ان کی عبارت کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ تحریر میں لوچ اور موقع پر زور بھی خاص طور پر پیدا ہو جاتا ہے گویا ایک کمان میں دو تیر ہر وقت رہتے ہیں اور جس تیر سے دل پر چوٹ کی جا سکتی ہے اسی کو کام میں لاتے ہیں، آزاد کا قلم سوز و گداز کی تصویر اس خوبی سے اتارتا ہے کہ سطر سطر میں شعر کا درد و اثر پیدا ہو جاتا ہے۔

ذکاء اللہ

ذکاء اللہ ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام ثناء اللہ ہے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۲ برس کے سن میں ذکاء اللہ دہلی کالج میں داخل ہوئے جہاں نظیر احمد اور محمد حسین آزاد بھی پڑھتے تھے۔ چنانچہ ان تینوں آدمیوں میں انتہا درجے کی محبت تھی ذکاء اللہ کو بچپن سے علم ریاضی میں خاص شغف تھا۔ جب پڑھ کر فارغ ہوئے تو اسی کالج میں ریاضی کے پروفیسر ہو گئے بعد میں وہاں سے منتقل کر کے آگرہ کالج میں فارسی اور اردو پڑھانے لگے ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے ۱۸۶۶ء میں نارمل اسکول دہلی کے مدرس اعلیٰ ہوئے بعد ازاں قابلیت کی بنا پر میور سنٹرل کالج الہ آباد کے پروفیسر منتخب ہو گئے جہاں بیس برس تک عربی اور فارسی کا درس دیتے رہے اور نہیں سے پنشن لے کر خانہ نشینی اختیار کر لی تصنیف اور تالیف کا شوق شروع ہی سے تھا۔ ملازمت کی حالت میں بھی

متعدد کتابیں لکھیں اور مرتے دم تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ذکاء اللہ نے جتنے مختلف موضوع پر کتابیں لکھیں اتنی اردو کے کسی ایک انشاء پرداز نے ان سے پہلے نہیں لکھیں ان کی طبیعت کی جولانی اور ہمہ گیری کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا اشہب قلم ہر میدان میں یکساں رواں ہے ریاضیات طبیعیات جغرافیہ علم الاخلاق ہیئت سیاست مدن وغیرہ سب پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔

ان کی تصنیف اور تالیف کی فہرست سیر المصنفین جلد دوم میں ۱۴۳ کتابوں کی دی ہوئی ہے جس میں ترجمہ زیادہ ہے لیکن ان کی بعض تصنیفیں نہایت قابل قدر ہیں مثلاً تاریخ ہندوستان جو دس جلدوں میں ہے

ذکاء اللہ کی عبارت سلیس اور رواں ہے مگر کسی قدر پھیکا پن بھی ہے تاریخ نویسی میں پوست کندہ حالات بیان کرنے میں تکلف سے کام لیتے ہیں اسی وجہ سے سادگی کم ہے شبلی کا ایسا طرز ادا دلال ہے اور نہ آزاد کی طرح ادبی شان اور شگفتگی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ بڑے بڑے حالات کو مختصر عبارت میں آسانی کے ساتھ لکھ دیتے ہیں ان کی کتابیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑی حد تک مقبول عام ہوئیں۔ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کمال کی داد دی گئی علاوہ خان بہادر اور شمس العلماء کے خطاب کے آپ کو پانچ سو روپے کا انعام بھی عطا ہوا۔ ذکاء اللہ کے کلام پر حالی نے ایک پھبتی میں نہایت جامع اور جائع تنقید کر دی ہے کہ" ذکاء اللہ کا دماغ ایک بنیئے کی دوکان ہے جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے' ممکن ہے کہ اس میں یہ بھی لطیف اشارہ ہو کہ بنیئے کی دوکان میں عمدہ اعلیٰ چیزیں کم ملتی ہیں

حالی

غالباً حالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں سوانح عمری لکھنا رائج کیا جیسا کہ

حیات سعدی اور حیات جاوید سوانح نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں اگر یادگار غالب بھی اسی سلسلے میں لے لی جائے تو یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں ہو سکتا کہ تفصیلی حالات کے ساتھ مرنے والوں کے کلام پر بھی ایک بڑی حد تک حالی نے ناقدانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے اسلوب بیان اور واقعات کی چھان بین کی وجہ سے ان کتابوں کی بدولت حالی کو اردو کے بہترین انشا پردازوں کے برابر جگہ ملی یادگار غالب اور حیات جاوید جس میں غالب اور سرسید کے حالات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر کبھی کبھی لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ حالی نے غالب اور سرسید کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا ہے چنانچہ شبلی کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا گیا ہے۔ معائب سے یا تو چشم پوشی کی گئی ہے یا توجیہہ کر دی گئی ہے یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ حالی کو سرسید اور غالب سے جو عقیدت تھی وہ محبت کے انتہائی درجے تک پہنچ چکی تھی جس کی وجہ سے اپنے پیروں کی وہ خامیاں جو ہم کو سخت معلوم ہوتی ہیں وہ محبت کی عینک سے اتنی صاف اور ناگوار نہیں دکھائی دیتیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے سوانح عمری کا کوئی نمونہ بھی نہ تھا جو کچھ حالی نے لکھا وہ بہت غنیمت اور قابل قدر ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے اردو شاعری پر جو تنقید کی ہے وہ کئی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ اسی کتاب میں انھوں نے مختلف زمانوں کے خیالات سے فن شعر پر بحث کی ہے اور جا بجا اردو کے لئے اچھی تجویزیں پیش کی ہیں یہ ضرور ہے کہ اس کتاب میں حالی نے اردو شاعری کے معائب بیان کئے ہیں محاسن نظر انداز کر دئے ہیں جس سے تصویر کا صرف ایک رخ دکھائی دیتا ہے

عام طور سے حالی کی عبارت سادگی اور صفائی کی سرمایہ دار ہے عبارت آرائی و رنگینی سے یک قلم گریز ہے روانی ضرور ہے مگر آزاد و شبلی کی طرح شگفتگی نہیں ہے

ان کی زبان نہایت پاکیزہ اور ٹکسالی ہے۔ محاورات کا خاص طور سے خیال
رکھتے ہیں مضمون کے اعتبار سے بعض مطلب کا زیادہ خیال رکھتے ہیں عبارت
مسلسل اور مربوط ہوتی ہے جو کچھ دل و دماغ میں آتا ہے اس کو بے تکلف کاغذ پر
رقم کر دیتے ہیں لیکن[1] ایک بے اعتدالی سے حالی بھی نہ بچ سکے یعنی انگریزی الفاظ
کا غیر ضروری استعمال حالی بھی نذیر احمد سے کم نہیں کرتے۔

سیّد علی بلگرامی

سید علی بلگرامی قصبہ بلگرام میں ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے ان کا خاندان عرصہ
سے علم و فضل، جاہ و مرتبہ کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھا سید علی کے والد زین الدین
خاں ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لے کر حیدرآباد میں ایک معزز جگہ پر ہو گئے تھے یہ بھی
اپنے وقت کے بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے
بیٹے سید علی بلگرامی کی تعلیم کا خاص خیال رکھا، پندرہ سال تک محض عربی اور فارسی
کی تعلیم دلاتے رہے۔ اس کے بعد سپوت بیٹے نے انگریزی کی طرف توجہ کی ذہن
اور حافظہ کی یہ حالت تھی کہ خود ان کے استادوں کو حیرت ہوتی مشکل سے
مشکل بات جلد سے جلد سمجھ لیتے اور ہمیشہ کے لئے دماغ میں محفوظ رکھتے اس
ذاتی جوہر کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ صرف آٹھ سال انگریزی پڑھ کر بی اے کی
ڈگری حاصل کر لی اور لطف یہ کہ امتحان میں ان کا ایک مضمون سنسکرت تھا
سید علی کی روز افزوں ترقی دیکھ کر حیدرآباد کے مشہور وزیر مختار الملک
سر سالار جنگ بہادر اوّل نے بلا کر اپنے خاص عملہ میں داخل کر لیا وہاں رہنے کے

[1] داستان تاریخ اردو صفحہ ۵۹۲

لہذا انھوں نے سائنس کے علوم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ تکمیل تعلیم کے لئے
یورپ کا سفر اختیار کیا وہاں بھی اپنی قابلیت کا بار ہا ثبوت دیا علمی تحصیل کا یہ
حال تھا کہ جتنی زبانوں سے واقفیت انھوں نے حاصل کی تھی۔ اتنی شاید ہی ہندستان
میں کوئی ایک آدمی جانتا ہو

عربی فارسی اردو انگریزی جرمنی فرانسیسی لاطینی سنسکرت۔ بنگالی
مرہٹی تلنگی گجراتی ہندی سے بخوبی واقف تھے لیکن باوجود اس ہمہ گیر علمی
قابلیت کے افسوس ہے کہ انھوں نے تصنیف کی طرف توجہ بہت کم کی ہے آپ کی
جو کچھ یادگاریں ہیں وہ ترجمے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ترجمے بھی کسی تصنیف
سے کم نہیں یوں تو کئی ایک کتابوں کے آپ نے قابل قدر ترجمے کئے لیکن تمدن
ہند اور تمدن عرب نے آپ کی شہرت میں چار چاند لگا دئے۔ یہ دونوں ہی
کتابیں اصل میں فرانسیسی زبان میں تھیں ان کا مصنف موسیو لیبان ہے۔ ان
ترجموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید علی کو اردو زبان پر پوری طرح عبور
حاصل تھا۔ سلاست اور روانی ان کے یہاں کے خاص جوہر ہیں محاورات بھی
برموقع صرف ہوتے ہیں۔ اصطلاحات کے ترجمے کرنے میں کمال ہے آپ کی انتہائی
کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ترجمہ میں انگریزی الفاظ نہ آنے پائیں
سید علی بلگرامی کا ارادہ بہت سی نایاب کتابوں کے لکھنے کا تھا لیکن موت
نے فرصت نہ دی۔ ۳ مئی ۱۹۱۱ء کو انتقال کر گئے

شبلی

شبلی ۱۸۵۷ء میں مقام بندول ضلع اعظم گڑھ پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم

مولوی شکر اللہ نامی ایک شخص سے حاصل کی۔ بعد میں اپنے وقت کے مشہور مولوی
محمد فاروق صاحب چریا کوٹی سے عربی کی منتہی کتابیں پڑھیں تلاش علم کے لئے
رامپور، لاہور، سہارنپور اور لکھنؤ کا سفر کرتے رہے۔ بہترین استادوں سے
معقول، حدیث، و فقہ کی تعلیم حاصل کی

جب فراغت حاصل ہوئی تو گھر والوں کو فکر ہوئی کہ کوئی دنیاوی کام
بھی کریں چنانچہ انہیں لوگوں کے اصرار سے وکالت کا امتحان پاس کرلیا اور
کچھ دن وکالت بھی کی لیکن یہ پیشہ پسند نہ آیا اس کو چھوڑ کر سرکاری ملازمت
کرلی اور امین دیوانی ہوگئے لیکن حوصلہ مندیوں نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا
استعفیٰ دیکر گھر بیٹھ رہے اور علمی مشاغل میں دن گذارنے لگے شبلی کے ایک
چھوٹے بھائی علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے ان سے ملنے کے لئے ۱۸۸۲ء میں
علی گڑھ گئے وہاں سرسید سے ملنے کا اتفاق ہوا انھوں نے شبلی کو فارسی کا
پروفیسر مقرر کردیا۔ شبلی کو کچھ علمی ذوق کی وجہ سے یہ جگہ پسند آئی علی گڑھ کی
فضا شبلی کی علمی نشو ونما کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ نہ صرف سرسید کا کتب خانہ
دیکھنے کو ملا بلکہ اہل علم کی صحبت بھی حسب دلخواہ نصیب ہوئی یوں تو ان کے دل
میں قومی جوش فطرتاً موجود تھا لیکن آدمیوں میں سرسید اور کتابوں میں "سپیل الاسلام"
مصنفہ "محمد حسین آزاد" نے اس جوش کو اور تیز کردیا مولوی محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں[1]

"یہ وقت تھا کہ سرسید کے شور و ہنگامہ سے تمام ہندوستان گونج رہا تھا محمد
حسین آزاد کی کتاب "سپیل الاسلام" نئی نئی شائع ہوئی تھی، وہ اکثر زیر مطالعہ
رہتی تھی مفاخر الاسلام دعربی پڑھ پڑھ کر وجد کرتے تھے اور اب پہلی مرتبہ ان کے
دل نے علماء کی غفلت، تضییع اوقات، نادانی اور بے خبری کا درد محسوس کیا۔"

---

[1] سیر المصنفین

شبلی نے اسلام کی گذشتہ شان و شوکت کو دنیا کے سامنے نئی آب و تاب کے
ساتھ پیش کر کے مسلمانوں میں جوش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی نامور ہستیوں
کو پیش کر کے انہوں نے جس قوم کو بیدار کرنا چاہا اور اس سلسلے میں المامون، الفاروق
سیرۃ النعمان، الغزالی وغیرہ مختلف اوقات میں لکھیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کے
مواد اکٹھا کرنے کے لئے ان کو شام و مصر اور قسطنطنیہ وغیرہ کا سفر کرنا پڑا۔ سرسید
کے انتقال کے بعد ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے قطع تعلق کر کے گھر چلے آئے۔ اور
اب اعظم گڑھ میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا مگر سید علی بلگرامی کی کوششوں نے ان کو
حیدرآباد جانے پر مجبور کیا۔ شبلی یہاں چار برس تک بحیثیت ناظم محکمۂ تعلیم کام کرتے
رہے۔ انہوں نے سلسلۂ آصفیہ میں کئی کتابیں لکھیں۔ چنانچہ علم الکلام، الکلام، الغزالی
موازنہ انیس و دبیر، سوانح مولانا روم یہ سب قیام حیدرآباد کی تصانیف ہیں

ندوۃ العلماء: یہ مدرسہ ۱۸۹۴ء میں اس غرض سے قائم کیا گیا تھا
کہ نصابِ تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی، علماء کے باہمی نزاع کا انسداد، عام
مسلمانوں کی بہبود اور فلاح کی تدبیریں سوچی جائیں۔ شبلی نے اس ادارہ میں
ابتدا ہی سے دلچسپی لینی شروع کی اور جب ندوہ کی حالت ابتر نظر آئی تو حیدرآباد
سے استعفیٰ دے کر لکھنؤ چلے آئے اور ندوہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی نہایت خوبی کے ساتھ
سنبھالتے رہے لیکن ۱۹۱۳ء میں لوگوں کی تنگ خیالی سے مجبور ہو کر ندوہ کو
بھی خیرباد کہا اور اعظم گڑھ میں آ کر دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی جس سے مقصد
یہ تھا کہ عمدہ مصنفوں کی ایک جماعت تیار ہو جائے اس غرض کی تکمیل میں
انہوں نے اپنی جائداد وغیرہ بھی وقف کر دی

شبلی کی شہرت اب نہ صرف ہندوستان میں چاروں طرف ہو رہی تھی
بلکہ ہندوستان کے باہر بھی ان کی خدمات کا اعتراف کیا جا رہا تھا ۱۸۹۲ء میں

گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا اس سے پہلے ۱۸۹۲ء میں سلطان ٹرکی نے تمغہ مجیدی عنایت فرمایا تھا۔

سیرۃ النبی شبلی کی آخری تصنیف تھی اور چاہتے تھے کہ اس اہم کام کو بھی اپنے ہاتھوں سے انجام دیں لیکن افسوس کہ یہ حسرت نہ پوری ہوسکی، ابھی پہلی جلد بھی تمام نہ ہوئی تھی کہ ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوگیا۔

شبلی نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن کے موضوع مختلف ہیں ان کی ہمہ گیر طبیعت نے علم کلام تاریخ تنقید سیرۃ۔ ہر میدان میں اپنی تیزی دکھائی ہے لیکن سب سے زیادہ نام تاریخ اور تنقید کے میدان میں ہوا

تاریخ نویسی میں آپ کا اسلوب بیان نہایت دلچسپ اور دلکش ہے اور تاریخ ایسے خشک موضوع کو ادب کی چاشنی دے کر ہر شخص کے لئے پرلطف بنا دیتے ہیں طرز استدلال پر اتنا عبور ہے کہ واقعات کی ایک کڑی سے دوسری کڑی اس طرح ملاتے ہیں کہ منطقی اصول ہر جگہ قائم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

فن تنقید کو آپ نے اردو میں بہت کچھ فروغ دیا۔ اس کے اصول قائم کئے شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر لکھ کر لوگوں کو عمل کا بھی راستہ بتا دیا فضول اور لغو باتوں کو ترک کر کے کارآمد چیزوں کو چن لینے کا بھی طریقہ سمجھایا

آپ کی طرز تحریر میں عموماً صفائی اور سادگی ہے مضمون کی خشکی دفع کرنے کے لئے دلچسپ تشبیہہ اور استعاروں سے بھی خاصا کام لے لیتے ہیں الفاظ زیادہ تر روزمرہ اور عام پسند ہوتے ہیں لیکن زور کے موقع پر عربی اور فارسی کے بھی الفاظ استعمال کر کے اپنے مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ آپ کا

اسلوب بیاں ایسا ہے کہ بلند سے بلند مضامین اس میں سلیس اردو کے ساتھ لکھے جا سکتے ہیں عبارت میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ جو مزہ تقریر سے حاصل ہو سکتا ہے وہ آپ کی تحریر میں بھی قائم رہتا ہے ایک بڑی خوبی شبلی کی طرز تحریر میں ہمواری کلام ہے حالانکہ موقع و محل کے لحاظ سے زبان بدل جاتی ہے لیکن موضوع سے ہم آہنگ رہنے کے علاوہ متانت و اثر کم نہیں ہونے پاتے

غالباً یہ بتانا نامناسب نہ ہوگا کہ شبلی پہلے شخص ہیں جو لکھنؤ یا دہلی کے رہنے والے نہ تھے مگر پھر بھی زمانے نے آپ کی تحریر کو مستند سمجھا۔

۴

مقالات و صحافت

عبدالماجد دریاآبادی

عبدالماجد صاحب اردو کی دنیا میں اپنی فلسفہ دانی کی وجہ سے نہایت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور اس میں شک بھی نہیں کہ انھوں نے اس معرکہ میں کارِ نمایاں کیے ہیں اردو میں فلسفہ بہت کم تھا جو ذخیرہ تھا بھی اس میں بیشتر حصہ ترجمہ کا تھا مگر عبدالماجد نے نہایت جانفشانی و قابلیت کے ساتھ اس کمی کو پورا کرنے میں کوشش کی۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھیں اور کارآمد کتابوں کا غیر زبان سے اردو میں ترجمہ بھی کیا۔

آپ کی تصانیف میں "فلسفۂ جذبات" اور "فلسفۂ اجتماع" اور ترجمہ میں "مکالمات برکلے" نہایت قابلِ قدر کتابیں ہیں۔ ترجمہ میں سب سے پہلی چیز جہاں لوگوں کو لغزش ہو جاتی ہے وہ زبان کا میدان ہے۔ انگریزی سے اردو لکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ مترجم کا اہم فرض ادا ہو گیا لیکن یہ وہ ٹھوکر ہوتی ہے کہ جس

کی بدولت قبول عام کا شرف ہمیشہ دور باش کی صدا دیتا ہے عبدالماجد نے اس ترجمہ میں علاوہ اور باتوں کے زبان و طرز بیان کا خاص طور سے خیال رکھا ہے محاورہ اور روز مرہ کی چاشنی مناسب مقامات پر دیتے ہوئے مضامین کی دشوار گزار راہوں سے بھی نہایت خوبی و کامیابی کے ساتھ گزر گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی ہر وقت باقی رہتی ہے تصانیف میں زبان عالمانہ ہے غالباً فلسفہ اہمیت اور دقت پسندی کا خیال رکھ کر وہ عربی و فارسی کے ادق الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن زبان پر عبور ہونے کی وجہ سے عبارت میں تسلسل اور شگفتگی قائم رہتی ہے ان کے اسلوب بیان کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ جیسا ماحول ہوتا ہے ویسی ہی زبان اور لفظیں استعمال کرتے ہیں مثلاً فلسفہ کا مضمون لکھنا ہے تو پیرایۂ بیان عالمانہ ہوگا الفاظ بھی عربی و فارسی کے دراشکل قسم کے صرف ہوں گے مرزا رسوا کی سوانح عمری یا شاعری پر تنقید ہوگی تو بیان کرنے کا ڈھنگ بھی الگ ہوگا اور الفاظ بھی کچھ کم مشکل رہیں گے لیکن مرزا شوق کی مثنویوں (زہر عشق وغیرہ) کے متعلق اظہار خیال فرمائیں گے تو زبان اور الفاظ بھی اسی قبیل کے ہوں گے جو مرزا شوق کے کلام کو اور زبان کو پوری طرح ذہن نشین کرا دیں یعنی اس وقت ان کے لغت میں نہایت عام فہم اور فصیح لفظ نظر آتے ہیں اسلوب بیان بھی اس قسم کا ہوتا ہے کہ عامیانہ مضامین کی فضا کو بہ تو آسانیت ہوئے کہ متبدل نظر آئے اور نہ اتنا بلند ہی کر دے کہ فلسفہ کی طرح ، ماغ کو رسائی کے لئے تخیل کے پر پرواز کی ضرورت پڑے۔ مختصر یہ کہ ہر ماحول کو اس کی اصلی حالت قائم رکھتے ہوئے مفہوم و نکات کو نہایت آسانی سے ذہن نشین کرا دیتے ہیں ماخوذ ان باتوں کے بھی طرز بیان کی انفرادیت ہاتھ سے نہیں جانے دیتے

ان کے اسلوب بیان کا ایک خاص انداز ہے کہ مضمون کے درمیان میں کبھی کبھی سوالات خود ہی کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ بحث طلب نکتہ کے متعلق

حلقے موافق مخالف سوال ہو سکتے ہیں سب کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ گویا ہر خلش کو جو ایک سمجھدار آدمی کے دل میں پیدا ہوتی ہے، نہایت خوبصورتی سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی نثر میں پڑھنے والے کو علاوہ ندرت بیان کے تاثیر اور زور کا بھی اندازہ ہوتا جائے گا بہت زیادہ لطف اس جگہ آتا ہے جہاں آپ بول چال کے وہ الفاظ بھی کبھی کبھی لے آتے ہیں جو غالباً بولنے ہی کے لئے مخصوص ہیں مثلاً "ہا" جو اظہار غم کے وقت زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے مرزا رسوا کے قصے میں ایک جگہ رقمطراز ہیں کہ "کیسے کیسے افسانہ گو آئے ہوں آئے اور کیسی کیسی مزیدار کہانیاں سنا کے بیٹھے مگر "ہا" دیکھتے ہی دیکھتے خود ان ہی کی زندگی افسانہ بن گئی۔"

اس کو قدامت پسندی سمجھئے یا وضعداری کہیئے کہ عبدالماجد کی عبارت میں کبھی کبھی ایسے الفاظ بھی آجاتے ہیں جو اب زیادہ پسند نہیں کئے جاتے مثلاً تئیں، اوریں وغیرہ اور کبھی کبھی عبارت کا مغلق ہونا بھی آپ کی نثر میں نظر آتا ہے لیکن باوجود متروک ہونے کے بھی یہ چیزیں اس خوبصورتی سے عبارت میں جگہ پاتی ہیں کہ بدمزگی نہیں پیدا ہونے پاتی۔

سلیمان ندوی

ان کی ولادت ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو پٹنہ کے ایک گاؤں دیسنہ میں ہوئی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے بعد میں یہیں استاد بھی مقرر ہو گئے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی اس کے بعد ادارے کو بڑی خوبی سے چلاتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان

چلے گئے جہاں ۱۹۵۳ء میں انتقال ہوا عجیب اتفاق ہے کہ جو اِن کے پیدا ہونے
کی تاریخ ہے وہی مرنے کی تھی۔

شبلی کے بعد جس خوبی سے دارالمصنفین کی ترقی اور دنیائے ادب میں نمایاں
حیثیت سلیمان ندوی نے قائم کر رکھی ہے وہ ہر طرح ان کو شبلی کا صحیح جانشین ثابت
کرنے کے لیئے کافی ہے شبلی کی طرح ان کو بھی تاریخ سے خاص شغف تھا جس کی
وجہ سے وہ اسلام کے سیاسی اور ادبی کارناموں پر اس خوبی کے ساتھ روشنی
ڈالتے ہیں کہ گمنامی اور غلط فہمی کی تاریک گھاٹیوں سے واقعات نکل کر حقیقت کی
سطح پر نمایاں ہو جاتے ہیں

سلیمان نثر لکھنے میں ایک طرز خاص کے مالک تھے۔ ان کی عبارت میں
ادبیت دلچسپی کے علاوہ علمیت کا بھی ذخیرہ رہتا ہے لیکن علمیت ایسی نہیں جو کانوں
کو گراں معلوم ہو اس میں بے موقع عربی کے بڑے بڑے لفظوں کا استعمال نہیں بلکہ
عربی و فارسی کے ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کا استعمال کرنا اب ہمارے لیئے
ناگزیر ہو گیا ہے جن کے بغیر ہم اپنے بلند خیالات کا اظہار آسانی سے نہیں کر سکتے

سلیمان ندوی لفظوں کی رنگینی سے لوگوں کو گمراہ کرنا نہیں چاہتے
ان کے نزدیک رنگینی کا نام ادبیت نہیں بلکہ وہ اپنے خیالات اور الفاظ کو
اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ پڑھنے والا ان عالمانہ حقیقتوں میں ادب کے
مزے لیتا ہے۔ وہ فارسی و عربی کے عالم ہیں مگر اردو کی طرز میں مولویانہ رنگ
کبھی نہیں پیدا ہوتا ایسی یہ تو صرف زبان کی شائستگی ہوتی ہے اور بعض ثقیل ادق
الفاظ سے زبان کی لطافت گھائل ہوتی ہے روانی میں فرق آتا ہے بلکہ
ثقیل لفظوں کو بھی وہ اپنی طرز تحریر سے دلچسپ بنا لیتے ہیں اور الفاظ کے برمحل
استعمال سے سلاست ہر جگہ قلم کے ساتھ ساتھ رہتی ہے اور کبھی کبھی شگفتگی تو

ظرافت کی حد تک پہنچ کر مضمون کو مزید دلچسپ بنا دیتی ہے۔
سلیمان ندوی اردو کے ایک اچھے مقرر بھی ہیں لہذا عبارت میں کہیں کہیں خطیبانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے انداز بیان میں رنگینی اور مضمون میں ایک خاص لطف آ جاتا ہے۔ اپنی تحریروں سے قوم و ملک کو کورانہ و جاہلانہ تقلید سے بچانے کے لئے اکثر نہایت پر اثر الفاظ میں لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں لیکن جو بات کہتے ہیں وہ ناصح مشفق کی طرح نہیں بلکہ نہایت خلوص اور لطیف اشاروں سے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں ان کا رسالہ معارف ایک عرصہ سے ادب و قوم کی قابل قدر خدمت کر رہا ہے اور اپنے علمی مضامین کے اعتبار سے ملک میں ایک بلند پایہ جریدہ سمجھا جاتا ہے مجملاً ان کتابوں کے سلیمان ندوی کی تصنیف جیام نہایت ہی اعزاز کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے آپ کی اردو زبان کی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ نے ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی جو آپ کے نہایت مناسب ہے

حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی غالباً اردو کی دنیا میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی سوانح عمری خود لکھ کر اردو ادب میں ایک قسم کا اضافہ کیا۔ اس کتاب کا نام "آپ بیتی" ہے ہم اسی کتاب سے خواجہ صاحب کے مختصر حالات ان ہی کے الفاظ میں لکھ دینا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں ایک جگہ رقمطراز ہیں "میرا نام علی حسن عرف حسن نظامی ہے والد کا نام حافظ سید عاشق علی میری قومیت سید ہے پیدائش کا مقام بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء پرانی دہلی ہے اور وہیں آجکل اقامت ہے

معاش کتابوں اور دواؤں کی تجارت پر ہے۔"

اس کے بعد صفحہ ۳۲ پر ولادت اور زندگی کا حال اس طرح لکھتے ہیں۔

"تیرھویں صدی کے خاتمہ کے قریب سنہ ۱۲۹۶ھ ۲ محرم کو جمعرات کی صبح صادق کے وقت حسن نظامی پیدا ہوا۔ فارسی کی چند معمولی کتابیں پڑھیں اس کے بعد عربی صرف نحو شروع کی (انگریزی بالکل نہیں آتی۔ بڑی عمر میں کوشش بہت کی مگر حاصل کچھ نہ ہوا) بارہ سال کی عمر تھی کہ ایک ہی سال کے اندر اس کے والدین کا انتقال ہو گیا اور اس کی پرورش اس کے بڑے بھائی مرحوم سید حسن علی شاہ نے کی۔"

اپنی شادی اور ابتدائی عہد کی پریشانیوں اور بعض سفر کے حالات بیان کر کے صفحہ ۳۴ پر فرماتے ہیں "قصہ مختصر سنہ ۱۹ء سے لے کر سنہ ۱۹۱۹ء تک حسن نظامی کی زندگی مضامین نویسی، تصنیف و تالیف کتب و خدمت مریدین میں صرف ہوئی اور ہر سال خدائے تعالیٰ کی عنایت سے اس کے کاموں کو ترقی ہوتی گئی۔ مریدوں کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی تالیفات و تصنیفات چالیس سے زیادہ ہو گئیں۔[۱]"

تعداد کے اعتبار سے جتنی کتابیں خواجہ صاحب نے لکھی ہیں اتنی اردو کے موجودہ دور میں شاید کسی ایک ممتاز مصنف نے نہیں لکھیں اور نہ لکھ ہی کیسے سکتا ہے۔ خواجہ صاحب کتاب لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ایک جگہ خود فرماتے ہیں "حالانکہ پہلے ہر مہینے ایک کتاب تیار ہو جاتی تھی"۔ خیال فرمائیے کہ جو شخص ہر مہینے ایک کتاب لکھ ڈالتا ہو اس کا مقابلہ کون کرے۔ کثرت تصنیف کے علاوہ ایک اور قابل قدر خوبی یہ ہے کہ آپ نے زیادہ تر ایسے مضامین پر قلم اٹھایا ہے جن پر ابھی تک شاید کسی نے کچھ نہ لکھا تھا

---

[۱] یہ بیان "آپ بیتی" کے تاریخ تصنیف کے وقت کا ہے جو غالباً سنہ ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی ہے اور خدا معلوم کتنی تعداد کتابوں اور مریدوں کی ان کی اب تک بڑھ گئی ہوگی

خواجہ صاحب کی تصانیف پڑھنے والے پر ابتدا ہی سے طرزِ تحریر کی دلکشی کا اثر ہونے لگتا ہے۔ شروع سے آخر تک عبارت میں انتہا درجے کا میانہ پن اور بے تکلفانہ انداز ہے جو آمد کا پہلو لئے ہوئے ان کے اسلوبِ بیان میں ایک خاص ندرت اور تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔ دوسری ممتاز خوبی ان کے بیان میں سوز و گداز کا پہلو ہے۔ وہ جب چاہتے ہیں موقع کو دردناک بنا دیتے ہیں اور اس قدر دردناک کہ دل سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن بعض وقت یہ خوبی تکلیف دہ بھی ہو جاتی ہے۔ ایک فقرہ سے دل کو چوٹ کھانے سے فرصت نہیں ملتی کہ دوسرا فقرہ نشتر کی طرح رگِ جاں کو چھیڑ دیتا ہے اس طرح پیہم نشتر زنی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے اور یہی چاہتا ہے کہ سانس لینے کی ذرا فرصت مل جائے۔ خواجہ صاحب کا دل خدا جانے کتنے سلاطین کی اندوہناک حالت سے متاثر ہوا ہے کہ جہاں کہیں ان کی ابتری نظر آئی ان کے آنسو جاری ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا قلم غمناک مناظر بیان کرنے میں کبھی نہیں تھکتا اور اتنا اثر لے کر صفحۂ کاغذ پر آن ہوتا ہے کہ دیکھنے والے بھی رونے لگتے ہیں اور سب رو دیتے ہیں۔ اس سطر کو دیکھنا ہو تو "غدر کے افسانوں" کو دیکھئے جو اپنے رنگ میں عدیم المثال ہیں۔

خواجہ صاحب کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے جو سادہ و شیریں ہونے کی وجہ سے قبولِ عام کا شرف حاصل کر چکی ہے۔ محمد حسین آزاد کی طرح اتنی عام فہم زبان ہے کہ اس سے زیادہ سہل اور کامیاب لب و لہجہ اختیار کرنا بہت مشکل ہے۔ موصوف ٹھیٹ ہندی کے فقرے بھی استعمال کرتے ہیں اور عربی و فارسی کے ادق الفاظ بھی لیکن دونوں ایسے موقع سے کہ بارِ خاطر ہونا تو کیا معنی روانی میں کہیں فرق نہیں آنے پاتا۔ چھوٹے چھوٹے جملے نشتر کا کام دیتے ہیں۔ نہ تشبیہ کی بھرمار ہے نہ استعاروں کی بوچھاڑ۔ عبارت میں صفائی اور چستی کی وجہ سے تاثیر شگفتگی

ہر جگہ نمایاں ہے۔

خواجہ صاحب کی نثر میں رعایت لفظی کا نہایت لطیف پہلو کہیں کہیں نظر آجاتا ہے جس سے عبارت میں شگفتگی اور جان آجاتی ہے۔ اسلوب بیان میں متانت و سنجیدگی خاص طور سے نمایاں ہے اور بزرگانہ انداز تو ایسا ہے کہ تبسم و مزاح کا کوئی پہلو نہیں پیدا ہونے پاتا لیکن خشکی و پھیکے پن کی ہوا بھی دامن مضمون تک نہیں آنے پاتی۔

مضامین کی نوعیت پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ موضوع نہ تو فلسفیانہ ہے نہ عالمانہ بلکہ روزمرہ اور کام کی باتوں پر اخلاق کو مدنظر رکھتے ہوئے خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ خواجہ صاحب کا فطری مذاق صوفیانہ ہے چنانچہ اہل معرفت کے دائرے میں آپ کا نہایت بلند مرتبہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ معرفت میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ کائنات کے ہر ذرے میں آپ کو ایک خاص وحدانیت نظر آتی ہے۔ ادنیٰ چیزوں سے بھی وہ غافل انسانوں کو درس معرفت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آپ ان کی کتاب "سی پارۂ دل" کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ کس خوبی سے ایک مختصر مضمون اور بے جان چیز مثلاً لالٹین یا برف وغیرہ سے وہ سوتے ہوئے دلوں کو بیدار کر دیتے ہیں۔ اس کتاب کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں اس صنف تصنیف کی یہ پہلی نمایاں مثال جسے انگریزی میں (ESSAY) کہتے ہیں (یعنی تخیلی مضمون نگاری) جس میں موضوع کی محض منطقی تحلیل نہیں ہوتی بلکہ ان دلفریبیوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو کہ ایک کیفیت اور حیرت پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرز تحریر کا نقش اول آزاد کے نیرنگ خیال کے بعض حصے کہے جاسکتے ہیں۔ حسن نظامی کا انتقال ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

ابوالکلام آزاد

ابوالکلام آزاد کی کوئی مستقل ادبی تصنیف تو معلوم نہیں ہوتی مگر الہلال کی اور مخصوص انداز تحریر نے ان کو اردو کے بہترین انشا پردازوں کی صف میں جگہ دلادی ہے۔ الہلال نے اپنی خوبیوں کی وجہ سے اتنی دلکشی حاصل کر لی تھی کہ جب تک یہ اخبار ہاتھ میں نہ آتا تھا لوگ بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔ آزاد کی تقریر کی طرح تحریر میں بھی ایک سحر ہوتا ہے کہ جس کو اول سے آخر تک بغیر پڑھے ہوئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا

آپ کی طرز تحریر میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خواہ جملے طولانی ہوں مگر توازن اور تسلسل میں فرق نہیں آنے پاتا ایک جملے کے بعد دوسرا بھی اسی انداز سے آتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عبارت میں اتنا ربط ہوتا ہے کہ ذرا بھی آپ ترتیب میں فرق نہیں ڈال سکتے۔ ایک لفظ کو اگر جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنا چاہیں تو تمام عبارت کے بے لطف ہو جانے کا اندیشہ ہے

الفاظ کا انتخاب زیادہ تر عربی و فارسی کے ذخیرے سے ہوتا ہے علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات کی آمیزش سے آپ جو ادبیت پیدا کرتے ہیں وہ خاص طور پر عبارت کو دلکش اور موضوع کو بلند کر دیتی ہے ان کے تشبیہ و استعارے عربی و عجمی انداز کے ہوتے ہیں مگر اردو کی فضا میں اس طرح رچتے جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اسی سرزمین کے لئے پیدا ہوئے تھے جس کی وجہ سے ایک طرف تو الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسری طرف مضمون کی شگفتگی بڑھ جاتی ہے

ابوالکلام آزاد اپنے انداز بیاں کی پختگی کی وجہ سے بڑے سے بڑے مفہوم کو نہایت آسانی سے ذہن نشین کرا دیتے ہیں اور جب انفرادی اور

کے امور کو عالمگیر اصول سے منسلک کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں تو صرف
یہی نہیں کہ مضمون کی سطح اونچی ہو جاتی ہے بلکہ دماغی قوتوں کو بیداری کا موقع
بھی نصیب ہوتا ہے۔ اس طرح سے نثر میں اعلیٰ ذہنیت و معنویت کا عنصر پیدا
ہو جاتا ہے۔

جوش و اقبال کی طرح ابوالکلام آزاد کی تحریر میں عام طور سے جوش اور
پیام عمل ہوتا ہے ان کے مضامین پڑھ کر آدمی مایوسی کی دنیا میں گم نہیں ہو سکتا
پہاڑ ایسی مصیبتوں کے بعد بھی اس کو کام اور کامیابی کی طرف قدم بڑھانے
کی دعوت دی جاتی ہے۔ جوش کے موقع پر ان کے ہر فقرے میں سرگرمی کی
آگ بھری نظر آتی ہے۔ وہ ایسے ہنگامہ خیز مضامین سے ہر تغافل آمیز
سکون کو سراپا حرکت بنا سکتے ہیں۔ آزاد کی نثر میں جوش اور ایثار کا عنصر
اس کثرت و شدت کے ساتھ آتا ہے کہ ان کے اسلوب بیان میں ایک خاص دلکشی
اور امتیازی خصوصیت پیدا کر دیتا ہے جو اُن کی انفرادیت کا نمایاں ثبوت ہے۔

ابوالکلام آزاد کی ایک اور ممتاز خوبی قوت گویائی ہے اس وقت فصیح و
بلیغ اردو میں گفتگو کرنے والا شاید ان سے بہتر اور کوئی نہیں۔ زبان پر عبور
ہونے کی وجہ سے تقریر میں بھی ایسے ہی الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہیں جیسے تحریر
میں برجستہ اور شستہ الفاظ آتے ہیں کبھی کبھی تحریر میں تقریر کی جھلک آ جاتی ہے خطیبانہ
انداز سے وہ اپنی عبارت کو پُر لطف اور پُر تاثیر بنا لیتے ہیں۔ ابوالکلام نے قرآن کا
مطالعہ اتنی گہری دلچسپی سے کیا ہے کہ ان کی کوئی تحریر یا تقریر قرآنی تعلیمات کے
حوالے سے خالی نہ ملے گی۔ اس سلسلے میں بھی دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں
ایک تو آیاتِ قرآنی کو عبارت میں برمحل جگہ دینا اور دوسرے ان کا ترجمہ اس خوبی
سے اردو زبان میں بیان کر دینا کہ پورا مفہوم آسانی و خوبی سے ذہن نشین ہو جائے

ابوالکلام کی تحریروں کا موضوع زیادہ تر سیاست ہے اور گو اردو ادب کو خاص طور پر فائدہ پہنچانے کے لئے انھوں نے شاید کبھی فرصت نہیں پائی لیکن براہ راست یہ نہیں اردو کو جو فائدہ آپ کی تحریر و تقریر سے برابر پہنچتا رہا ہے وہ خود اپنی جگہ پر اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ آسانی یا مشکل سے بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ اردو نثر کو فن لطیف اور دلچسپ بنانے والوں میں آپ کا ہمیشہ ایک خاص مرتبہ سمجھا جائیگا آپ نے الہلال میں جو مضامین لکھے تھے وہ اب "مقالات آزاد" کے نام دو جلدوں میں شائع ہوئے ہیں اس کارنامہ کے علاوہ ان کے خطوط کا مجموعہ "غبار خاطر" بھی اردو کی انشا پردازی میں ایک اضافہ ہے غبار خاطر میں وہ خطوط ہیں جو آزاد نے قید فرنگ کے زمانے میں یعنی ۱۹۴۲ء میں قلعہ احمد نگر سے حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے

آزاد کی ولادت ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ اس وقت وہ حکومت ہند میں محکمہ تعلیم کے وزیر ہیں

نصیر حسین خیال

نصیر حسین پٹنہ میں ۱۲ مارچ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے، ابھی یہ تین سال کے تھے ان کے والد سید نور حسین خاں کا انتقال ہو گیا۔ نصیر حسین کی دادی نے ان کی پرورش کی نصیر حسین کا خاندان فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانے میں عظیم آباد (پٹنہ) آیا اور بس گیا نصیر حسین کے آبا و اجداد کو شاہان مغلیہ کی طرف سے بہار میں جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔

نصیر حسین سات سال کے تھے کہ ان کی دادی کا بھی انتقال ہو گیا اس

ان کے چچا سید جعفر حسین خان اور ماموں شاد عظیم آبادی نے ان کی ذمہ داری اپنے
سر لے لی۔ اس وقت کے دستور کے مطابق نصیر حسین کو اردو فارسی اور عربی کی تعلیم
دی گئی۔ اس کے بعد انگریزی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ نصیر حسین کو علم و ادب سے بڑی
شغف تھا چنانچہ صرف ۱۷ سال کے تھے تو ادیب نام کا ایک ماہوار علمی و ادبی رسالہ
نکالا تھا۔ ان کو سیر و سیاحت کا بھی کافی شوق تھا سنہ ۱۹۲ء میں یورپ گئے اور
اسی سلسلے میں ایشیا کے بھی بعض ممالک کے دورے کئے سنہ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ میں
دفعتاً قلب کی حرکت بند ہوگئی اور وہیں انتقال ہوا

نصیر حسین خیال جس پایہ کے نثر نویس تھے اس کا خیال کر کے اگر ان کو آزاد
ثانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہی دہلی کی ٹکسالی نرم دلپذیر زبان ہے، وہی
روانی اور فصاحت ان کی عبارت کی بھی جان ہے جس طرح آزاد روزمرہ اور
عام فہم الفاظ سے تاثیر کا طلسم باندھتے تھے ویسا ہی ان کو بھی زبان و بیان پر
قدرت حاصل ہے۔ درد کے موقع پر درد اور غم کا منظر کے لئے نہایت چبھتے
ہوئے دل ہلا دینے والے الفاظ ہر جگہ آپ کو ان کے یہاں نظر آئیں گے ہر موقع
کی تصویر نہایت دلچسپ پیرایہ میں پیش نظر کر دینا ان کا خاص رنگ ہے۔

عبارت میں شروع سے آخر تک کہیں بھی ناہمواری نہ ملے گی۔ فارسی عربی
کے ادق الفاظ اور ہندی کے ٹھیٹ الفاظ بھی کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں مگر اس
حسن سے کہ یکسانیت مجروح نہ ہونے پائے اور بجائے ثقل کے ایک خاص قسم کا
لطف و اثر پیدا ہو جائے الفاظ کو کام میں لانے کے پہلے وہ محل استعمال کو اچھی طرح
دیکھ لیتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ سلاست و روانی میں فرق آجائے گویا ان کا دریائے
طبع شیشے دار تمام سے گزر کرتا ہے مگر ذوق جگہ کو کہیں کہیں سے بے لطف
نہیں ہونے دیتا۔

حالی اپنے مطلب کو ادا کرنے کے لئے صرف اتنے ہی الفاظ لاتے ہیں جتنے کہ اس کے مفہوم کو اچھی طرح واضح کر سکیں زائد الفاظ بیکار جملوں کو وہ سخت ادبی گناہ سمجھتے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ اردو سے ان کو اس قدر دلی ذوق و غیر معمولی محبت تھی کہ اس کی اصلیت اور اپنی سمجھ میں اس کی بہبود کے لئے کبھی کبھی تحقیق و دلیل کی زحمت نہیں فرماتے مگر عبارت کی دلکشی و طرز بیان کی خوبی اس کو بھی تشکیل سے سطر میں کھٹکنے دیتی ہے۔

حالی کے اسلوب بیان کی یہ خوبی بھی لطف اندازنہیں کی جاسکتی کہ جس خیال کو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق اسی تسلسل کے الفاظ جملے بھی لاتے ہیں تاکہ سطر میں دلکشی اور بیان میں شگفتگی زیادہ ہوجائے لیکن متانت و سنجیدگی کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتا سادگی سے رنگینی پیدا کرنا یہ آپ کی نثر کا امتیازی پہلو ہے جہاں ضرورت ہوتی ہے سیدھے سادے الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ ایک خاص قسم کی متانت آمیز رنگینی آجاتی ہے اور بڑے سے بڑے مفہوم کو اس پردے میں اتار دل کے ساتھ نہایت خوبی سے اہل نظر کے سامنے پیش کرکے قدرتِ بیان و عموم زبان کی داد لیتے ہیں

ظفر علی خاں

ظفر علی خاں کا نام جہاں آیا اور زمیندار بھی یاد آگیا گویا ان کے نام کا ایک جز ہو گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اس اخبار کو اتنا فروغ دیا کہ ایک زمانے میں ہر طرف سے قبولِ عام کی سند ملی لوگوں نے آپ کے مقالات کو صحافت کا بہترین نمونہ سمجھا جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ نہایت دلفریب اور سے تو

طریقہ سے کہا جاتا ہے مطالب کو ذہن نشین کرانے میں ایسا پیرایہ۔ اس عمدہ
اختیار کیا جاتا ہے کہ خیال راہ راست منزل مقصود تک پہنچ سکے تمدنی و سیاسی
اور آئینی امور کے ہر پہلو پر نہایت صاف روشنی ڈالنا ظفر علی خاں صاحب کا
خاص حصہ ہے

خیال ہوتا ہوگا کہ اڈیٹر ہونے کی حیثیت سے ظفر علی خاں صرف سیاسی
و آئینی معاملات کے میدان ہی میں تگ و دو کر سکتے ہیں لیکن یہ ناقص سطحی خیال
کا نتیجہ ہوگا۔ اس لئے کہ موصوف کی فکر رسا نے محدود دائرے میں قیام کرنا بھی
گوارا نہ کیا بلکہ گلستان ادب کی سیر کرنا اپنا فرض سمجھا شعر و شاعری ناول
مذہب ہر ایک پر مضامین لکھے غرض علم و ادب کا دامن ہاتھ سے نہ جانے
دیا قوم و ملک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے آپ نے معاشرتی اصلاح کو مدنظر
رکھتے ہوئے خود بھی مضامین لکھے اور کارآمد سمجھ کر مغربی مصنفین کے خیالات کو بھی
اردو کا جامہ پہنایا اس سلسلے میں آپ کی تصنیف معاشرت قابل دید ہے۔

ظفر علی خاں کی ناولوں میں گھریلو زندگی کا نہایت [illegible] اور اصلی نقشہ
نظر آتا ہے جس کے دیکھنے سے موصوف کی دقت نظری اور گہرے مطالعہ کا اندازہ
ہوتا ہے کہ آپ نے کس طرح [illegible] زن و مرد کی زندگی اور [illegible] گھرانوں کے
[illegible] (۲) کے ساتھ یہ بھی بیان کر دینا ضروری جانتا ہے کہ
انسانی جذبات کی کیفیتیں جو بشرے سے معلوم کی جا سکتی ہیں ان کا اندازہ جس
آسانی کے ساتھ آپ کر لیتے ہیں اسی حسن کے ساتھ صفحہ تحریر پر لانے پر قادر
ہیں مختلف اوقات میں مختلف حرکات و سکنات جو لوگوں سے صادر ہوتے ہیں
ان کے ان پہلوؤں پر بھی آپ غور کر لیتے ہیں جو عام طور سے کسی کی حد سے ہر
شخص کی سمجھ ہی میں نہیں آتے اور جن کے معلوم ہونے سے ناول [illegible]

پورا ادا نہیں ہوتا۔

ظفر علی خاں کی نثر حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہے عموماً اتنے ہی الفاظ کام میں لاتے ہیں جتنے سے ان کا مطلب واضح ہو جائے

روزمرہ اور محاورات زبان کو بہت بڑی قدرت ہے فارسی ترکیبیں بادہ مرغوب ہیں۔ عربی و فارسی الفاظ بھی کافی صرف کرتے ہیں کبھی کبھی خوش بیانی یا ایسے الفاظ یا فقرے بھی ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں جو نہ صرف نامانوس ہوتے ہیں بلکہ زبان کی لوچ پر بھی بار معلوم ہوتے ہیں۔ ظفر علی خاں کی طرز تحریر کی خوبیوں کے مقابلے میں یہ نقص بہت اہم نہ سہی مگر جی یہی چاہتا ہے کہ یہ خرابی بھی نہ ہوتی۔

موصوف کا قلم شعر و شاعری کی دنیا میں بھی رواں رہتا ہے نظموں کا ایک مجموعہ بہارستان شائع بھی ہو چکا ہے جس میں زیادہ تر سیاسی و مذہبی نظمیں ہیں لیکن آپ کی پرگوئی کو دیکھتے ہوئے یہ مجموعہ ضخامت کے اعتبار سے بہت کم ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ آپ نے نظم سے زیادہ نثر کی طرف توجہ کی ہے۔

تشبیہ و استعارے کی جدت، بیان کی رنگینی، خیال کا واضح طور پر چند الفاظ میں ادا کرنا ایسی خوبیاں ہیں جو ظفر علی خاں کو ایک خاص طرز تحریر کا مالک بنا دیتی ہیں زبان میں عموماً روانی ہوتی ہے۔ زور اور تاثیر کی بھی کمی نہیں بلکہ جس بات کی اردو ناولوں میں کمی تھی اس کی تلافی کی بھی کوشش آپ نے کی ہے یعنی مزاح کا عنصر موقع سے داخل کر کے عبارت کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے زبان کسی قدر عالمانہ ہے اور یہ رنگ ہر جگہ نمایاں ہے خواہ ناول کا میدان ہو یا معرکۂ مذہب و سائنس کا سامنا ہو۔

ظفر علی خاں کا انتقال ۱۹۵۶ء میں ہوا

۵

تنقید

غدر کے پہلے جس طرح اردو شاعری ایک سے سادے راستے پر چلتی رہی اور سیاسی و معاشرتی حالات نے زندگی میں کوئی طوفان نہیں اٹھایا اسی طرح اردو تنقید پر بھی ایک جمود سا طاری رہا۔ قوتِ نقد کا اظہار انہیں مقررہ اصولوں کے ماتحت ہوتا تھا جو صدیوں سے چلے آتے تھے اور جو اردو شاعری یا ادب کی پیدائش سے پہلے بن چکے تھے۔ شعر و ادب نے رہنمائی کے بجائے تفریح کی صورت اختیار کر رکھی تھی یعنی اور مبادیِ اسلوبِ بیان اور جدتِ ادا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے جس کے اثر سے نقاد کو بھی صرف اسلوبِ بیان اور طرزِ ادا سے دلچسپی رہ گئی تھی۔ شاعر کے لئے "جوش گو" "نازک" "جوش فکر" کے سے لفظوں کے استعمال میں "تلاشِ مضامینِ تازہ" سے زیادہ "جدتِ ادا" پر قدرت رکھنے کی جانب اشارہ ہوتا تھا۔

اردو شاعری کی طرح اردو تنقید میں بھی انیسویں صدی میں ایک اہم دور شروع ہوا۔ معاشرتی اور معاشی نظام کی تبدیلی سے اصلاح پسندی کے ساتھ ساتھ عقل پرستی کا رواج ہوا اور مذہب، سیاست، تعلیم، شعر و ادب ہر ایک میں عقل سے کام

لیکن اصلاح کی کوشش کی گئی۔ نئے نقادوں نے اسی آزادی اور معاشرتی تعمیر کی روشنی
میں ایسا راستہ بنایا جو مغربی اثرات کے پھیلنے، ہندوستان کے نیم صنعتی نیم جاگیردارانہ
ہو جانے کی وجہ سے عمل میں آیا۔ قدیم و جدید کی جنگ روایات، اصلاح کی جنگ
ہر جگہ جاری تھی۔ اور میدان آہستہ آہستہ تاریخ کی نئی طاقتوں کے ہاتھ میں آ رہا تھا۔
شرق و غرب کے اس تصادم میں دونوں اصول نقد کا جائزہ لیا گیا اور جس طرح
تقریباً ہر شعبہ میں مغرب کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی اسی صورت سے مغربی
اصول نقد بھی اردو پر حاوی ہو گئے۔

سب سے پہلے محمد حسین آزاد نے آبحیات میں نئے انداز سے اردو ادب پر تنقید
کی پھر اس کے بعد حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر فن تنقید کو اجاگر کرنے کی کوشش
کی۔ شبلی نے شعر العجم کے چوتھے حصے میں اصول تنقید پر روشنی ڈالی۔ موازنہ انیس و دبیر
لکھ کر راستہ بتایا کہ کسی شاعر کے کلام میں خوبیاں اور خرابیاں کیسے دیکھی جائیں۔
مغربی تعلیم کی روشنی میں تنقید روز بروز ترقی کرتی رہی انگریزی کے اصول
سے فائدہ اٹھا کر لوگوں نے ہمیشہ سے زیادہ اس طرف توجہ کی رفتہ رفتہ یہ
لے اتنی بڑھی کہ اب اردو کا خزانہ کسی لحاظ سے حقیر نہیں کہا جا سکتا

چکبست

سب سے پہلی چیز جو ہمیں چکبست کے مضامین میں متاثر کرتی ہے وہ ان کی تنقید
کا صحیح معیار ہے، ان کو زبان پر بہت بڑی حد تک قدرت حاصل تھی اور اس لئے
خیالات کے اظہار میں انہیں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ نہایت
صاف الفاظ میں کہتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے تنقید کے اصول کا صحیح صرف پیش نظر

رکھ کر کہتے تھے۔ انھوں نے اکثر وبیشتر مضامین ان لوگوں پر لکھے ہیں جن سے انہیں
عقیدت تھی یا جن سے محبت رکھتے تھے لیکن عصبیت نام کے لئے بھی نہیں
مگر ریوں کا اظہار بھی بے باکی سے کرتے ہیں جس طرح محاسن بیان کرتے ہیں متانت
و مصحف مزاجی ہر جگہ نمایاں ہے۔ جب گلزار نسیم کی اشاعت کر کے ان کو ایک ہنگامہ
سے دوچار ہونا پڑا اس وقت بھی انہوں نے نہایت متانت و سنجیدگی سے میدان
معرکہ میں قدم رکھا ان کا مباحثہ دلائل و براہین پر مبنی ہوتا ہے وہ ہر اعتراض کی
تہہ تک پہنچ کر اس کی بیخ کنی کی کوشش کرتے تھے اور ان کی فطری ذہانت اور ذہانت
ان کی دستگیر ہوتی تھی اس لئے ان کا تیر ہمیشہ نشانے پر بیٹھ کر ٹھیک بیٹھتا تھا ممکن ہے کہ
یہ مباحثہ کا انداز ان کے پیشہ نے سکھایا ہو۔

چکبست کی نثر اپنی سادگی اور روانی کے اعتبار سے ایک ممتاز درجہ رکھتی
ہے تنقید کا راستہ سخت تھا ان کے قلم سے چھو جانے کے بعد نکھریں اور بے نظیر
آنے لگتا ہے اثر ان کے کلام کا ساتھ کہیں نہیں چھوڑتا اور اثر پیدا کر بیان کی
سطح سنجیدگی کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ان کی عبارتوں میں انشا پردازانہ کی
مضمون آرائی نہیں لیکن موثر بنانے کے لئے الفاظ کا انتخاب نہایت سلیقہ سے ہیں جیسی
پیدا کر دیتا ہے کبھی کبھی مقفیٰ عبارت کا استعمال بھی ایک ہی کا مقصد ہے عبارت کو
پرزور بنانے کے لئے کبھی کبھی خطیبانہ انداز بھی کام میں لاتے ہیں اور پڑھنے والوں
کو یوں مخاطب کرتے ہیں گویا وہ ان سے ہم کلام ہیں ظرافت کی ہلکی سی لہر بھی کہیں
نظر آتی ہے لیکن نہ تو وہ طنز میں تبدیل ہو سکتی ہے اور نہ عام لوگوں کے مذاق کی
ہوتی ہے بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اکتا نہ جائے اس سے نہ
صرف ان کا رنگ تنقید شوخ ہو جاتا ہے بلکہ سارے مضمون میں ایک شگفتگی اور تازگی
کی روح دوڑ جاتی ہے

مضمون نگار کا ایک اہم فرض یہ بھی ہونا چاہیے کہ وہ مضمون کے تحت اور موضوع سے اچھی طرح ہمدردی رکھے ورنہ اس کے قلم میں وہ زور اور شدت میں وہ حقیقت آہی نہیں سکتی جس سے مضمون عام سطح سے بلند ہو جائے چکبست جو کچھ لکھتے ہیں اس میں خلوص اور اثر کا عنصر بہت کافی ہوتا ہے عموماً ہم کو بھی ان کے احساسات میں شریک ہونا پڑتا ہے منشی سجاد حسین مرحوم، تربھون لال ہجر اور رتن ناتھ سرشار کا مرثیہ جب ان کے قلم سے بیان ہوتا ہے تو ہمیں اس میں قومی نقصان اور ادب کی بربادی کا نقشہ نظر آنے لگتا ہے یہ اثر انگیزی ان کی عبارت کی جان ہے

عبدالحق

ڈاکٹر عبدالحق ایک عرصہ سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے ہیں آپ کی سرپرستی میں آئے دن دکن سے جو رسالے دیے ہوئے ادبی دفینے نکلے وہ بجائے خود ایک اعلیٰ قسم کی اردو خدمت ہے گو موصوف کی کوئی الگ بڑی تصنیف ہمارے سامنے نہیں آئی لیکن جو مقدمات مختلف کتابوں کے شروع میں آپ نے لکھے ہیں وہ کتاب کی صورت میں کسی قابل قدر تصنیف سے کم نہیں خوش قسمتی سے یہ مقدمے دو جلدوں میں شائع ہو گئے ہیں ان کے دیکھنے سے سب سے پہلی چیز جس کا اثر دل پر ہوتا ہے وہ عبدالحق کی طبیعت کی ہمہ گیری ہے مختلف مسائل پر آپ نے جامعہ فرسائی کی ہے اور قابل قدر انداز سے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو گوناگوں مسائل پر کس قدر عبور ہے

عبدالحق کی نثر میں ایک خاص قسم کی پختگی ہے جس میں دلی کی ٹکسالی زبان کا خاص طور سے رنگ جھلکتا رہتا ہے۔ عبارت میں عموماً سادگی اور روانی رہتی ہے سیدھے سادے الفاظ سے جملوں میں زور پیدا کر دینا آپ کا امتیازی اسلوب بیان ہے طرز بیان

میں شگفتگی اتنی کافی ہوتی ہے کہ مشکل باتیں بھی آسانی سے واضح ہو جاتی ہیں جس طرح موقع و
محل کے لحاظ سے عربی و فارسی کے بڑے الفاظ مطلب برآری کے لئے استعمال کرتے ہیں
اسی طرح مناسب جگہ پر ہندی کے بھی الفاظ مثلاً گھسڈٹ، دکھیارا وغیرہ بھی کام
میں لے آتے ہیں چھوٹے چھوٹے جملے اور ان میں روزمرہ اور محاورہ اردو کی
چاشنی، نثر میں ایک خاص قسم کا لطف پیدا کر دیتی ہے حشو و تعقید سے اس قدر تنفر ہے
کہ وہ یہ بھی نہیں پسند کرتے کہ رنگین اور مسجع عبارتیں ان کے مفہوم واضح کرنے کے راستے
میں حائل ہوں لہذا آپ کو ہر جگہ سیدھی سادی عبارت ان کی نثر میں ملے گی

ڈاکٹر عبدالحق کا تذکرہ تشنہ رہ جائے گا اگر ان کے رسالہ اردو کا تذکرہ اس
کتاب میں نہ آسکے یہ رسالہ بالکل علمی رسالہ ہے اپنی حیات سے لیکر آج تک
اس نے اردو داں طبقہ کی معلومات میں جو علمی اور ادبی اضافہ کیا ہے وہ آسانی
سے کیا مشکل سے بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے الہ آباد یونیورسٹی نے اپنی گولڈن جوبلی
(سنہ ۱۹۳۷ء) کے موقع پر آپ کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کی جس کے
آپ یقیناً مستحق تھے

مقدمات کے علاوہ آپ کے ریویو "چند تنقیدات عبدالحق" اور "خطبات
عبدالحق" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں

نیاز

موجودہ دور کی نثر نگاری مختلف راستوں پر گئی اور طرز تحریر کے اختیار کرنے
میں جدت پسند طبیعتوں نے نمایاں طریقے پیش کئے نیاز فتحپوری کا شمار بھی ان لوگوں

میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو ادب میں اپنے رنگ سے ایک قابل قدر اضافہ کیا الفاظ
اور ترکیبوں کی خوبصورتی ایک خاص خوش سے مل کر ایک ایسا بیان اختیار کرتی ہے جو صرف
نیاز کی تحریر میں پایا جا سکتا ہے انھوں نے صحافت اور تنقید میں حصہ لیا اور پھر افسانہ نگاری
کمال کر کے ادبی دنیا میں اپنے لئے ایک مخصوص جگہ پیدا کر لی۔ لکھنے کے لئے تو انھوں نے
مختلف موضوعات پر مقالے اور مضامین لکھے لیکن ان کا خاص رنگ افسانہ نگاری میں
پوری طرح ظاہر ہوتا ہے سیرت انسانی کے باریک اور پوشیدہ راز، جذبات قلب کے
مختلف اثرات اس قدر دلکش انداز میں بیان ہوتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے ذہن مسحور
ہو کر اسی دنیا میں کھو جاتا ہے، ان کا پہلا طویل افسانہ "ایک شاعر کا انجام" اپنی انوکھی
زبان اور ترکیبوں کے ساتھ ساتھ ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالتا ہے جس میں کہ انتشار ہی
پر خاص زور دیا گیا ہے، ان کے کردار جمالیاتی نقطۂ نظر سے چند ایسی خصوصیات کے
حامل ہوتے ہیں جو ان سے کسی حالت میں علیحدہ نہیں ہوتے۔ ان کی زندگی کے لطیف
واردات اسی حد تک ان میں تغیر پیدا کرتے ہیں جو فطرت انسانی کے لئے ضروری ہیں۔
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نیاز کے افسانوں کا موضوع صرف محبت ہوتا ہے۔ جس میں
شاعرانہ رنگینیاں تو بہت کچھ پائی جاتی ہیں لیکن کوئی ایسا اخلاقی سبق جو موجودہ دور
کی کشمکش کا حل پیش کر سکے نظر نہیں آتا

نیاز کے یہاں جو چیز امتیازی حیثیت رکھتی ہیں وہ ان کا مخصوص طرز بیان
اور زور قلم ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اکثر معمولی سی بات کو بھی اتنا رنگین بنا کر سامنے
لاتی ہے کہ وہ ضرور دلکش نظر آنے لگتی ہے ان کی "مذہبیات" سے قطع نظر کر کے
ہم ان کے ادبی کارناموں کو دیکھتے ہیں تو وہ ادب کے لئے ایک عمدہ ذخیرہ ہیں
انھوں نے عربی اور فارسی کے بہت سے خیالات اور الفاظ کو اردو میں اس طرح
ملا دیا کہ وہ زبان کا ایک جزو بن گئے ہیں ان کی جدت پسندی انھیں ہمیشہ عام

راستوں سے الگ لے جاتی ہے اس لئے ان کے مضامین عام مذاق کے نہیں ہوتے اور
ان میں علمیت کا پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے۔ ایک اچھے رسالے کے ایڈیٹر ہونے کے
علاوہ وہ کتابیں بھی لکھتے رہتے ہیں۔ اور اس وقت تک کئی کتابوں کے مصنف ہو چکے
ہیں۔ افسانوں کے دو مجموعے "نگارستان" اور "جمالستان" "تاریخ الدولتین" "فراست الید"
"صحابیات" "ترغیبات جنسی" وغیرہ اردو داں حضرات نہایت شوق سے پڑھتے ہیں
کتابوں کی یہ فہرست ہی بتائے گی کہ نیاز اکثر مختلف موضوعات پر طبع آزمائی
کرتے رہتے ہیں اور ہر جگہ وہ اس ادبی شان کو برقرار رکھتے ہیں جو ان کے لئے مخصوص
ہے۔ نیاز کی تحریریں بے باکی اور آزادی رائے قدم قدم پر موجود ہے۔

مسعود حسن

آپ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو فارسی کے صدر تھے۔ اسی سنہ ۱۹۵۴ء میں سبکدوش
ہو گئے ہیں کتب بینی کا ذوق آپ کا ایک فطری مشغلہ ہے یہاں تک کہ اس کا اثر
آپ کی مالی پوزیشن پر پڑا یہ آپ کا ذاتی کتب خانہ نایاب اور کارآمد کتابوں کا بہا
مجموعہ ہے۔ غالباً مطالعے سے آپ کو اتنی فرصت نہیں مل سکی کہ شعر گوئی کی طرف بھی
توجہ کرتے حالانکہ شاعری سے بھی دلچسپی ہے اور ادیب تخلص ہے لیکن ادبی دنیا آپ کو
صرف نثر نگار کی حیثیت سے جانتی ہے۔ آپ کی کتاب "ہماری شاعری" اردو تنقید
میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری میں توازن پیدا کرنے
کے لئے ایک ایسی کتاب کی ضرورت بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی "ہماری شاعری"
کا وجود بہت بروقت ہوا انجمن ترقی اردو نے اسی قدردانی کا ثبوت دیا اور اس
کتاب کو اپنی طرف سے شائع کیا جب سے یہ کتاب چھپی ہے اسے قبول عام کی سند

ایسی حاصل ہوئی ہے کہ متعدد بار چھپ چکی ہے

آپ کے ادبی کارنامے ہماری شاعری تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ کئی کارآمد کتابیں آپ مرتب بھی کر چکے ہیں جیسے فیض میر، روح انیس، اندر سبھا، دیوان فائز۔ ان کے شروع میں آپ نے مقدمات بھی لکھے ہیں جن کو اپنی جگہ پر خود ایک مستقل مضمون کی اہمیت حاصل ہے۔ ان مقدمات میں بھی آپ کے الفاظ و زبان، نرمی اور روانی کے لحاظ سے دلکشی اور دلچسپی کا سرمایہ ہیں۔ ویسے کئی کتابیں اور بھی آپ لکھ چکے ہیں

صحیح اور سادہ طرز نگارش مسعود صاحب کی امتیازی خصوصیت ہے جو باوجود اپنی سادگی کے نہ تو بے کیف ہوتی ہے اور نہ خشک بلکہ الفاظ کی سجاوٹ اور جملوں کی ساخت سے ایک خاص روانی اور حلاوت پیدا ہو جاتی ہے۔ شروع سے آخر تک آپ کا طرز نگارش یکساں اور ہموار ہے۔ باوجود ثقیل اور وزنی مسائل پر گفتگو کرنے کے پڑھنے والوں کی دلچسپی برقرار قائم رہتی ہے۔ مرکزی اور ٹھوس باتوں پر ایسے بے لاگ اور مطمئن انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر سے مخالفت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان کے خیال میں اضافہ کر سکتے ہیں لیکن ان کے طرز استدلال سے انحراف کیا نہیں جا سکتا۔ آپ زبان اور طرز نگارش پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اپنی تنقید میں زیادہ تر انہی چیزوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر کسی طبقے کو یہ شکایت ہے کہ آپ کے یہاں عمق اور فلسفہ بہت کم ہے تو یہ ایسی کمی ہے جو ابھی تک تمام اردو تنقید میں کم و بیش پائی جاتی ہے

اصول تنقید کے لحاظ سے مسعود صاحب قدامت پسند نظر آتے ہیں چنانچہ موجودہ اردو شاعری کی روش آپ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے بلکہ اس افادی شاعری کو خرافات سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپ قدیم رنگ کی جذباتی شاعری میں ایک سکون اور نجات کا دریا موجزن پاتے ہیں اور موجودہ رجحان اور حقیقت نگاری کو شاعری میں دیکھ کر

پریشاں ہو جاتے ہیں اور وہ غالباً اس لئے کہ زندگی کی حقیقتوں اور پریشانیوں سے ہمیں
بھی دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن اس کو کیا کہیئے کہ ہماری زندگی موجودہ حالت میں سراپا
پریشانیوں کا مرقع ہے اور ان کا دور کرنا ہمارے لئے اب ناگزیر ہو گیا ہے ترقی پسند ہمیں
اور شعرا حیات کو ادب سے ہم آہنگ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں، قدامت پسندی کے لحاظ سے
زندگی کی کش مکش سے سکون حاصل کر لینا ہی ادب کا مقصد ہے لیکن موجودہ شاعر اس کو فراریت
سے تعبیر کرتا ہے اور قدیم روایہ کو اردو ادب کی ترقی میں ایک روڑا سمجھتا ہے بہرحال
یہ فرق جدید اور قدیم خیالات اور اصول زندگی کے ہیں۔ یہاں اس بحث کو زیادہ
بڑھانا نامناسب اور شاید بیکار بھی ہے۔

مسعود حسن صاحب حسن انہماک کے ساتھ اپنی تحقیق اور تدقیق کی سرگرمی کو قائم
کئے ہوئے ہیں اور حسن وسیع النظری کا ثبوت اب تک انھوں نے دیا ہے اس سے یقین
ہے کہ وہ موجودہ ادبی رجحانات سے بھی اپنے کو دور نہ پائیں گے

محی الدین زور

ڈاکٹر زور عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ادب کے پروفیسر ہیں انگلستان سے ادب کے
ڈاکٹر ہونے کی سند بھی لائے ہیں اردو ادب کی خدمت کرنے کا اتنا شوق ہے کہ اب
تک ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں یہ تعداد خود اپنی جگہ پر ڈاکٹر زور کے
علمی مشغلہ کی شہادت کے لئے بہت کافی ہے لیکن جب ہم تصنیفات کے مختلف موضوعات
پر نظر ڈالتے ہیں تو وقعت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے

آپ نے اردو ادب میں تنقید کی کمی محسوس کر کے اس موضوع پر قلم اٹھایا انگریزی
کے فن تنقید سے مدد لے کر اپنے ادب کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی نہایت محنت کے

ساتھ اصول تنقید، اقسام تنقید پر مواد فراہم کئے، اردو ادب پر ان کی روشنی میں نظر ڈالی
مختلف مصنفین کے کارناموں پر بحث کی شبلی کی طرح اردو کو فائدہ پہنچانے کے لئے اردو
کے علاوہ دوسری زبانوں کی سرسری تنقیدی نظر ڈالی بعض انگریزی شعراء کے کلام پر
رائے زنی کرکے ہماری رہنمائی کے لئے عمدہ نمونے پیش کئے ڈاکٹر زور کا یہ تمام کارنامہ بڑی
جگہ پر خاص اہمیت رکھتا ہے ان کی تصانیف میں ہم کو کافی ایسا مواد مل جاتا ہے جو
ادبی و علمی معلومات کے لئے بہت کارآمد و ضروری ہے ایسے مطالعہ سے خود ہی فائدہ نہیں
اٹھاتے بلکہ جو کچھ عمدہ چیزیں کہیں منتشر صورت میں بھی نظر آجاتی ہیں ان کو اردو ادب
میں لانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں دنیا کے سامنے کتابی صورت میں مع اپنی رائے کے
دوبارہ پیش کردیتے ہیں اس سلسلے میں ایک قابل قدر خوبی یہ ہے کہ انگریزی ادبیات کے
وسیع مطالعہ سے آپ بیجا طور پر مرعوب و متاثر نہیں ہوئے مشرق یا مغرب کے طرز
معاشرت کے نقطۂ نظر کے اختلافات کو بھی پیش نظر رکھا ہے کسی نوجوان اردو پڑھے ہوئے
انگریزی داں یا مغرب زدہ کی طرح اپنی زبان اور اپنے ادب کو حقیر نہیں سمجھا ان کمی ضرور
محسوس کی ہے جو واقعہ بھی ہے اور بغیر اس احساس کے ادب کی ترقی بھی ناممکن ہے

ڈاکٹر زور کو مال کثرت مطالعہ نے اتنی فرصت نہیں دی کہ وہ اپنے اسلوب بیان
میں کوئی خاص انفرادیت پیدا کرسکیں ان کے طرز بیان میں سادگی اور روانی تو ہے
صحت کی و متانت کی کمی بھی ہے۔ لیکن علوم میں دھن، جس رو رو کو ڈھونڈتا ہی رہ
جاتا ہے اس تواتر کی وجہ سے عبارت میں ایک ہیجان کبھی کبھی محسوس ہونے لگتا
ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ ادبیت کی کمی ہے ڈاکٹر زور نے تنقیدی مقالات میں ایک
جگہ حالی کی طرز تحریر اور ان کی حسن ادا ان کے اسلوب بیان کی فہرست دی ہے اسی
ہاتھ کی روشنی میں ہم خود ڈاکٹر زور کی خصوصیات بیان کر دیتے ہیں جو ان ہی کے
الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کی تحریر کی بعض نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ ان کی عبارت میں ظرافت، شوخی اور طنز و تشنیع بالکل نہیں بلکہ اس لئے وہ ہر بات کو سنجیدگی اور متانت سے ادا کرتے ہیں۔

۲۔ ان کے کلام میں فارسی عربی کے موٹے موٹے الفاظ اور اس قسم کی حد تذکیریں بہت کم ہیں جو آجکل کے نوجوان انشاپردازوں میں بہت پائی جاتی ہیں۔

۳۔ وہ بازاری سوقیانہ اور مبتذل الفاظ استعمال نہیں کرتے

۴۔ تشبیہوں استعاروں اور تلمیحوں سے بہت کام لیتے ہیں

"ادارہ ادبیات اردو" قائم کرکے انہوں نے اردو کی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں اس ادارہ سے بہت سی کتابوں کے علاوہ "کلیات سراج"، "کلیات قطب شاہ" بہت اچھی طرح شائع ہو چکی ہیں۔

احتشام حسین

آپ قصبہ ماہل ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے انٹرنس اعظم گڑھ کے شبلی ہائی اسکول سے پاس کرکے حصول تعلیم کے لئے الہ آباد آئے اور یہاں سے ایم اے پاس کرکے بعد ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر مقرر ہوگئے اس تقرر کے پہلے ہی اپنی غیر معمولی ذہانت اور اپنے ادبی ذوق کی وجہ سے دنیائے ادب کی نگاہوں کو متوجہ کر چکے تھے یونیورسٹی کی ملازمت کے بعد جب فکر معاش سے اطمینان ہوا تو آپ نے اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے کے ساتھ ہی ساتھ مضامین اور افسانے لکھنے کی طرف زیادہ توجہ کی اور کچھ ہی دنوں کے بعد ملک کے تمام وقیع رسائل میں آپ کے مضامین نظر آنے لگے

احتشام حسین صاحب نے مغربی ادب کا بڑی دلچسپی اور تعمق کے ساتھ مطالعہ کیا

اس غیر ملکی خیالات کو لیے ادب منطق کرنے میں کورانہ تقلید کے بجائے احتیاط مد نظر رکھی ہے۔ ان کی تنقیدی تحریریں بہت سلجھی ہوئی ہیں۔ وہ معاشی اور مادی توجیہہ کو ہر دوسرے ادبی نقطۂ نظر پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی اور ادب دونوں اساسی قدریں مادی قدریں ہیں ادبی نقطۂ نظر سے ان کی تنقیدوں میں ایک طرح کی انفرادیت ہے حالی پر ان کا مضمون تنقید میں ایک نئے نقطۂ نظر کا پتہ دیتا ہے۔ آپ کی تصنیف "تنقیدی جائزے" اردو کی فن تنقید نگاری میں ایک اضافہ ہے جو ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے اس کے علاوہ احتشام صاحب کی دوسری تصانیف حسب ذیل ہیں۔

روایت و بغاوت، ادب اور سماج اردو لسانیات کا خاکہ (ترجمہ) ویرانے (افسانوں کا مجموعہ) تنقید اور عملی تنقید۔

طرز تحریر میں علاوہ شگفتگی کے ایک خاص ندرت و لطافت ہے جس سے دلکشی میں قابل قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔

احتشام حسین صاحب کو امریکہ کی ایک انجمن نے وہاں کے ذہنی رجحانات کے مطالعہ کے لئے ایک خاص وظیفہ دے کر مدعو کیا ہے چنانچہ موصوف وہیں ہیں اس کے معنی ہیں کہ غیر ممالک کے لوگ بھی ان کی قابلیت اور طرز تحریر کے قائل ہیں۔ ہمارے نزدیک احتشام حسین اس وقت اردو کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔

سال بھر کے بعد احتشام صاحب امریکہ ولندن وغیرہ کے سفر سے کامیاب واپس آئے وہاں کے چشم دید حالات اور اپنے تاثرات کو کتابی صورت میں "ساحل اور سمندر" کے نام سے شائع بھی کر دیا ہے۔

عندلیب شادانی

ان کا نام وجاہت حسین ہے اصل وطن سنبھل ضلع مرادآباد ہے ننھیال رامپور میں ہے ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی دسویں درجے میں پڑھتے پڑھتے رامپور سے لاہور چلے گئے، وہاں حصول تعلیم میں مصروف رہے ۱۹۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ اس سے پہلے ہی کچھ دنوں سینٹ کالج لاہور میں ملازم رہے ۱۹۲۶ء میں ہندو کالج دہلی میں فارسی کے لیکچرار ہو گئے ۱۹۲۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے ۱۹۳۴ء میں لندن یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اب تک آپ ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی اور اردو کے پروفیسر ہیں

ڈاکٹر عندلیب شادانی عرصہ سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں اب تک ان کے کئی مجموعے نثر و نظم میں شائع ہو چکے ہیں ان کا قلم نثر و نظم، دونوں میدانوں میں یکساں رواں ہے اس کا فیصلہ کرنا آسان کام نہیں کہ وہ شاعر زیادہ ہیں یا نثر نگار لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان دونوں میں ان کی انفرادیت نمایاں ہے نظم میں وہ زیادہ تر ایسے ہی خیالات قلمبند کرتے ہیں جو اچھوتے ہوں ان کے تحریکات یا محسوسات ذہنی ہوں اس لئے ان کے کلام میں شگفتگی اور تازگی بہت کافی ہوتی ہے الفاظ و خیالات ہم آہنگ ہوتے ہیں اور سارے شعر ان کا نتیجہ پاکیزگی و فصاحت و سادگی کے ساتھ دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں وہ شعر کہنے کے لئے نہیں کہتے بلکہ جب جذبات و خیالات ان کو مجبور کرتے ہیں تب کہیں وہ قلم اٹھاتے ہیں

نظم سے زیادہ ان کی نثری خدمات اردو میں وسیع و قابل قدر ہیں جس کی

سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ صاحب علم بھی ہیں اور اپنی رائے پر اتنا غور کرتے ہیں
اس کے موافق و مخالف پہلوؤں پر جذبات سے الگ ہو کر اتنا سوچتے ہیں کہ جس نتیجہ
پر پہنچتے ہیں وہ جاندار اور مدلل ہوتا ہے۔ ان کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے
لیکن جو منطقی ماحول وہ اپنے دلائل کو عطا کرتے ہیں اس کے دائرہ سے باہر نکلنا
آسان نہیں ہوتا۔ جس موضوع یا مصنف پر وہ رائے زنی کرتے ہیں نہایت بیباک
ہو کر اظہار خیال کرتے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ لہجہ یا انداز بیان میں ذاتی خصومت نہیں
پیدا ہوتی بلکہ ساری فضا ایک نقد و تبصرہ کے آغوش میں جھولتی رہتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شادانی صاحب گرامر اور لسانیات پر ضرورت سے
زیادہ زور دیتے ہیں۔ سماج کے بدلتے ہوئے رنگ سے اپنے کو ہم آہنگ نہیں
کر پاتے۔ لسانی تغیرات و ضروریات کو رواداری کے ساتھ دیکھنا نہیں چاہتے۔
عہد ماضی کے پرستار ہیں۔ دور جدید پر بیگانہ نظر بھی ڈالنا گوارا نہیں کرتے۔
وہ ایسی صحیح زبان لکھتے، بولتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ نہ اجتہاد کے قائل ہیں اور نہ ادیبوں
کی جرأت رندانہ کی داد دے سکتے ہیں۔ نہ یہ پسند کرتے ہیں کہ کبھی کوئی شاعر ان حالات
کو قلمبند کرے جو باوجود حقائق پر مبنی ہونے کے عام طور پر ناگفتنی سمجھے جاتے ہیں

شادانی صاحب کا نثر میں اسلوب بیان نہایت سیدھا سادا ہے۔ وہ تشبیہات
و استعارات کے سہارے پر قلم نہیں اٹھاتے بلکہ مواد کی فراوانی اور خیال کی مضبوطی
سے سرشار ہو کر دل کی بات کہتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کر رہے ہیں
ان کی عبارت میں عموماً بول چال کی چاشنی ہوتی ہے۔ محاورات و ضرب الامثال
موقع سے پیش کر کے دلکشی میں اضافہ کرتے جاتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ
وہ ثقیل الفاظ و بے کیف عبارت سے مضمون کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیتے۔

شوکت سبزواری نے ایک[1] جگہ شادانی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ

---

[1] نقوش شخصیات نمبر جنوری ۱۹۵۵ء

"انھوں نے اردو کے اساتذہ کے کلام کا مطالعہ انفرادی نگاہ سے کیا۔ اسے ذاتی معیاروں پر رکھ کے دیکھا اور جب انھیں شاعر کی زندگی اور اس کے کلام میں تضاد نظر آیا تو وہ شاعر کو رسم پرست اور اس کے کلام کو رواجی کہنے لگے۔ اگر وہ انفرادیت کے تنگ دائرہ سے باہر نکل کر دیکھتے اور آفاقی یا خارجی نقطۂ نگاہ پیدا کرتے تو وہ ان شعرا کے کلام کو صرف ان کی زندگی پر منطبق کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ اس میں انھیں گرد و پیش کی تصویر نظر آتی اور وہ ان کی آواز کو کائنات کے دکھی دلوں کی صدائے بازگشت سمجھ کر اس پر معترض نہ ہوتے۔" اس رائے سے ہم کو بھی اتفاق ہے۔

آلِ احمد سرور

سنہ ۱۹۱۲ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ والد کی ملازمت کی وجہ سے ہائی اسکول تک کی تعلیم مختلف مقامات پر ہوئی۔ مثلاً پیلی بھیت، بدایوں، گڑھوال، غازی پور وغیرہ۔ بی ایس سی سنہ ۱۹۳۱ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ سے کیا۔ علی گڑھ سے سنہ ۱۹۳۴ء میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد وہیں مسلم یونیورسٹی میں جگہ مل گئی۔ پانچ سال تک انگریزی پڑھاتے رہے۔ پھر بحیثیت استاد کے شعبہ اردو میں منتقل ہو گئے۔ کئی سال کام کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں ریڈر ہو کر چلے آئے۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں پروفیسر ہو کر پھر مسلم یونیورسٹی چلے گئے۔

سرور صاحب کی چار کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ تنقیدی اشارے، نئے اور پرانے چراغ، تنقید کیا ہے، ادب اور نظریہ۔ اس کے علاوہ نظموں کا ایک مجموعہ بھی ہے۔

نقاد کی حیثیت سے سرور صاحب نے بہت جلد ایک نمایاں شہرت حاصل

کرلی جس کی حد یہ تھی کہ وہ سائنس سے بھی واقف تھے انگریزی ادب کے بھی ماہر
تھے اور اردو کے تو پروفیسر ہی تھے انھوں نے اردو کا مزاج سمجھتے ہوئے سائنس
کا طرز تحلیل بھی اردو میں لانے کی کوشش کی اور انگریزی ادب سے بنیادی
اصولوں کو اخذ کرکے اپنی زبان کو ہر لحاظ سے وسعت عطا کی مختلف معلومات کے
امتزاج کی وجہ سے ان کی تنقید نگاری نے ایک نمایاں حیثیت حاصل کرلی چونکہ
بچپن ہی سے ان کا ماحول علمی و ادبی تھا اس لئے ادبی شعور ان کی طبیعت کا جزو ہو گیا
تھا وہ اردو کے محاسن و معائب پر اپنی ایک رائے رکھتے تھے۔ مشرق و مغرب کے انداز
بیان و طرز معاشرت کا فرق پوری طرح محسوس کرتے رہے یہ نہ تھا کہ انگریزی ادب
پڑھ کر اس سے اتنا متاثر ہو جائیں کہ اردو کو بالکل انگریزی کی عینک سے دیکھنے
لگیں باوجود اختلاف مزاج کے بھی انھوں نے اردو کی ایسی خصوصیات پر جو بادی النظر
میں عیوب سے تعبیر کی جاتی تھیں ٹھنڈے دل سے غور کرکے حقیقت حال بیان
کرنے کی کوشش کی اور سمجھایا کہ ان تشبیہات و استعارات تلمیحات کے پردے ہٹا کر
دیکھنا چاہیے کہ ہمارے ادیبوں کے پیش نظر کیا چیزیں تھیں اردو والے بات کرنے کا
اور سوچنے کا ڈھنگ درحقیقت الگ رکھتا تھا اس کو سمجھنے کے لئے اردو کے مزاج سے
واقفیت ضروری ہے

سرور صاحب کا طرز استدلال بہت دلکش ہے وہ جس بات کو سمجھاتے ہیں اس
کی وضاحت پوری طرح کرتے ہیں۔ عبارت میں ابہام یا الجھاؤ نہیں ہوتا کہ ذہن
اصل مقصد تک پہنچنے میں دقت محسوس کرے ایک اور خاص انداز ان کے یہاں نظر
آتا ہے وہ تنقید کو وہی زبان دیتے ہیں جو اس کے لئے مناسب ہوتی ہے نہ ادبیت
زیادہ ہوتی ہے اور نہ زور بلکہ عبارت ایک دھارے کی طرح اپنے راستے پر چلی جاتی
ہے اس انداز بیان سے بعض لوگوں کو شکایت بھی ہے کہ سرور صاحب کے طرز بیان

میں جوش و خروش کی کمی ذہن میں ایک افسردگی پیدا کر دیتی ہے۔ غالباً اسی قسم کی ترکیبات
کا احساس کرتے ہوئے سرور صاحب نے اپنی کتاب "تنقید کیا ہے" کے دیباچے میں
ایک جگہ لکھ دیا ہے کہ "ایک بات مجھے اسلوب کے متعلق کہنی ہے۔ میں نے اپنے مضامین
میں جا بجا شاعرانہ انداز بیان یا جذباتی اسلوب کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ میرے
یہاں اشعار کی کثرت یا اقتباسات کی بھرمار نہ ملے گی لیکن اشعار نے ادبی کتابوں
کے نام، ادبی شخصیتوں کے تذکرے، ادبی تحریکوں کے متعلق اشارات وہاں سے آئے کہ
تنقید کے درس کا اندازہ ہو سکتا ہے [illegible] مجھے وہ نثر بھی کھلتی علم بدیع سے
جس میں خیال آئینے کی طرح واضح ہے جس میں علمیت کا رعب ڈالنا مقصود نہیں۔"
آخر میں اسی کتاب کے دیباچے سے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ سرور صاحب کے
خیالات تنقید کے بارے میں بھی آپ کے سامنے پیش کر دیں۔ [illegible] لکھتے ہیں "میں
تنقید کو ایک سنجیدہ، اہم اور مشکل فن سمجھتا ہوں۔ [illegible] اس کا مقصد [illegible]
قدروں کی اشاعت جانتا ہوں اس لئے پڑھنے والوں سے بھی سنجیدگی اور [illegible]
غور و فکر کا مطالبہ کرتا ہوں۔"

وقار عظیم

[illegible] ان کا تاریخی نام [illegible] ہے۔ سن [illegible] ہجری ان کا سن پیدائش [illegible]
[illegible] کے رہنے والے تھے۔ اب پاکستان میں اورینٹل کالج لاہور میں [illegible]
سے کام کر رہے ہیں۔ ابتدائی تعلیم [illegible] میں ہوئی [illegible]
اسکول کے پانچویں درجے میں نام لکھا کر انگریزی شروع کی۔ [illegible] لکھنؤ یونیورسٹی
سے پاس کیا اور ایم اے الہ آباد یونیورسٹی سے [illegible] امتیازی حیثیت سے

پاس کرتے رہے۔ بڑے ہونہار طالب علم تھے یہاں تک کہ دوران تعلیم ہی میں دو کتابیں
"ہمارے افسانے" اور "افسانہ نگاری" ایسی لکھیں جو بہت کارآمد ثابت ہوئیں

تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسبِ معاش کے لئے مختلف مقامات کا چکر لگاتے
رہے مختلف عہدوں پر وقتاً فوقتاً کام کرتے رہے۔ جب حکومتِ ہند نے سرکاری جریدہ
"آج کل" نکالنا چاہا تو سب سے پہلا ایڈیٹر ان کو ہی منتخب کیا وقار عظیم صاحب
بڑی قابلیت سے اس کا فرض ادا کرتے رہے تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے اور
وہاں حکومت پاکستان کا رسالہ "ماہ نو" مرتب کرتے رہے گویا ہر سرکاری جریدے
کی ابتدا دونوں ملکوں میں ان ہی کے ہاتھوں سے ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد اورینٹل کالج
لاہور میں لیکچرار کی حیثیت سے چلے آئے اور اب تک وہیں ہیں

وقار عظیم صاحب کا علمی و ادبی ذوق ہمیشہ اہل علم اور صاحب فن سے ملنے پر
مائل کرتا رہا چنانچہ وہ برابر پڑھے لکھے لوگوں سے ملتے رہے۔ علم سینہ اور علم سفینہ دونوں
سے فیضیاب ہوتے رہے۔ لکھنے پڑھنے کی لگن شروع ہی سے تھی چنانچہ اب تک
یہ ملکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ پڑھنا لکھنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے جب لکھنے پر آتے
ہیں تو نہ کسی ماحول کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ امن وسکون کی فکر کرتے ہیں ان کا
قلم ہر حال میں چلتا رہتا ہے چاہے شور و غل ہو یا لوگ پاس بیٹھے ہوئے دوسری
تفریحات میں مصروف ہوں ان کو اپنے کام سے کام، وہ ایک روزانہ اخبار
کے ایڈیٹر کی طرح لکھتے وقت ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر فوراً سب کچھ لکھ
جاتے ہیں ان کی اس عجلت پسندی میں ایک خرابی بھی کبھی کبھی نظر آتی ہے تفکر و
تجسس کے عناصر کم ہو جاتے ہیں لیکن ان کے احاطۂ تنقید سے کوئی قابل ذکر بات
نہیں رہ جاتی جس موضوع کو لیتے ہیں اس کا پورا جائزہ لیتے ہیں اور بے لوث
ہو کر معائب و محاسن پر نقد و تبصرہ کرتے ہیں۔

وقار عظیم صاحب کا طرزِ تحلیل دبستانِ قدیم سے زیادہ قریب ہے وہ اپنے تنقیدی تصور کو نئے نظریات سے ہم آہنگ نہیں کرنا چاہتے زیادہ تر ان کا خیال الفاظ، زبان کی صحت پر رہتا ہے فن اور مواد پر دھیان کم رہتا ہے لیکن جو بات کہتے ہیں نہایت واضح اور صاف غالباً ان کی طرزِ تحریر میں ابہام و پیچیدگی کی گنجائش بھی نہیں ان کے خیال میں بھی سادگی ہے بیان میں بھی سادگی اور طرزِ تحریر میں بھی ان کی تصانیف پڑھتے وقت آپ کو کہیں ذہن پر بار یہ محسوس ہوگا آسانی سے ہر بات سمجھ میں آجائے گی اور آخر میں محسوس ہوگا کہ بہت کچھ معلومات میں اضافہ ہوا وقار عظیم صاحب سے اختلاف رائے پر زیادہ دیر تک بحث نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اپنی تائید میں اتنے حوالہ جات پیش کر دیتے ہیں کہ اختلاف کرنے والا مجبور ہوتا ہے کہ ان مستند مصنفوں سے بحث کرے جن کا حوالہ دیا گیا ہے اس اتنے دلائل اور ثبوت کے بعد جب وقار صاحب انفرادی حیثیت سے کسی ادبی تصنیف یا مسئلے پر رائے دیتے ہیں تو اس میں پختگی اور شعور کا بڑا حصہ ہوتا ہے ایک اور خوبی ان کے یہاں یہ ملتی ہے کہ نقطۂ نگاہ میں فرسودگی یا بیان میں تکرار نہیں اپنے محدود دائرہ تخیل میں وہ آزاد ہو کر نئے پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر یہ طریقہ وسیع النظر سے ہم آہنگ ہو جائے تو پھر ہم کو وقار عظیم صاحب کے یہاں کوئی کمی محسوس نہ ہو۔

ممتاز حسین

ان کی جائے ولادت ضلع غازی پور کا ایک قصبہ "یارہ" ہے۔ ابتدائی تعلیم غازی پور ہی میں ہوئی۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد الہ آباد میں بی اے تک کی تعلیم حاصل کی بعد میں مسلم یونیورسٹی سے بی ٹی اور آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا مختلف

مقامات پر ملازمت کرتے رہے۔ مزاج میں ہمیشہ سے سیر و سیاحت کا مادہ تھا چنانچہ
تقسیم ہند کے پہلے کوئٹہ اور سندھ کے مختلف تعلیمی اداروں میں نوکری کرتے رہے
پھر سب سے دست بردار ہو کر ذوق سیاحت کی تشنگی بجھانے کے لئے کبھی مدراس
کبھی میسور کبھی بمبئی غرضکہ ہندوستان کے ہر گوشے کی سیر کر ڈالی فی الحال وہ
کراچی میں قیام پذیر ہیں۔

تمام سیر و سیاحت میں انھوں نے اپنا علمی مشغلہ نہ چھوڑا جہاں کہیں
بھی رہے اور جس عالم میں رہے کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا پڑھنے کو تو اور
بہت سے لوگ پڑھتے رہتے ہیں اور ہر حال میں پڑھتے رہتے ہیں لیکن ممتاز حسین
کی انفرادیت قابل قدر ہے کہ جو معلومات وہ حاصل کرتے تھے اس پر غور و فکر برابر
کرتے رہتے اور تمام خیالات یا نظریوں پر اپنی رائے قائم کرتے کورانہ تقلید کی
نہ کبھی کوشش کی نہ اپنے ذہن کو بڑے سے بڑے مفکر کے سامنے صرف اس لئے
مفلوج کرنے کی عادت ڈالی کہ یہ خیال یا فکر ایک بڑے اعلیٰ مفکر کے ذہن کا نتیجہ
ہے غرض یہ کہ وہ اپنے طور پر سوچنے اور سمجھنے کے عادی ہو گئے

جہاں تک معلوم ہے ممتاز حسین کبھی فلسفہ یا تاریخ کے باقاعدہ طالب علم نہیں
رہے بلکہ اپنے طور پر ان علوم کا مطالعہ کرتے رہے۔ مگر ان کی تحریروں کو دیکھنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ اور تاریخ ان کے خاص مضمون ہیں۔ مختلف علوم و فنون سے
آراستہ ہو کر جب انھوں نے قلم اُٹھایا تو بڑی تیزی سے شہرت میں اضافہ ہوا
لکھنے کو انھوں نے افسانے بھی لکھے مگر فن تنقید کی طرف زیادہ توجہ کی اس میں ایک
عالمانہ انداز اور مخصوص فکری عناصر سے سر اُٹھایا۔ جدلیاتی طرز فکر اردو
تنقید میں نرالی چیز نہ تھی۔ اس کے سمجھنے اور جاننے والے اردو میں بہت کم تھے
ممتاز حسین نے اپنی تنقید کو اس عنصر سے مالامال بنانے کی کوشش کی اور ایسی

صلاحیتوں کا ثبوت دیا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ان سے بہتر اردو میں ابھی تک
کسی کا کارنامہ اس نقطۂ نظر تک نہیں آیا۔ ممتاز حسین کی تنقید بڑی ٹھوس اور پُر مغز
ہوتی ہے اس میں جذبات سے زیادہ عقل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اپنے خیالات کو دلائل و
تاریخی واقعات سے مضبوط کرتے ہیں اپنی ہر رائے کے لئے ثبوت پیش کرنا ضروری سمجھتے
ہیں مغرب و مشرق کی اہم شخصیتوں کے خیالات و اقوال تائید میں لاتے رہتے ہیں ہر
قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے بڑے بڑے مفکرین کے نتائج فکر کو سوچ سمجھ کر
اپنے ذہن میں جگہ دی ہے ان کی تحریروں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر تک
پڑھنے کے بعد کتاب رکھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ ہم نے کیا پڑھا اور ممتاز صاحب نے
کیا لکھا اس کو ہم نے ذہن میں کہاں تک محفوظ کیا اور آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے
پڑھا کم لیکن معلومات زیادہ حاصل ہوئیں ذہن میں بہت سی باتیں آگئیں۔

ان کی تحریروں میں نہ کوئی جوش و خروش ہوتا ہے نہ غصہ اور طنز کی لہریں نظر آتی
ہیں بلکہ ایک پُروقار سنجیدگی اور ذہنی ٹھہراؤ کا احساس ہوتا ہے صرف کمی معلوم ہوتی
ہے کہ طرز تحریر میں شگفتگی وہ نہیں جو ہونی چاہیئے۔ الفاظ کا استعمال اور جملوں کی ساخت
کبھی کبھی نامانوس معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انھوں نے لکھنا بڑی
دیر میں شروع کیا۔ طرز تحریر میں بے ساختگی نہیں پیدا ہوسکی عبارت میں آمد سے زیادہ
آورد ہے ہوسکتا ہے کہ یہ احساس اس لئے ہو کہ وہ غیر مطلب اور نئی باتوں کے
لانے کی فکر میں انشا پردازی کا لحاظ کم کرتے ہیں یا پھر نامانوس باتوں کو نئے سانچے
میں دیکھ کر پرانے سانچے میں ڈھلی ہوئی ا… ان کی تحریروں میں وہ انبساط نہیں پیدا
کرتی ہو جو اسے کرنا چاہیئے۔

۶

ناول

نذیر احمد

نذیر احمد سنہ ۱۲۵۲ھ مطابق دسمبر ۱۸۳۶ء میں مقام موضع ریہڑ ضلع بجنور پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے باپ سے حاصل کی بعد میں مولوی نصر اللہ خان سے عربی کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دہلی آئے اور کچھ دنوں تک مکتب میں پڑھتے رہے مگر یہاں کی تعلیم سے سیری نہ ہوئی خوش قسمتی سے دہلی کالج میں داخلہ ہو گیا اور قابلیت کی وجہ سے وظیفہ بھی مقرر ہو گیا اس کالج میں آٹھ برس تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد فراغت حاصل ہوئی تو ملازمت کی فکر ہوئی ضلع گجرات (پنجاب) میں چالیس روپے ماہوار پر مدرس ہو گئے دو برس تک اس ملازمت کو نباہتے رہے پھر اس کے بعد استعفیٰ دے کر کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ لیکن وہاں کی بھی ملازمت راس نہ آئی اور استعفےٰ دینا پڑا خوش قسمتی تھی کہ بار بار ملازمت ترک کرتے تھے اور پھر مل جاتی تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد نذیر احمد ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد منتخب ہوئے اور یہاں

انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا۔ چنانچہ چند دنوں میں اس علم کو بھی حاصل کر لیا جب دن اچھے آتے ہیں تو ترقی کی راہیں خود بخود کھل جاتی ہیں۔ گورنمنٹ کو اس زمانہ میں تعزیرات ہند کا ترجمہ کرانا منظور تھا مولوی عظمت اللہ اور مولوی کریم بخش اس کام پر پہلے سے مامور تھے بعد میں نذیر احمد بھی ترجمہ کے کام میں شریک کیے گئے ان کا کام اتنا پسند آیا کہ لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور نے خوش ہو کر کانپور کا تحصیلدار کر دیا جس سے ترقی کر کے نذیر احمد ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔

ایک ہیئت کی کتاب حیدر آباد کے ریزیڈنٹ نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے بھیجی جس کو انھوں نے اس خوبی سے انجام دیا کہ حیدر آباد والوں نے آٹھ سو روپے ماہوار پر لیے یہاں بلا لیا یہاں رہ کر انھوں نے اپنی علمی قابلیت سے بہت کچھ ترقی کی لیکن آخر میں سیاسی مصلحت کی وجہ سے پنشن لیکر دہلی واپس چلے آئے

پنشن لینے کے بعد نذیر احمد کو یکسوئی حاصل ہو گئی۔ اور لکھنے پڑھنے کا کام زیادہ سرگرمی سے کرنے لگے مگر جسمانی قوت روز بروز زائل ہوتی جاتی تھی اعضا ایک ایک کر کے جواب دیتے جاتے تھے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا۔ بینائی بھی کم ہو چلی لیکن علم کا چسکا ایک بری بلا ہے مرتے دم تک لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رہا یہاں تک کہ جب خود کام نہ کر سکتے تھے تو دوسروں سے لیتے تھے آخر ۱۹۱۲ء میں انتقال ہوا

یوں تو گورنمنٹ نے نذیر احمد کی علمی خدمات پر اکثر انعامات دئے لیکن ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور ۱۹۰۲ء میں اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی۔

نذیر احمد کی یادگار حسب ذیل کتابیں ہیں۔

ناول، مراۃ العروس بنات النعش، توبۃ النصوح ابن الوقت۔ محصنات ایامیٰ، رویائے صادقہ منتخب الحکایات

اخلاق و مذہب، ترجمہ قرآن شریف ۔ ادعیۃ القرآن ۔ دہ سورہ الحقوق والفرائض
مطالب القرآن ۔ امہات الامہ ، اجتہاد ، موعظہ حسنہ
قواعد رسم الخط صرف صغیر مالیغنیک فی الصرف
تعزیرات ہند قانون شہادت (ترجمہ)

نذیر احمد کا بڑا کام اصلاح معاشرت ہے جس کا خیال انھوں نے اپنی ناولوں میں رکھا ہے انھوں نے اسلامی سوسائٹی اور خاص کر مسلمانوں کے خاندانوں کی اندرونی معاشرت کی تصویر ایسی بے لاگ کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہے ۔ روزمرہ کے معمولی واقعات جو صبح و شام ہماری آنکھوں کے سامنے گھروں میں اندر باہر واقع ہوتے رہتے ہیں ان کا خوبی سے بیان کرنا نذیر احمد کا خاص حصہ ہے ان کے احسانات طبقۂ نسواں پر بھی کم نہیں ۔ مراۃ العروس وغیرہ میں عورتوں کے خیالات کو ہو بہو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ یہ خوبی کسی دوسرے مصنف کو نصیب نہیں ہوئی ان کی تحریر میں بے تکلفی اور بے ساختہ پن بہت ہے وہ تشبیہ اور استعارہ سے بہت کم کام لیتے ہیں یہ ضرور ہے کہ بعض وقت مغلق الفاظ لکھتے ہیں جس کی خاص وجہ غالباً ان کی عربی دانی ہے لیکن جہاں موقع ہوتا ہے وہاں عام ہندی کے الفاظ بھی لانے میں دریغ نہیں کرتے ۔ گو متانت اور سنجیدگی کا لحاظ عبارت میں رکھتے ہیں لیکن پھر بھی اپنے مفہوم کو پوری طرح ادا کرنے کے لئے بعض وقت رکیک اور مبتذل الفاظ بھی لے لیتے ہیں محاورات کا بھی یہی حال ہے گو وہ ہر وقت محاوروں کا خیال رکھتے ہیں لیکن کہیں کہیں بے محل محاورات بھی صرف ہو گئے ہیں (اسی طرح انگریزی الفاظ کی بھی بھرمار ہے) ان کی تحریر میں شوخی و ظرافت بہت کافی ہے ۔

ناول نویسی کے موجد عام طور پر اردو کی ناول نویسی کا بانی سرشار کو خیال

کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں نذیر احمد اردو کے سب سے پہلے ناول نویس ہیں اس لئے انکی تصانیف بنات النعش (۱۸۷۲ء) مرآۃ العروس (۱۸۶۹ء) اور توبۃ النصوح (۱۸۷۷ء) سرشار کے پہلے ناول سے بہت قبل شائع ہو چکی تھیں[1]

نذیر احمد نے قوتِ گویائی میں بھی خاص ملکہ حاصل کر لیا تھا اکثر بڑے بڑے جلسوں میں پُر زور تقریریں بھی کیں اس طرح شعر گوئی سے بھی آخر میں دلچسپی ہو گئی تھی لیکن اس میدان میں ان کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں ہوا۔

سرشار

۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابھی صرف چار سال کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے اس زمانہ میں عربی و فارسی کی تعلیم تحصیل میں ایک لازمی چیز تھی۔ سرشار نے بھی فارسی پڑھنا شروع کر دیا تھوڑے عرصے میں کافی دستگاہ حاصل کر لی۔ جب انگریزی تعلیم کا رواج ہوا تو کیننگ کالج میں داخل ہو گئے مگر کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔

سلسلۂ معاش کے لئے کھیری کے ضلع اسکول میں مدرسی کر لی اس وقت ہندوستان اور خاص کر اودھ ایک نئے دور سے گزر رہا تھا ہر طرف اصلاح اور اختراع اور ایجاد کی دھوم تھی۔ اپنی قومی زندگی درست کرنے کے لئے کشمیریوں نے بھی ایک رسالہ نکالا جس کا نام مراسلۂ کشمیر تھا سرشار کو بچپن ہی سے انشا پردازی کا شوق تھا اس موقع کو غنیمت سمجھ کر انھوں نے بھی اس رسالہ میں اپنے مضامین

[1] اس سلسلے میں الیس احمد صاحب ادیب کی کتاب اردو کا پہلا ناول نگار قابل دید ہے جس پر مصنف کو ہندوستانی اکیڈیمی سے انعام بھی مل چکا ہے ۱۲

دیا شروع کئے اودھ پنچ بھی اپنی خوبیوں کے ساتھ مقبول عام ہو رہا تھا سرشار نے اس میں بھی مضامین چھپنا شروع کئے ان کے طرز اسلوب نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا مضمون لکھنے کے علاوہ سرشار کو ترجمہ پر بھی بڑا عبور تھا چنانچہ سررشتۂ تعلیم کی طرف سے ایک رسالہ نکلا کرتا تھا اس میں اصلاحی اور علمی مضامین شائع ہوتے تھے مختلف لوگوں کے مضامین ہوتے تھے مگر سب سے زیادہ دلکشی سرشار کے ترجمہ میں ہوتی تھی بیجا نہ ہوگا اگر اسی سلسلے میں یہ ذکر بھی کر دیا جائے کہ علم طبعی کی ایک کتاب کا ترجمہ انھوں نے اردو میں کیا۔ گو مضمون نہایت مشکل تھا اور اصطلاحات خاص طور پر ترجمہ کے لئے مشکل تھیں۔ مگر سرشار نے اس کتاب کو اس خوبی سے اردو کا جامہ پہنایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ تصنیف ہے سرشار نے اس کتاب کا نام شمس الضحیٰ رکھا اب سرشار کی شہرت روز افزوں ترقی کے ساتھ ملک میں پھیلنے لگی یہاں تک کہ منشی نول کشور نے ان کو اودھ اخبار کی ایڈیٹری کے لئے منتخب کیا۔

سرشار کی ایڈیٹری کی وجہ سے اودھ اخبار کو جو عروج نصیب ہوا وہ اس کے لئے معراج کمال تھا۔ سرشار نے "فسانہ آزاد" کی بنیاد اسی اخبار سے شروع کی جو اردو ناول نویسی کے فن میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدا میں "فسانہ آزاد" حصہ حصہ مضامین کی صورت میں نکلتا رہا سال بھر کے بعد کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا۔ زبان کی خوبی اور زبان کی لطافت نے پہلے ہی سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا

یوں تو سرشار کی تصنیفات کئی ایک ہیں لیکن جس کتاب نے انھیں بقائے دوام کی خلعت سے سرفراز کیا وہ فسانہ آزاد ہے اس کتاب میں لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب اور گری ہوئی حالت کو دکھا کر اصلاح کی کوشش کی ہے یہ کتاب اردو میں فن ناول نویسی کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ

فسانۂ آزاد اردو ناول نویسی کا سنگِ بنیاد ہے لیکن ہمارے نزدیک ناول کی ابتدا
مولانا نذیر احمد کے ہاتھوں ہو چکی تھی جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے لیکن اس سے
انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرشار نے لوگوں کا رجحان دیکھ کر عین وقت پر ناول نویسی
کو اور زیادہ فروغ دیا۔ ان کا طریقہ بعید از کار باتوں اور اشخاص کو چھوڑ کر روزمرہ
کے واقعات اور ایسے اشخاص کو لیا جو آئے دن پیش نظر رہتے ہیں

فسانۂ آزاد کے علاوہ سرشار کی چند اور کتابیں بہت مشہور ہیں مثلاً سیرِ
کوہسار، کامنی، پی کہاں۔

بیان میں شگفتگی، زبان میں پاکیزگی، طرز ادا میں سلاست، آمد میں جوش،
محاورہ میں صفائی، روزمرہ میں لطافت، لکھنؤ کی مٹی ہوئی حالت، تہذیب، طرز معاشرت،
زبان، سلیقہ، علو ہمتی، شرافت، سوسائٹی کی پوری کیفیت کا نقشہ ان کی تحریر میں اس
طرح پایا جاتا ہے جیسے آئینے کے اندر تصویر۔ عیوب کو بھی ایسے طریقہ پر بیان
کرتے ہیں کہ سچی تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے اور برا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ منظر نگاری
میں مصور کی آنکھ اور شاعر کے دماغ سے کام لیتے ہیں۔ زبان شستہ اور پاکیزہ ہے
البتہ علمی رنگ کی چاشنی کم ہے۔ سرشار کی طبیعت میں اس قدر تسخیر تھا کہ جب وہ [illegible]
چاہتے ہیں تو ناکام نظر آتے ہیں۔ ان کے طویل ناولوں میں عام طور سے
پلاٹ غیر مربوط ہوتا ہے۔ کردار نگاری میں بھی ان کا قلم ایک سا نہیں چلتا
کسی کردار کی خصوصیت یک رنگی کے ساتھ قائم نہیں رہتی۔ البتہ مکالمے میں ان کو
ہر انداز پر قدرت ہے بول چال میں وہ اپنے ناول کے گوشہ گوشہ کو روشن
کر دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جس طریقے کا کیریکٹر ہوتا ہے ویسے ہی الفاظ
اس کے اظہار خیالات کے لئے لاتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں کبھی کبھی سوقیانہ
الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔

سرشار کی شہرت ملک میں چاروں طرف پھیل گئی تھی چنانچہ ۱۸۹۵ء میں وہ حیدرآباد تشریف لے گئے جہاں ان کا استقبال بہت گرمجوشی کے ساتھ ہوا۔ لیکن حیدرآباد جانے سے پہلے کچھ دنوں الہ آباد میں بھی قیام رہا جہاں ہائیکورٹ میں مترجم بھی ہو گئے تھے۔ حیدرآباد میں مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنا کلام اصلاح کے لئے سرشار کو دکھانا شروع کیا جس کے عوض میں دو سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ سرشار کچھ عرصے تک حیدرآباد میں دبدبۂ آصفیہ بھی نکالتے رہے افسوس ہے کہ مے نوشی نے اتنے قابل قدر دماغ کو قبل از وقت خراب کر دیا۔ اور ۱۹۰۲ء میں سرشار نے حیدرآباد ہی میں انتقال کیا۔

شرر

ولادت لکھنؤ میں سنہ ۱۸۶۰ء میں ہوئی والدین کو خیال ہوا کہ ابتدائی تعلیم یہیں ہو جائے تو اچھا ہے لیکن مکتب میں تین سال لگ گئے ایک سپارہ سے آگے نہ پڑھ سکے ان کے والد حکیم تفضل حسین نے ان کو کلکتہ مٹیا برج بلا لیا یہاں حکیم صاحب واجد علی شاہ کی ملازمت میں تھے۔ اہل علم کا بھی اچھا مجمع تھا چنانچہ شرر کی علمی نشو و نما یہیں ہوئی۔ عربی فارسی کی کافی قابلیت حاصل کر لی سنہ ۱۸۶۹ء میں شرر کو پھر لکھنؤ واپس آنا پڑا۔

لکھنؤ آ کر شرر نے اپنا علمی مشغلہ برابر جاری رکھا۔ مختلف اہل کمال سے علم حاصل کرتے رہے ۱۸۷۹ء میں حصول تعلیم کے لئے دہلی گئے۔ راستے میں سرسید سے بھی ملاقات ہوئی دہلی پہونچ کر شرر نے نہ صرف تعلیم ہی حاصل کی بلکہ تصنیف اور تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا محمد عبدالوہاب نجدی کا رسالہ توحید ترجمہ کر ڈالا

جس کے متعلق صاحب سیر المصنفین لکھتے ہیں کہ اس طریقے سے شرر نے تصنیف و تالیف کی دنیا میں پہلا قدم رکھا

دہلی سے پھر لکھنؤ واپس آئے ۱۸۸۰ء میں اودھ اخبار کی ملازمت کر لی جس میں برابر مضامین لکھتے رہے۔ شہرت میں روز بروز ترقی ہوتی رہی ۱۸۸۷ء میں شرر نے اپنا خود ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام دلگداز رکھا۔ کچھ دنوں کے بعد اس رسالے میں ناول کا بھی جزو شائع ہونے لگا چنانچہ ملک العزیز ورجنا، حسن انجلینا، منصور موہنا شائع ہوتے رہے۔ لیکن مالی کشمکش کی وجہ سے اطمینان نصیب نہ تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے حیدر آباد جانا پڑا۔ جہاں رہ کر انھوں نے اپنی تاریخ سندھ لکھنا شروع کی۔ نواب وقار الامراء نے کافی قدر دانی کی اور اپنے بیٹے کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں شرر کو انگلستان بھیج دیا۔ تین سال تک قیام رہا اور وہیں فرانسیسی زبان حاصل کی واپس آکر حیدر آباد گئے اور دلگداز کو اس بار وہیں سے جاری کیا۔ یہاں اور کتابوں کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی حضرت سکینہ کی سوانح عمری لکھنا شروع کی۔ چونکہ ان کے حالات عام خیالات کے خلاف تھے اس لئے مسلمانوں میں برہمی پیدا ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ شرر کو حیدر آباد سے لکھنؤ چلا آنا پڑا مگر حیدر آباد کا آنا جانا کچھ دنوں کے بعد پھر شروع ہو گیا لیکن فضا موافق نہ تھی آخر ۱۹۰۹ء میں نظام کے حکم سے عزیز مرزا ظفر علی خاں صفی الدین اور شرر چاروں آدمی سلطنت نظام سے ہمیشہ کے لئے باہر کر دیے گئے۔ شرر کا انتقال ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ میں ہوا۔

شرر اور ناول نویسی۔ شرر نے اسلامی تاریخ کی طرف زیادہ توجہ کی اور ناول نگاری کے فن کو اردو میں ترقی دینے کی کامیاب کوشش کی۔ کیرکٹر و پلاٹ کو اردو ناول سے زیادہ اچھا سنبھالا انھوں نے اس فن میں متانت اور سنجیدگی قائم کر کے ابتدال

اور ہریرہ گوئی سے ناول نگاری کو سجایا۔ اسلامی تاریخ عربی اور فارسی میں ہونے کی وجہ
سے مسلمانوں کو بھول جاتی تھی شرر نے اس سرمایہ کو ناولوں کی وجہ سے پھر دنیا کے
سامنے زندہ کر کے پیش کیا جس کی وجہ سے اسلاف کے کارنامے نظروں کے سامنے
آگئے دلوں میں ایک جوش پیدا ہوگیا یہی نہیں بلکہ انھوں نے پورے عقیدے کے
ساتھ خاص خاص اسلامی مقام اور اشخاص کو نہایت بلند کر کے دکھایا جس کی وجہ سے
ان کا نام اردو کے اور ناول نگاروں سے زیادہ بلند نظر آتا ہے

ان کا طرز بیان شگفتہ اور رواں ہے۔ مگر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بے ساختگی
ہے تخئیل میں بھی گہرائی کم ہے۔ اگر ان کے اشخاص قصہ پر نظر ڈالیے تو حکیم محمد علی خاں
کی طرح ان کا ہر ناول ایک مختلف المزاج اور اصلی کردار نہیں پیش کرتا بلکہ ہر ایک
کردار میں یکسانیت ہوتی ہے ملک العزیز ورجنا اور منصور موہنا میں بہت کم فرق ہے اسی طرح
ورجنا اور موہنا میں بھی نام ہی کا فرق نظر آتا ہے۔ منظر نگاری میں ان کا قلم مصورانہ
رنگ آمیزی ضرور کرتا ہے لیکن شاعرانہ تشبیہات اور استعاروں کی بھرمار سے تاثیر میں
کمی پیدا ہو جاتی ہے۔

بایں ہمہ ان تمام باتوں کے دلچسپی اور دلکشی کی بنا پر جو پایہ اردو ناول نویسی
میں شرر کو حاصل ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں۔ ان کے بعض مشہور ناول مثلاً فردوس
بریں ملک العزیز ورجنا فلورا فلورنڈا حسن کا ڈاکو اتنے دلچسپ ہیں کہ شروع سے
آخر تک ختم کئے ہوئے کتاب ہاتھ سے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

ناولوں کے علاوہ شرر نے کثرت سے مختلف موضوعات پر متعدد مضامین
لکھے ہیں جو مختلف مجموعوں کی صورت میں چھپ گئے ہیں ان کے دیکھنے سے شرر
کی معلومات کی قدر ہوتی ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ ایسے ادیب اس زمانے میں
کیوں نہیں پیدا ہوتے

سجاد حسین

ایک[1] خوشحال اور عالی خاندان سے تھے۔ سجاد حسین کے والد منشی منصور علی عہدۂ ڈپٹی کلکٹری پر مامور تھے اور بعد پنشن کے ایک عرصہ تک حیدرآباد میں سول جج رہے۔ سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں مقام کاکوری پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور کچھ دنوں تک کیننگ کالج لکھنؤ میں ایف اے کی تعلیم بھی پائی لیکن طبیعت انگریزی سے ہٹ گئی اور ایف اے کے امتحان میں شریک نہ ہوئے۔ کالج چھوڑ کر تلاش معاش میں فیض آباد پہنچے اور وہاں فوج میں اردو پڑھانے پر منشی مقرر ہوئے لیکن طبیعت کو اس شغل سے کیا مناسبت ہو سکتی تھی۔ سال بھر کے اندر ہی اس کو خیرباد کہہ کر اودھ پنچ کے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کی [ایڈیٹری] منشی صاحب نے اودھ پنچ کے لئے پہلے ہی سال میں ایسے ایسے سحر البیان جادو رقم نامہ نگار ڈھونڈ نکالے جو اردو علم و ادب کے آسمان پر چاند سورج ہو کر چمکے۔ ان میں سے پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد خان آزاد، سید اکبر حسین اکبر، منشی احمد علی شوق، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی کسمنڈوی کے نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار [اول] دو سال تک اپنے قلم سے اودھ پنچ کو سرفراز کرتے رہے۔

سجاد حسین ۱۸۸۷ء میں کانگریس میں شریک ہوئے اور مرتے دم تک اس کے حامی رہے۔ ۱۹۱۰ء میں پہلی مرتبہ فالج گرا لیکن چند ماہ بیمار رہ کر اچھے ہو گئے۔ ۱۹۱۴ء میں فالج کا دوسرا دورہ ہوا اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء کو انتقال ہو گیا۔

منشی سجاد حسین اردو اخبار نویسی میں طرز مذاق و ظرافت [کے موجد اور لکھنؤ کی]

---

[1] ماخوذ از گلدستۂ پنچ

زباں ہیں اپنے رنگ کے استاد تھے۔ اودھ پنچ کے ذریعے سے جو خدمات اردو لٹریچر کی انجام دیں اور جو قابل قدر اضافہ اس زباں میں ان کی کوششوں کی بدولت ہوا اس قابل نہیں کہ آسانی سے بھلا دیا جائے۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ نے اپنا دامن شہرت، مذہبی تعصب سے خواہ پالی ٹیکس ہو یا لٹریچر ہمیشہ پاک صاف رکھا اور آزادی و ایمانداری کو کبھی بھولے سے بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

ان کی تحریر میں سب سے پہلی چیز جو نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ بے باکی اور آزادیٔ خیال ہے۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے نہایت کھلے لفظوں میں بے رو رعایت بیاں کر جاتے ہیں۔ اپنا مفہوم واضح کرنے کے لئے کبھی کبھی عامیانہ لفظ استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ وہ ہر جگہ کوشش کرتے ہیں کہ روزمرہ اور بول چال کا لطف قائم رہ جائے۔ عبارت میں کبھی کبھی مولویانہ انداز بھی پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے باوجود ان کی شگفتہ مزاجی کے بھی کسی قدر خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر طبیعت کی شوخی اور بذلہ سنجی کی لہر کلام میں عموماً نمایاں رہتی ہے جو مشکل سے اس عیب کو ابھرنے دیتی ہے۔

منشی سجاد حسین کا ایک خاص جوہر تشبیہہ و استعارے کے صرف میں نظر آتا ہے اپنی جانب پسند طبیعت سے وہ موقع دیکھ کر نہایت ظرافت آمیز طریقے پر تشبیہہ اور استعارے کام میں لاتے ہیں جس سے دلچسپی میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کی جدت پسندی کا اندازہ کرنے کا ہم کو کافی موقع ملتا ہے۔ اور غالباً ایسے مقامات پر ان کا انتہب طبع مذاق لطیف کی بہترین کارگذاری دکھا سکتا ہے

جس طرح ذوق شاعری میں ضرب المثل کے استعمال کرنے میں ضرب المثل ہیں اسی طرح منشی سجاد حسین نثر کے میداں میں ضرب الامثال سے اپنی عبارت کو سجانے میں مشہور ہیں۔ وہ تمثیلات کے برمحل صرف سے معنویت میں بہت کچھ

اضافہ کر لیتے ہیں۔
منشی سجاد حسین نے نہایت قابلیت کے ساتھ اردو ناول نویسی کے نقائص دور کرنے کی کوشش کی مثلاً ان سے پہلے اردو کی ناولیں ظرافت کی چاشنی سے محروم رکھی جاتی تھیں۔ انھوں نے اس کمی کو نہایت خوبی سے پورا کرنے کی کوشش کی کردار نگاری میں ارتقا رکھی اردو ناولوں میں بہت کم نظر آتا تھا انھوں نے اس عیب کو بھی دور کرنے کی ایک حد تک کامیاب کوشش کی۔ علاوہ اور ناولوں کے ان کا ناول "حاجی بغلول" ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر وہ بجا طور پر ناز کر سکتے تھے "حاجی بغلول" ایسا کردار ہے جو سرشار کے فسانہ آزاد کی طرح نہایت ہر دلعزیز اور ہمیشہ زندہ رہنے والا معلوم ہوتا ہے

رُسوا

مرزا محمد ہادی نام اور رُسوا تخلص تھا آغا محمد تقی کے بیٹے تھے۔ ان کے اسلاف مازندران سے دلی آئے اور وہاں سے اودھ میں سکونت اختیار کی۔ ان کی ولادت لکھنؤ میں ۱۸۵۸ء میں ہوئی بچپن میں لاڈ پیار سے پرورش پائی لیکن سولہ برس کی عمر میں والدین کا سایہ ایک ہی سال میں سر سے اُٹھ گیا۔ رشتے کے ایک ماموں نے ان کی پرورش کی جن کی لالچ پسند طبیعت نے یتیم بھانجے کے ترکہ پر بھی مخالفانہ قبضہ جائز سمجھا۔

مرزا کو اپنے والدین سے ترکہ میں علم ریاضی اور نجوم کا شوق ملا تھا جس کی تکمیل انھوں نے آگے چل کر کی۔ فارسی کی تمام درسیات، ریاضی اور اقلیدس تھا نجوم کے رسائل اپنے والد سے پڑھے پھر مولویوں سے عربی پڑھی بعد میں انگریزی

پڑھنا شروع کیا اور انٹرنس کا پرائیویٹ امتحان پاس کیا پھر رڑکی سے اوورسیری کا
امتحان پاس کیا اور کوئٹہ اور بلوچستان کے ریلوے میں ملازم ہو گئے اس علم دوست
طبیعت کو ریل کی پٹریوں سے کیا مناسبت، ایک دن اتفاق سے کمسٹری کا ایک
عربی رسالہ مل گیا۔ اس کو پڑھتے ہی اس مضمون سے کچھ ایسی محبت پیدا ہو گئی کہ فوراً
نوکری سے استعفیٰ دیدیا۔ کوٹھی کا تمام سامان نیلام کر کے اس سے کمسٹری کے آلات
ولایت سے منگوا کر سیدھے لکھنؤ چلے آئے دنیا میں علم کے ایسے دلدادہ مشکل سے ملیں گے
علم کے اسی ذوق نے ان کی طبیعت کو ہر شے سے بے نیاز کر دیا تھا نہ کسی
کی مدت گزاری، نہ روپیہ کی ہوس کرسچن اسکول میں فارسی کے مدرس ہو گئے تھے
اور وہ بھی اس لئے کہ پنجاب یونیورسٹی سے منشی عالم کا امتحان پاس کر چکے تھے لیکن
کیمیا سازی کے مصارف کے لئے یہ تنخواہ کیونکر کافی ہو سکتی تھی آخر ایک لوہار کے لڑکے
کو پڑھانے پر اس شرط سے ٹیوشن کیا کہ کام ختم ہونے کے بعد بھٹی بند ہونے پر مرزا
صاحب کے تصرف میں رہے۔

مرزا صاحب نے اعلیٰ تعلیم کے درجے بھی گھر بیٹھے طے کر لئے پہلے پنجاب یونیورسٹی
سے بی اے کا پرائیویٹ امتحان دیا۔ پھر امریکہ کی اورینٹل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی
کی ڈگری بھی حاصل کی۔

ان کو علم کا جس قدر شوق تھا طبیعت میں اسی قدر قبول عام کی صلاحیت
موجود تھی عربی، عبرانی، یونانی، انگریزی، فارسی، ہندی، سنسکرت، زبانوں پر
اچھا خاصا عبور تھا۔ مشرقی و مغربی علوم پر حاوی تھے منطق و فلسفہ، ریاضی اور ہندسہ
کے ماہر تھے

مرزا ایک ایسی غیور طبیعت کے مالک تھے جو رزق و روزی کے لئے بھی کسی کے
سامنے دست سوال پھیلانا گوارا نہ کرتے نہ کسی سے مدد کے طالب ہوتے تھے

نہ عمر بھر کسی کے زیر بار احسان ہوئے اسی لئے طبیعت میں استقلال اور جفاکشی کی عادات
پیدا ہو گئی تھیں انھیں اپنے کام سے کام تھا نہ دنیا اور سامان دنیا سے تعلق نہ زینت و آرائش
سے مطلب ان کے بیٹھنے کے کمرے میں ایک چٹائی بچھی رہتی کونے میں کتابوں کا ڈھیر لگا رہتا
وہ بھی بے ترتیب کاغذات بکھرے رہتے لحاف کہیں پڑا رہتا اور توشک کہیں ایک
انگیٹھی رکھی رہتی اور حقہ یہیں اہل دنیا سے بے نیاز مرزا مشاغل علمی میں مصروف رہتے
رسوا کا انتقال ۱۲/ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ہوا۔

اگرچہ رسوا شاعر بھی تھے اور ادیب بھی لیکن ان کے منظوم کلام کا شیرازہ ایسا
پریشان ہوا کہ آج ان کی قدر زیادہ تر بہ حیثیت ایک نثر نگار کے ہے حالانکہ مرزا کی
شاعری میں بھی وہی سلاست، ندرت اور زبان کا لطف موجود ہے جس کی جھلک ان کی
نثر نگاری میں پائی جاتی ہے یہاں وہ بحیثیت ایک نثر نگار کے پیش کئے جاتے ہیں
رسوا کی کامیابی کا راز زیادہ تر ان کی شیریں سانی میں مضمر ہے عبارت کا عام
انداز رقم کچھ ایسا ہے کہ تحریر میں بات چیت کا لطف پیدا ہو جاتا ہے پھر لکھنؤ کی ستھری
زبان اور وہاں کے مخصوص روزمرہ پر جو قدرت مرزا رسوا کو حاصل تھی وہ آپ اپنی
مثال ہے ان کے سادہ طرز تحریر میں وہی دلکشی ہے جو آزاد کے پرلطف انداز بیان
میں لیکن مرزا کے کلام کی خاص خصوصیت اسلوب بیان کی نرمی ہے جو ہر موقعہ کی مناسبت
سے کہیں لطف و شیرینی تو کہیں طنزیہ و مزاحیہ ہو کر اپنا کام کر جاتی ہے۔ ان کے طرز
تحریر میں کچھ ایسی روانی، شگفتگی اور لوچ ہے کہ ایک خاص مزہ پیدا ہو جاتا ہے
زبان کی یہی گھلاوٹ دلوں میں سمو کر اتر جاتی ہے

مرزا کے مطبوعہ کلام میں زیادہ تر ناولیں ہی ملتی ہیں انھیں میں زور طبع اور
زور قلم صرف کیا ہے جو اخلاقی، معاشرتی اور نفسی حیثیت سے قابل قدر ہیں مرزا نے
نہ صرف ناول نویسی کو ترقی دی بلکہ اصولوں سے بھی لوگوں کو آگاہ کر دیا۔

اس وقت تک اردو کے ناول نگاروں میں شرر، حکیم محمد علی اور سرشار ہی خاص طور سے مشہور تھے۔ رسوا نے ناول نویسی کو اس قدر ابھارا کہ اپنے ناولوں کو اپنے زمانہ کا مرقع بنا دیا۔ رسوا کا منشا گویا افسانہ نویسی سے نظام معاشرت کی فراہمی تھا جہاں اصلیت کو مدنظر رکھنا فرض تھا۔ وہ اصل حقیقت سے دور ہو جانا ایک غلطی خیال کرتے تھے اور فطرت کی پابندی اس لئے ضروری سمجھتے کہ ان سے بہتر مثالیں ہم کو نہیں مل سکتیں۔ مرزا نے اپنے ناولوں کے متعلق "ذات شریف" کے حاشیہ پر خود لکھا ہے

"ہمارے ناول نہ ٹریجڈی ہیں نہ کامیڈی۔ نہ ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوتے ہیں اور نہ ان میں سے کسی نے خودکشی کی ہے۔ نہ ہجر ہوا ہے نہ وصل۔ ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہیئے"

مرزا کے ناولوں کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ان کے اکثر ناولوں کا موقع واردات خود ان کا وطن لکھنؤ ہے کیونکہ وہ تخیل کی وسعت سے کام لے کر خیالی شہروں کے نقشے پیش کرنا اصلیت اور حقیقت کے منافی خیال کرتے تھے پھر اگلے پچھلے واقعات میں غلط مبحث کر کے ایک ہی چیز پیدا کر دینا جو نہ اس زمانہ کے مطابق ہو، نہ اس زمانہ کے موافق مرزا کے نزدیک اصول فن کے خلاف تھا

۲۔ ان کے کردار افسانہ دراصل لکھنؤ یا قرب و جوار کے لوگ ہیں یہاں بھی وہی اصول پیش نظر ہے کہ حقیقت سے بعد نہ ہونے پائے یہاں تک کہ وہ اپنا ذاتی کردار، اپنی برائیاں اور اچھائیاں بیان کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔

۳۔ مرزا اپنے پلاٹ اکثر روزمرہ کی زندگی سے لیتے ہیں جہاں بے بنیاد باتوں کو دخل نہیں۔ اور پھر واقعات کو اس طرح بیان کرتے کہ اصل مقصد بھی حاصل

ہو جائے اور ناول کی دلچسپی بھی قائم رہے۔

۴۔ مرزا رسوا کو فطرتِ انسانی کے گہرے مطالعہ نے ایک ماہرِ فن بنا دیا تھا۔ ایک طرف اصولِ نفسیات سے دلچسپی دوسری جانب روزمرہ کے واقعات کو کسی صحیح روشنی میں دیکھنا ایسی خوبیاں تھیں کہ مرزا نے ناول کو زندگی کے اتفاقات، عروج و زوال، برائی اور بھلائی کا آئینہ بنا دیا۔

۵ مرزا رسوا نے اپنے ہر ناول میں مختلف واقعات کی فراہمی کی ہے نادرشاہوں کی زندگی سے لے کر ادنیٰ طوائف کی زندگی کے صحیح نقشے پیش کئے ہیں ایک طرف ان کے یہاں علمی مشاعروں کے مرقعے ہیں تو دوسری طرف میلے ٹھیلے کے حالات، لوٹ دو کی حماقتیں اور اہلِ دربار کی چالاکیاں۔

۶ مرزا رسوا نے اکثر نیچرل مناظر کو بھی اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے وہ ہر جگہ کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں اور اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان جذبات سے جو خود اس ناول میں مرزا نے محسوس کئے تھے پڑھنے والے بھی پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔

ان ناولوں کے علاوہ مرزا کی نثر کے وہ دیباچے خاص طور سے قابل قدر ہیں جو انھوں نے کسی علمی کارنامے کی وضاحت کے لئے لکھ دئے ہیں ان تحریروں سے وسیع النظری اور اصلاحِ فن کی کوششیں ظاہر ہوتی ہیں۔

ان کے ناولوں کو دیکھ کر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جن چیزوں نے مرزا رسوا کی عظمت میں اضافہ کیا اور ان کی تصانیف میں لطف پیدا کیا ہے وہ دراصل دو چیزیں تھیں

۱۔ حیاتِ انسانی کا صحیح مطالعہ

۲ اور مرزا کا مخصوص طرزِ تحریر

راشد الخیری

ظفر علی خاں راشد الخیری کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ
"ہم میں سے کسی شخص کے اٹھ جانے سے جو جگہ خالی ہو جاتی ہے وہ اکثر خالی ہی رہتی ہے
لیکن یہ کلیہ کم از کم مصنف مراۃ العروس کی جانشینی کے متعلق مولانا راشد الخیری کے گہر بار قلم
نے متعدد لطیف و پاکیزہ تصانیف کے سلسلے سے باطل کر دیا" ڈاکٹر نذیر احمد کی طرح
راشد الخیری بھی عورتوں کی اصلاح و ترقی کے حامی ہیں۔ ان کے تمام افسانے اور
ناول دیکھنے کے بعد یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صنفِ نازک کی تمام کمزوریوں اور
خوبیوں کا مطالعہ نہایت دلچسپی سے کیا اور اسی کو اپنی تحریر کا موضوع بنالیا وہ
نہایت ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ رسم و رواج پر تنقید کرتے ہیں اور ان کی
تمام برائیوں کو ایک موثر پیرائے میں طشت از بام کر کے اس سے بچنے کی تلقین کرتے
ہیں۔ مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید سے روکنے کے لئے وہ ایسے بہت سے کرداروں
کو خرابیوں میں مبتلا دکھا کر تباہ و ہلاک کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایک عبرت انگیز نقشہ
نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے جس کو دیکھ کر طبیعت عرصہ تک مطمئن نہیں رہتی۔

وہ ایک بڑی حد تک قدامت پسند واقع ہوئے تھے اور نئی روشنی کی تعلیم و تربیت
کو ایک فریب سمجھ کر نہایت بے دردی سے اس کا انکشاف کرتے تھے۔ وہ تعلیم نسواں
کے حامی تھے لیکن تربیت کو عورت کی زندگی کا زیور سمجھتے تھے۔ ان کے افسانوں کے
کرداروں کی زندگی ہماری روزانہ زندگی سے ملتی جلتی ہوئی ہے اسی لئے ان کا عروج و
زوال ہمارے لئے کافی اثر رکھتا ہے۔

ایک افسانہ نگار سے زیادہ ان کی وقعت ہماری نظروں میں ایک مصلح کی حیثیت
سے ہے۔ عورت کی زندگی کی ہر منزل ایک خاردار راستہ سے ہو کر ملتی ہے انھوں نے

مختلف عنوانات سے یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح اس کی زندگی کامیاب ہو سکتی ہے اسی سلسلے میں انھوں نے بچوں کی فطرت کا مطالعہ بھی کیا ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ ان کی ذہنی نشوونما کا اندازہ کر کے قصہ کو غیر فطری ہونے سے بچا لیا ہے انھوں نے جو تاریخی افسانے اور قصے لکھے ہیں ان کا مقصد بھی اصلاح کے سوا کچھ نہیں ہے

چونکہ ان کے پیش نظر اصلاح کا مقصد رہتا ہے اور عورتیں خاص طور پر اس پیغام کی مخاطب ہوتی ہیں۔ وہ نہایت آسان اور غیر مبہم طرز تحریر اختیار کرتے ہیں مختصر جملوں سے بیان کو نہایت دلآویز بنا دیتے ہیں اور زور پیدا کرنے کے لئے کبھی کبھی مقفیٰ عبارت بھی لکھ جاتے ہیں ان کے یہاں مزاح لطیف اور مسطر نگاری کی بہت کمی ہے لیکن اس کی تلافی ان کے دلکش مکالموں سے ہو جاتی ہے ان کی تحریر میں دلّی کی زبان کا پورا لُطف حاصل ہو جاتا ہے نسوانی محاورات کے استعمال سے رنگینی پیدا کر دینا ان کے لئے کوئی بات نہیں لیکن کبھی کبھی ان کی زیادتی اُلجھن کا باعث ہو جاتی ہے

راشد الخیری فطری طور پر حزن و ملال کے دلدادہ تھے ان کا ہر افسانہ بیکسی کا مرقع اور یاس کی تصویر ہے موت اور ہلاکت کے مناظر، بیماری اور تکالیف کے نقشے یوں پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا باوجود اس احساس کے کہ صرف قصہ ہے بے چین ہو جاتا ہے غم و الم کی شدت جس کو بیان کرتے ہوئے زبان رکتی ہے ان کے قلم سے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہو جاتی ہے اسی رجحان کی وجہ سے راشد الخیری کے نام کے ساتھ "مصورِ غم" کا لقب بہت زیب دیتا ہے

وہ اُردو کے ان چند خوش قسمت مصنفوں میں تھے جن کی کتابیں کثیر التعداد ہونے کے ساتھ ہی قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہیں، بار بار چھپتی ہیں اور ریکٹ جاتی

ہیں آپ کی تصانیف کی تعداد تیس سے کم نہیں جن میں سے چند مشہور یہ ہیں سمرنا
کا چاند، صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی، ماہ عجم، محبوبۂ خداوند وغیرہ
طبقۂ نسواں کی اصلاح اور بہبودی آپ نے ساری عمر مد نظر رکھی۔ اور
اسی مقصد کے پیش نظر آپ نے "عصمت" اور "بنات" دو ماہانہ رسالے بھی جاری
کئے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں ان کے انتقال کے بعد بھی "عصمت" برابر کامیابی سے چل رہا ہے۔

اردو میں ناول نویسی کا سلسلہ برابر بڑھتا رہا متعدد اہل قلم نے ناولیں لکھیں
چند مخصوص حضرات جو اس صف میں نمایاں شہرت حاصل کر سکے ہیں وہ عصمت چغتائی
ضیا حسن علی، رشید اختر ندوی، قیسی رامپوری، رئیس احمد جعفری، عادل رشید، محبوب
طرزی وغیرہ ہیں ان سب کی تصانیف سیکڑوں کی تعداد تک پہنچتی ہیں لیکن جس لحاظ
سے جو اقتدار پریم چند، کرشن چندر، عزیز احمد، عصمت چغتائی کو حاصل ہے وہ
کسی کو کم نصیب ہوا ان میں سے بعض حضرات کا تذکرہ چونکہ دوسرے عنوانات
میں آچکا ہے اس لئے یہاں زیادہ لکھنا بیکار ہے مثلاً پریم چند کا ذکر مختصر افسانہ
کے ذیل میں رہے گا ہاں پریم چند کی ناول نویسی کے سلسلے میں اتنا ضرور عرض کرنا
ہے کہ انھوں نے فن پر زیادہ زور دیا۔ اردو ناولوں کو اصول فن سے آگاہ کرنے
کی فکر کی ان کی ابتدائی ناولوں میں پلاٹ کی خامیاں پائی جاتی ہیں لیکن رفتہ
رفتہ یہ خامی دور ہو گئی اور ان کا آخری ناول "گئو دان" فن کا بہترین نمونہ ثابت ہوا

مختصر افسانہ

قریب قریب دنیا کی ہر زبان میں افسانوں کی ابتدا ما فوق الفطرت عنصر سے ہوئی مصر و یونان، انگلستان سبھوں نے ابتدا میں مبالغہ آمیز قصوں سے قوم و ملک کے دلوں کو مسحور کرنے کی تدبیر کی ہندوستان والے بھی اس راستے سے الگ نہ چل سکے ان کے یہاں بھی مہابھارت میں اسی قسم کی باتیں آگئیں ناممکن تھا کہ اردو اس فضا سے الگ رہتی چنانچہ ابتدا میں یہاں بھی داستان امیر حمزہ، بوستان خیال، فسانہ عجائب وغیرہ ایسی کتابیں لکھی گئیں جن میں قصوں کی بنیاد زیادہ تر غیر فطری باتوں پر قائم ہوئی۔

اردو میں افسانوی ادب کا دوسرا دور غدر سے ذرا بعد میں شروع ہوا جس کی ابتدا میں فطری اور غیر فطری عنصر کو ایک جگہ خوبصورتی سے اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس لحاظ سے رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد قابل ذکر ہے مگر رفتہ رفتہ غیر فطری عنصر کم ہوتا گیا یہاں تک کہ حقیقتوں کا خیال کر کے ناول لکھے جانے لگے ناول کا دور دورہ کم و بیش پچاس سال تک رہا۔ نذیر احمد

اور رتن ناتھ سرشار نے طبع زاد ناولوں کی ابتدا کی اور شرر سے رسوا کے زمانہ تک
آتے آتے ناول کی رفتار بڑھ کر دفعتاً کم ہوگئی پریم چند اور فیاض علی کے علاوہ اور
بھی کچھ لوگ عمدہ ناولیں اب تک اردو ادب میں پیش کر رہے تھے۔ درمیان میں
ایک ایسا دور بھی آیا جس میں ناول نویسی کی اردو میں رفتار بہت سست ہوگئی
اس کی جگہ مختصر افسانوں نے لے لی تھی۔ مگر اب ادھر حال میں پھر ناول کی رفتار
بہت تیز ہوگئی؛ اچھے بڑے ناولوں کا ایک ذخیرہ ہوگیا ہے

ناول کی طرح مختصر افسانہ کے لئے بھی اردو ادب زیادہ تر انگریزی ادب کا
رہین منت ہے گو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کے قدیم افسانوں میں اور بوڑھی
عورتوں کی ان کہانیوں میں جو بچوں کو سوتے وقت سنایا کرتی تھیں بعض اجزا
ایسے بھی مل سکتے ہیں جو موجودہ افسانوں کی بنیاد قرار دیا سکیں لیکن حقیقت یہ ہے
کہ موجودہ مجموعی خصوصیات ان افسانوں میں اسی وقت پیدا ہوسکیں جب انگریزی
ادب سے آبیاری کی گئی۔ اس سے پیشتر نہ تو کسی افسانے کے اجزا اور نہ کہانیاں
خود مختصر افسانے کی ضمن میں بالالتزام کے شمار کیے جانے کی مستحق تھیں۔ ان افسانوں
کا سرچشمہ انگریزی ادب وثوق کے ساتھ اس لئے بھی ٹھہرایا جاسکتا ہے کہ اردو میں
پہلے انگریزی افسانوں کے ترجمے شائع ہوئے اور اب بھی ترجمے یا تلخیص کا محور
انگریزی ادب ہے اور اسی کی دیکھا دیکھی ترکی، روسی اور فرانسیسی زبانوں کے
مختصر افسانے اردو میں آگئے ہیں

اردو میں مختصر افسانوں کی عمر اگلی شکل سے پچاس سال کی ہوگی مگر جو تعمیری
اور خوبیاں اس قلیل مدت میں اس نے حاصل کرلی ہیں وہ ہر طرح قابل ستائش
ہیں جو کچھ خامیاں رہ گئی ہیں وہ بھی غالباً بہت جلد دور ہوجائیں گی اس لئے کہ
عام افسانہ لکھنے والوں کا رجحان جس افسانہ نویسی کی طرف کافی ہو چلا ہے اس بات

میں ہم نے زیادہ تر مختصر افسانہ نویسوں ہی کو جگہ دی ہے

پریم چند

جس طرح میر دنیائے غزل میں اسی طرح پریم چند دنیائے افسانہ میں ابھی تک یگانہ روزگار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی ہر دلعزیزی کا دائرہ صرف اردو ہی کی دنیا تک محدود نہیں بلکہ ہندی والے بھی اتنی ہی عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جتنی کہ اردو والے۔ غالباً افسانہ لکھتے وقت پریم چند کہتے ہوں گے ع

ہاتھ چومیں گے مرے گبر و مسلماں دونوں

پریم چند کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے کبھی ایک لمحہ کے لئے یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ ہم ان لوگوں کے حرکات و سکنات کا مطالعہ کر رہے ہیں جو ہم میں سے نہیں ہیں۔ وہی روزمرہ کی زندگی وہی صبح و شام جس سے ہم کو روز دوچار ہونا پڑتا ہے، ان کے افسانوں کے دلچسپ مواد ہیں جس عام زندگی کو ہم خشک اور اتنی سادی سمجھتے ہیں کہ دلکشی کا شاید کوئی عنصر نہ ہو اسی کو پریم چند اپنے انداز بیاں سے بغیر تصنع کے اتنی پرلطف بنا کر افسانے میں دکھا دیتے ہیں کہ سراپا دلکش ہو جاتی ہے

ان کے افسانوں کا محور دیہات ہیں۔ وہاں کے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی سیرت، سچائی اور ایمانداری اور کبھی کبھی شخصوں کی بے ایمانی، چالاکی، فتنہ پردازی کا نقشہ پریم چند کے افسانوں کی جان و مال ہے۔ دیہات والوں کی عام زندگی کا مرقع دیکھنا ہو تو ان افسانوں کو دیکھئے جن میں لوگوں کی بیچارگی کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ غریب کاشتکاروں کو کبھی پولیس، کبھی زمیندار، کبھی تحصیل کے عملے، کبھی قحط سے ایسا سابقہ رہتا ہے کہ آرام سے بیٹھنا بھی نصیب نہیں۔ ان واقعات کو

ایسے دردناک پیرائے میں پریم چند نے بیان کیا ہے کہ پڑھ کر دل بھر آتا ہے پھر اسی
کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ دیہاتیوں کی جہالت نے انھیں کس قدر پریشان
کر رکھا ہے۔ کہیں جہالت کا ڈر ہے کہیں توہم پرستی کا جس سے ان کی زندگی اور
دوبھر ہوگئی ہے مگر وہ لوگ باوجود ان باتوں کے اپنے پرانے عقائد پر شاکر ہیں۔

ہر چیز کو جیسا وہ دیکھتے ہیں ویسا ہی اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کامیاب
کوشش کرتے ہیں حقیقت و اصلیت، واقعات کی بناوٹ یا رنگینی میں پوشیدہ نہیں
ہونے پاتی۔ روئداد قصہ کو پریم چند اسی روپ میں رہنے دیتے ہیں جو اس کی واقعیت صحیح طور
پر طلب کرتی ہے اپنی طرف سے نہ تو پیچیدہ کر کے اسے دماغی کاوش کا جولانگاہ بناتے
ہیں اور نہ کاٹ چھانٹ سے اس کو بے لطف ہونے دیتے ہیں بلکہ ایک ایسی حد کے
اندر پلاٹ کو رکھتے ہیں کہ سادگی کی اصلیت کے ساتھ قصہ کی صداقت کا پورا لطف
قائم رہے۔

پریم چند کے افسانے انسانی کردار کے روشن آئینے ہیں جس مزاج کا آدمی
وہ اپنے افسانے میں لاتے ہیں اس کی افتاد طبیعت کا بالکل صحیح نقشہ دفعتہً
آپ کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ نفسیاتی امور پر موصوف کو زبردست عبور حاصل
ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت، مرد، بوڑھے، بچے، نیک نفس، بدکردار، عالم
جاہل سب کو جگہ ملی ہے۔ لیکن ہر ایک کی امتیازی خصوصیت آئینہ داری میں نظر
ہو جاتی ہے۔ اور اس امتیازی خصوصیت کو نمایاں کرنے کے لئے وہ اپنے الفاظ
کو نہیں بلکہ واقعات کے ترتیب و قرار کو اس خوبی سے کام میں لاتے ہیں کہ پوری
طرح اس جوہر کو نمایاں کر دے۔ آزمائشوں کی کسوٹی پر ہر کردار اس طرح کسا جاتا
ہے کہ اس کا اصلی رنگ صاف نظر آنے لگتا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی بیان
کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ عام طور پر وہ اپنے افسانے میں ان ہی لوگوں اور باتوں کا

ذکر کرتے ہیں جن کو کبھی انھوں نے دیکھا ہو۔

پریم چند کے افسانوں میں مکالمہ نہایت اہم بالشان خصوصیت ہے یہ کبھی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو آدمیوں کی گفتگو کتاب میں پڑھ رہے ہیں بلکہ اسی انداز بیان سے یہ چیز پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہم پس پردہ خود لوگوں کی بات چیت اپنے کان سے سن رہے ہیں اور باتوں ہی باتوں میں ہر ایک کا کردار بھی نمایاں ہوتا جاتا ہے واقعات بھی مختصر ہوتے جاتے ہیں اور جذبات کی تصویر بھی سامنے آتی جاتی ہے۔

ان کی زبان نہایت شائستہ اور رواں ہے سادگی اس کا جوہر ہے۔ یوں تو فارسی ہندی کے الفاظ عام طور سے وہ لاتے ہیں مگر اپنا مطلب نکالنے کے لئے بعض وقت ایسے ہی ہندی کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو اردو میں رائج نہیں لیکن اس خوبی سے کہ اجنبی اور نامانوس نہیں معلوم ہوتے۔

زبان کے لطف کو قائم رکھنے کے خیال میں انھوں نے عموماً دیہاتیوں کی بولی لکھنے سے احتراز کیا ہے کبھی کبھی نے تشبیہ و استعارے سے لطف اور زیادہ ہو جاتا ہے مگر جہاں کہیں مزاح کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے وہاں شگفتگی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے اور ایک لطیف ہنسی کا موقع مل جاتا ہے

پریم چند اپنے افسانوں میں ہندو سوسائٹی کے رسوم، خصائل، عقائد وغیرہ کا عموماً ذکر کیا کرتے ہیں چونکہ ان چیزوں سے فطری طور پر ان کو لگاؤ اور واقفیت ہے اس لئے نہایت شد و مد کے ساتھ ان کے متعلق رائے زنی کرتے ہیں علاوہ ازیں مقاصد کے پریم چند کا ایک مقصد ہندوؤں کی کھوئی ہوئی عظمت کا دوبارہ زندہ کرنا بھی ہے۔

وہ اپنے مختلف افسانوں میں ان کے اسلاف کے کارنامے بیان کر کے بتانا چاہتے ہیں کہ تم پہلے کیا تھے اور اب کیا ہو گئے راجپوتوں کی شجاعت کا آپ اکثر

ذکر پائیں گے۔ ایسے موقعوں پر بعض وقت حقیقت کے ساتھ سفریت بھی وہ اپنے افسانوں میں شامل کر دیتے ہیں اس طرح پر دلچسپی اور جوش ضرور زیادہ ہو جاتا ہے لیکن اس انداز میں سفریت حقیقت پر غالب نظر آتی ہے

اپنی زندگی کے آخری دور میں پریم چند کے خیالات اور اس کے ساتھ ان کے آرٹ میں ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے افسانوں میں حقیقت نگاری کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ سماج کا مطالعہ زیادہ گہرا اور سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ ادب کے ترقی پسند مسلک سے وہ اپنے کو وابستہ کر دیتے ہیں، ہندوستانی پس منظر کو قائم رکھتے ہوئے ان کے افسانوں اور ناولوں میں ہمہ گیری بڑھ جاتی ہے۔ یہ تمام خصوصیات ان کے افسانہ "کفن" میں بہ یک وقت مرکوز ہو گئی ہیں لہٰذا اس کو ہم پریم چند کا شاہکار کہہ سکتے ہیں اور غالباً اسی لئے یہ اتنا پسند کیا گیا کہ دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار ہونے لگا ہے

پریم چند کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ حالانکہ موت قبل از وقت تھی لیکن اتنی قلیل مدت میں انھوں نے اتنے اچھے اور زیادہ افسانے و ناولیں دنیا کے سامنے پیش کر دئے ہیں کہ اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ باقی رہے گا

سُدرشن

پنڈت بدری ناتھ سُدرشن اُردو کے ان چند کامیاب مختصر افسانہ نویسوں میں ہیں جو پریم چند کی طرح کامیابی کے ساتھ دنیائے افسانہ میں شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں۔ اپنے افسانوں کی دلکشی اور طرز بیان کی خوبی کی وجہ سے عرصہ ہوا وہ قبول عام کا شرف حاصل کر کے خاموش ہو گئے۔

سب سے پہلی چیز جو سدرشن کے افسانوں کو طلسم تاثیر بنا دیتی ہے۔ وہ روداد قصہ ہے واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ ہر قدم پر اشتیاق بڑھتا جاتا کہ اب اس کے بعد دیکھئے کیا ہوتا ہے اور یہ خصوصیت روداد کی پیچیدگی سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ واقعہ یا ماجرا کا انتخاب اتنا دلچسپ ہوتا ہے کہ باوجود سادہ ہونے کے بھی دلوں پر ہر وقت ان کا قبضہ رہتا ہے

سُدرشن کے افسانوں کی دوسری نمایاں خوبی سادگی ہے۔ زبان میں بھی سادگی بیان میں بھی سادگی اور خیال میں بھی سادگی۔ زبان کی سادگی کبھی خشکی کی وجہ سے بے کیف نہیں ہونے پاتی۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے عام فہم الفاظ کو اس حسن سے ترتیب دیتے ہیں کہ نرمی اور اس کے ساتھ تاثیر عبارت میں خود بخود آجاتی ہے اسلوب بیان نہایت سیدھا اور سلیس ہے تشبیہات میں لطافت ہے خاص بات یہ ہے کہ تشبیہیں زیادہ تر ہندوستانی ہوتی ہیں۔

جذبات کے اثر کو الفاظ میں پوری طرح بیان کر دینا سُدرشن کا ایک خاص کارنامہ ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نفسیاتی امور سے خاص دلچسپی ہے غمناک واقعات یا مناظر کو معمولی الفاظ سے دردناک بنا دیتے ہیں شاید وہ کبھی بڑے اور ہیبتناک الفاظ ایسے موقع پر استعمال نہیں کرتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تیر غم جگر کے پار نہیں ہوتا بلکہ "نیم کش" ہو کر عرصۂ دراز تک دل میں چٹکیاں لیا کرتا ہے

سدرشن نے اپنے افسانوں کا سرچشمہ ایک ہی جگہ نہیں رکھا۔ وہ کبھی دیہات کی زندگی اور واقعات بیان کرتے ہیں تو کبھی شہر والوں کی حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں عموماً غریبوں اور دولتمندوں کی زندگی کا موازنہ ان کے افسانوں کا ماحصل ہوتا ہے جہاں وہ دکھاتے ہیں کہ امیروں کو باوجود دولت کے قناعت و سکون نصیب

نہیں اور غریبوں کو افلاس کی حالت میں بھی طمانیت اور محبت کی لازوال دولت حاصل ہے۔

سدرشن کے افسانوں کی ایک اور نمایاں خصوصیت ان کی کردار نگاری ہے۔ ان کے افسانوں کے اکثر کردار ہماری زندگی کے افراد سے بالکل مطابق ہیں خصوصاً اوسط درجے کی سوسائٹی کے لوگوں کے کرداروں کو وہ بے حد فطری انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان میں جا بجا تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں لیکن پڑھنے والا یہ نہیں محسوس کرتا کہ یہ تبدیلی بغیر کسی خاص وجہ کے پیدا ہو گئی۔

سجّاد حیدر یلدرم

جن لوگوں نے کامیابی کے ساتھ اردو میں دوسری زبان کے افسانوں کو ترجمہ کر کے اس ادب کو گراں بہا بنانے کی کوشش کی ہے، ان کی فہرست میں سجّاد حیدر کا نام زریں الفاظ سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس سلسلے کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اردو میں ترکی افسانوں کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ ترکی تخیل کو اردو کے پیرائے میں اس طرح منتقل کیا ہے کہ ترجمہ میں اصل کی شان آ گئی ہے۔ ترکی طرز معاشرت و حسن ادا کو اردو کی دنیا میں مانوس ہونے کے لئے آپ نے اکثر اردو کی ترکیبوں میں اجتہاد سے کام لیا ہے اور خوبی کی بات یہ ہے کہ بیشتر مقامات پران کو ایسی اثر پذیر کامیابی ہوئی ہے کہ اس خدمت کو اردو ادب میں ایک اضافہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا مگر کبھی کبھی ایسے لطیف جذبات کو بیان کرنے کے لئے ایسی ایسی ترکیبیں اور الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو سننے والے کو غیر مانوس معلوم ہوتے ہیں

ترکی ترجموں کی کثرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سجاد حیدر صاحب کے طبع زاد افسانوں میں بھی ترکی افسانوں کی روایت جابجا نظر آنے لگی۔ آپ کے ترجموں میں وہ برجستگی اور ندرت ہوتی ہے کہ وہ بذات خود ایک تصنیف کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے یا کسی کے ذاتی تخیل کا نتیجہ۔ ایک تو الفاظ کا انتخاب عمدہ اور پھر ان کو نہایت موزوں جگہ سے ترتیب دینا یہ موصوف کا وہ کرشمہ ہے جو ان کی نثر میں شاعری کا مزا پیدا کر دیتا ہے جہاں جہاں یہ خوبی پیدا ہو گئی ہے اس نے افسانوں کو حسنِ نگاہ اور عبارت کو فردوس گوش بنا دیا ہے۔

سجاد حیدر کے طبع زاد افسانوں میں اکثر حیات انسانی کی نفسیاتی تحلیل ہوتی ہے اور ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو حیات و جذبات انسانی کی نقاشی کشائی میں خاص ملکہ ہے جس کو ان کی افسانہ نویسی کا ایک خاص جزو سمجھنا چاہیئے وہ اپنے افسانوں میں نفسیات کی ان خشک بحثوں میں نہیں پڑتے جو ایک فلاسفر کو دنیا کا خشک ترین انسان بنا دیتا ہے سجاد حیدر کے یہاں کبھی فطرتِ انسانی کا مطالعہ اس لطیف طریقہ پر ہوتا ہے کہ دل میں ایک انبساطی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو کبھی کردار افسانہ سے وہ اٹکھیلیاں ہوتی ہیں کہ تبسم کی لہریں قہقہوں سے بدل جاتی ہیں

ان کے افسانوں کا مجموعہ خیالستان دنیائے اردو میں کافی ہر دلعزیزی حاصل کر چکا ہے جس میں کچھ افسانے تو ترکی ادب سے آئے ہیں اور کچھ انگریزی سے لیکن زیادہ تعداد طبع زاد افسانوں کی ہے۔ طبع زاد افسانوں کی خوبیوں کے اندر میں ایک جو ان کی نظر آتی ہے کبھی کبھی افسانہ، افسانہ ہو کر رہ جاتا ہے یعنی اصلیت اور واقعہ دونوں مشکوک نظر آتے ہیں بہر حال خیالستان کے محاسن اتنے ہیں کہ رمیلڈ احمد کی رائے ہے کہ "اردو زبان کی ادبیات لطف میں خیالستان سے بہتر کتاب نہیں" اس مجموعے میں ان کا ایک ناول "نہرہ"

ہے جو بہت مشہور اور قابل قدر ہے یہ ترکی قصہ کا آزاد ترجمہ ہے اور بہت عمدہ ہے۔

سلطان حیدر جوش

سلطان حیدر صاحب جوش عرصہ دراز سے دنیائے اردو میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کا مقصد اعلیٰ ہندوستانیوں کو مغرب کی کورانہ تقلید سے بچانا ہے جس کے لئے موصوف نے حکیمانہ مضامین بھی لکھے۔ ناولیں بھی لکھیں اور مختصر افسانے بھی تصنیف کئے۔ لوگوں کو طریقے سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی کبھی اکبر کی طرح مذاق میں سنجیدگی اور دوراندیشی کی دنیا سے روشناس کرانے کی فکر کی بہرحال ہر وقت اور ہر صورت میں اپنا مقصد پیش نظر رکھا اپنا تبلیغی مقصد ان کو اتنا عزیز ہے کہ افسانوں میں کبھی کبھی ناصحانہ اندازبیاں پیدا ہو جاتا ہے بجائے اس کے کہ کردار کے حرکات و سکنات اقوال سے سبق آموز نتائج نکالے جائیں وہ خود ہی بیتاب ہو کر دنیا کے لئے نیت قراردیاں کرنے لگتے ہیں ابتدائی دور میں افسانہ کی جو حالت تھی اس کے لحاظ سے قابل قدر کہے جا سکتے ہیں مگر اب اردو میں افسانہ نویسی اتنی ترقی کر گئی ہے کہ افسانہ جوش ' اور " فکر جوش " کو فن کی حیثیت سے کوئی خاص مرتبہ نہیں دیا جا سکتا جوش صاحب کے افسانوں میں کبھی کبھی ایسی تمہید ہوتی ہے جو ناولوں ہی کے لئے موزوں بھی مختصر افسانہ میں یہ لمبی چوڑی تمہید یں مستحسن نہیں ہو سکتیں اتنا زیادہ حصہ افسانے کا نذر تمہید ہو جاتا ہے کہ اصل قصہ کی روداد کو اتنا حصہ بھی نہیں ملتا جتنی اسے ضرورت ہوتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل قصہ دلچسپ نہیں ہونے پاتا اور ختم کر دیا جاتا ہے کبھی کبھی افسانے کو شباب سے پہلے موت آ جاتی ہے۔

زبان میں شگفتگی اور بیان میں کافی پختگی و روانی ہے اسلوب بیان کو جوش صاحب

اپنی ندرت پسند طبیعت سے دلکش بنانے کی بہت کوشش کرتے ہیں محاورات تشبیہات بھی نئی لاتے ہیں غالباً زبان کو مالدار بنانے کی فکر رہتی ہے مگر اس جستجو میں کامیابی و ناکامیابی دونوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے آپ کا انتقال علیگڈھ میں ۱۹۵۴ء میں ہوا۔

مجنوں

مغربی ادبیات سے متاثر ہو کر اپنا الگ رنگ قائم کرنے والوں میں مجنوں کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے، وہ انگریزی افسانہ نگار ہارڈی سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں جس کا ان کو خود اعتراف ہے ان کے پیش نظر زندگی کے بہت سے وہ راز ہیں جن کا انکشاف اب تک نہ ہو سکا۔ خیر و شر کا تصادم، جبر و اختیار کے حدود، زندگی اور موت یہی وہ سوالات ہیں جن کے جواب کی جستجو نے انھیں ایسی چیزیں لکھنے پر مجبور کیا جو عام لوگوں کے یہاں نہیں پائی جاتیں ان کی نگاہیں ایسے ہی واقعات کا انتخاب کرتی ہیں جہاں حیات کی کشمکش کوئی دلدوز تمثیل پیش کر رہی ہے ان کے افسانوں کے کردار اپنی مظلومیت کی وجہ سے ہمدردی حاصل کر لیتے ہیں ان کے لئے دنیا اور اس کی تمام دلچسپیاں کوئی دلکشی نہیں رکھتیں ان کا غم و الم ان کی تکلیف اور ایذا رسانی کو غمناک بنا دیتی ہے اور وہ دنیا سے بیزار ہو کر ایک ایسی زندگی بسر کرتے ہیں جو عبرت نہیں پیدا کرتی بلکہ موجودہ نظام تمدن سے بغاوت اور سرکشی پر آمادہ کر دیتی ہے۔

مجنوں کی ذہنیت انقلاب پسندی کے خاتم سے پرے وہ ہندستان کی موجودہ روش میں نجات کی راہ نہیں دیکھتے ان کا کردار کسی ایسی دنیا کی تلاش میں مصروف نظر آتا ہے جہاں امن و سکون ہو اور اسی جستجو میں وہ ہلاکت کے دروازہ پر پہنچ جاتا

ہے عام زندگی اور نظام معاشرت میں تصادم ہوتا ہی رہتا ہے لیکن اس کا جھکاؤ
مجنوں کی ہمدردی حاصل کرلیتا ہے اور ان کے افسانے میں ایک مظلوم کی شکل میں
پیش ہوتا ہے اخلاق و محبت کے وہ نازک مسائل جن کو چھیڑنا لوگ مناسب نہیں
سمجھتے مجنوں کے خاص موضوع ہیں۔ ان کا ہر افسانہ محبت کے جذبات سے لبریز ہے
بعض اوقات محبت کی شدت ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں محبت
کرنے والا کسی اور کام کا نہیں رہتا، وہ محبت کے لطیف سے لطیف جذبے کو بھی پیش
کرسکتے ہیں عورت خاموش محبت کرتی ہے اور یہاں تک ضبط سے کام لیتی ہے کہ اس کا
انجام دیکھا نہیں جاتا مجنوں کے قصوں کا خاتمہ عموماً المیہ ہے ان کی کوشش یہ
ہوتی ہے کہ وہ تیکھا پن اور وہ تلخی جو روح تک ہو رہی تھی کم ہوجائے لیکن پھر بھی
وہ نرمی اور گھلاوٹ نہیں آنے پاتی جس سے اس قدر شدتِ طبیعت کی تلافی ہوسکے
منظر نگاری بہت کم ہے لیکن جہاں کہیں ہے دلچسپ ہے مجنوں نے کبھی کبھی
مزاحِ لطیف کی بھی کوشش کی ہے لیکن اس یاس انگیز فضا میں ایسا ہی معلوم ہوتا
ہے جیسے کسی روتے ہوئے شخص کو گدگدا کر ہنسا دیا جائے۔

مجنوں نے اپنے افسانوں کے لئے ایک مخصوص طرزِ تحریر بنا لیا ہے جس میں
اثر کا عنصر زیادہ موجود ہے برجستہ اشعار رکھ کر وہ اثر مزید بڑھا دیتے ہیں ان کے
کردار آپس میں بہت کم ملتے ہیں لہذا وہ خود ان کے خیال کی ترجمانی کرتے ہیں اسی
وجہ سے انھیں جذبات نگاری پر کافی قدرت حاصل ہوگئی ہے۔ وہ محسوساتِ قلب
کو نہایت صاف اور سادہ الفاظ میں بیان کرسکتے ہیں زبان رواں ہے لیکن انشا
اس سے بھی زیادہ رواں ہوتا ہے وہ جذبات کی ترجمانی کرتے وقت زبان اور
بیان کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ قصے کو دلچسپ اور رواں بنانے کے لئے زبان کی
بندشوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے "خواب و خیال"

اور "سمن پوش" شائع ہو چکے ہیں، جو بہت اچھی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

محوی کے ادبی کارنامہ کا ایک دوسرا پہلو بھی نہایت درخشاں ہے تنقید نگاری میں آپ خاص شہرت کے مالک ہیں سیاسی تخلیل کے ساتھ ساتھ زبان کی لطافت اور ذہنی ارتقا پر روشنی ڈالنا آپ کا خاص حصہ ہے مستقبل کی تاریخ غالباً محوی کو افسانہ نگار سے زیادہ تنقید نگار کی حیثیت سے یاد رکھے گی مغربی تنقید سے انھوں نے اردو کے دامن کو بہت کافی مالا مال کیا ہے لیکن طرز ادا کا اچھوتا پن اور اردو کے ماحول کا خیال کبھی نہیں چھوڑتے ان کی تنقیدات ہمیشہ پُرمغز، ادبی اور مرکزی نکات کو بے نقاب کر دیتی ہیں اور شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ محوی کے ساتھ اردو کی تنقید ایک نئے دَور میں قدم رکھ رہی ہے۔

"ادب اور زندگی" اور "تنقیدی حاشیے" ان کے مضامین کے مجموعے ہیں جن کے پڑھنے کے بعد آدمی ان کی اس خصوصیت کی جانب التفات کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس شاعر یا جس مصنف کی بات وہ لکھتے ہیں اسے اپنا ہیرو بنا لیتے ہیں اور اس کی انتہائی تعریف کرتے ہیں۔

جلیل قدوائی

اپنے ادب کو اچھے افسانوں کی مثال رکھنے کے لئے ہمیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ غیر ممالک کے مشہور افسانہ نویسوں سے استفادہ کریں اور پھر اسی روشنی میں اپنی افسانہ نگاری کو بھی اسی حیثیت سے مسلم بنالیں جلیل قدوائی نے اس ضرورت کو محسوس کر کے روسی مختصر نگار چیخوف کو اپنا رہنما بنایا۔ اس کے افسانوں کے ترجمے کئے اور پھر جب وہ طبع زاد افسانے لکھنے بیٹھے تو چیخوف کا اتنا اثر قبول کر چکے تھے کہ اس

رنگ سے علیحدہ نہ ہو سکے۔ وہی سیرت طرازی اور جذبات ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

خلیل دنیا کو ایک بہتا سمندر سمجھتے ہیں جس کے ہر حصے میں لہریں ہی لہریں ہیں اور ہر لہر زندگی کا کوئی رخ پیش کر سکتی ہے حیاتِ انسانی کے ہزاروں نقوش میں سے وہ کوئی ایک نقش لے کر ایک افسانہ مکمل کر لیتے ہیں اور درحقیقت افسانہ کے لئے یہ بھی ایک ضروری چیز ہے کہ اس کی مدت زیادہ نہ ہو۔ خلیل نے عام افسانہ نویسوں کی طرح صرف عشق و محبت ہی کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ حیاتِ انسانی کے ہر رخ پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں اور جس جگہ وہ زندگی کے معمہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہی ان کا افسانہ ہوتا ہے نہایت پُرخلوص طور پر وہ خود سمجھ کر دنیا کو سمجھانا چاہتے ہیں

خلیل کے افسانوں کے کردار ہمارے سامنے اس طرح آتے ہیں کہ ہم ان میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان سے بارہا مل چکے ہیں خلیل ان میں خود شریک ہو کر اثر انگیزی کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے ہر کردار کی سیرت کی خوبیوں اور کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہونے کا ثبوت دیتے ہیں وہ ان کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں۔ جیسے خود ان پر گزر رہی ہے۔ جذبات نگاری افسانوں کی جان ہوتی ہے۔ خلیل کے یہاں اس کی بھی کمی نہیں

المیہ افسانے بعض اوقات اس قدر تلخ اور سخت ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کو تکلیف سی محسوس ہونے لگتی ہے لیکن خلیل کے یہاں دردناک افسانوں میں حوادث کا تذکرہ اس طرح نہیں کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا بے تاب ہو جائے ایک طرح کی نرمی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ جس میں سوز و گداز اور اثر پوری طرح کارفرما نظر آتے ہیں

خلیل کے افسانے منظر نگاری سے بھی خالی نہیں ہیں مختصر ٹکڑے پوری رنگینی اور آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں　　　لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس

سلسلے میں انھوں نے کوئی نئی بات پیدا نہیں کی بلکہ قریب قریب پرانے لکھنے والوں کے نقش قدم پر گامزنی کی ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے جلیل کے اکثر افسانے ترجمہ ہوتے ہیں ترجمہ میں اصل افسانے کی خوبیوں کا برقرار رکھنا ایک مشکل بات ہے لیکن جلیل اس وادی سے بھی نہایت کامیابی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ بعض اوقات عبارت کے زور اور روانی میں کمی نظر آتی ہے طرز ادا غیر مانوس ہو جاتا ہے لیکن بیشتر اصلی زبان کا لطف موجود ہے۔ زبان اور عبارت کے زور میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی ترجمہ کرتے کرتے جلیل نے اپنے لئے خود ایک مخصوص طرز تحریر بنالیا جو طبع زاد ہونے کے باوجود افسانوں کو ترجمہ کی شکل دیدیتی ہے

جلیل کی زبان سلیس اور صاف ہے وہ عبارت آرائی اور مشکل الفاظ سے مضمون کو بگاڑتے نہیں بلکہ ایک فطری انداز میں ہر گتھی کو سلجھاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ طرز بیان کی شگفتگی مفہوم کو آسان اور زود اثر بنانے میں بہت معاون ہوتی ہے

جلیل قدوائی نے جب سے سرکاری ملازمت کی ہے ان کے ادبی ذوق میں کمی آگئی ہے گو وہ اب بھی لکھتے پڑھتے رہتے ہیں مگر اس سلسلے سے پہلے جہاں تک وہ پہنچ چکے تھے اس میں اب ترقی نہیں نظر آتی جلیل شاعر بھی ہیں حسرت کے رنگ میں اشعار کہتے ہیں جس کا شاہد ان کا مجموعہ کلام "نوائے سینہ تاب" ہے

علی عباس حسینی

طبع زاد افسانے لکھنے والوں میں علی عباس حسینی ایک خاص انداز کے مالک

ہیں انھوں نے اپنے پلاٹ، کردار اور طرز بیان کے ذریعے سے ایک انفرادیت اختیار کرنے کی کوشش کی ہے اور اگرچہ بقول پروفیسر رشید احمد ہندوستان کے تمام مضمون نگاروں کا طرز بیان، مضمون کی ابتدا اور انتہا ایک ہی سی ہے لیکن اب اس کی عام کوشش ہو رہی ہے کہ ہر شخص اپنا ایک مخصوص اسلوب بیان رکھے حسینی صاحب کے یہاں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ان کی سیرت نگاری ہے ان کے کردار بعض خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اور یہی قصے کی ارتقائی منزلیں ہیں، قصے کی تکمیل میں اور ہر جگہ کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں کردار کے سمجھنے اور سمجھانے میں نفسیات اور تحلیل نفسی کا جاننا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ علی عباس صاحب اس خیال کو پیش نظر رکھ کر افسانہ کے لئے قلم اٹھاتے ہیں۔ ابتدائی افسانوں میں جگہ جگہ نفسیاتی صداقت کی کمی تھی۔ صرف اثر پیدا کرنا مدنظر ہوتا تھا۔ لیکن بعد کے افسانوں میں یہ کمی دور ہو گئی اور تحریر کے ساتھ ہی ساتھ کردار نگاری میں بھی پختگی آگئی۔

حسینی صاحب کے یہاں ایک قصہ گو کی طرح تفصیلات کی بھرمار ہے وہ جزوی باتوں کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے بعض اوقات معمولی باتوں کی تفصیل میں بہت کچھ لکھ جاتے ہیں یہ تفصیل سیرت اور کردار کے سمجھنے میں مدد تو ضرور دیتی ہے لیکن کبھی کبھی بار خاطر ہو جاتی ہے۔ اسی جگہ یہ بھی بتا دیا جائے کہ اس کے برعکس وہ بعض جگہوں پر اختصار سے کام لیتے ہیں اور دو تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایک مکمل نقشہ پیش کر دیتے ہیں۔

آج کل کے بہت سے افسانہ نویسوں کی طرح علی عباس حسینی بھی مقامی رنگ کے دلدادہ ہیں انھیں دیہات کی فضا میں سکون ملتا ہے وہیں کے لوگ ان کے افسانوں میں نظر آتے ہیں وہیں کے رسم و رواج اور اصلاح پر

وہ روشنی ڈالتے ہیں ایک خاص انہماک کے ساتھ انھیں مناظر میں کھو جانا چاہتے
ہیں دیہات کی زندگی پر وہ مختلف زاویوں سے نگاہ ڈالتے ہیں کھیت اور
فصلوں کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن ان سے افسانے کی چستی میں کوئی کمی واقع
نہیں ہوتی ہے

علی عباس کے افسانوں کے پلاٹ نہایت دلکش اور فطری ہوتے ہیں اور
اصلاح معاشرت کا کوئی پہلو ایک ہلکے رنگ کی طرح پورے افسانے پر چھایا ہوتا
ہے ان کے بعد کے افسانوں میں یہ مقصد اور زیادہ واضح ہو گیا ہے محبت کو
وہ ایک پاک و مقدس جذبہ سمجھ کر عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہر جگہ
اسے برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ظرافت اور مزاح لطیف کی چاشنی نے طرز تحریر کو بے حد شگفتہ بنا دیا ہے
یوں تو ان کے یہاں ایک درد کی کسک اور تڑپ نظر آتی ہے۔ لیکن یہ ہلکا سا مزاح
اسے فطری بنا دیتا ہے

زبان کی سادگی اور روانی افسانے کے لئے بے حد ضروری ہے حسینی صاحب
بامحاورہ اور عام فہم زبان میں فلسفہ اور نفسیات کے مشکل مسائل حل کر دیتے ہیں
الفاظ کے انتخاب، تشبیہہ اور استعاروں کی مدد سے عبارت میں بے انتہا اثر و
گداز پیدا کر دیتے ہیں انھوں نے فارسی اور عربی کے نامانوس الفاظ سے کنارہ
کشی کر کے ہندی کے خوبصورت اور رسا نے الفاظ پسند کئے ہیں لیکن دلی زبان
سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کوشش میں اکثر انھوں نے ہندی کے نامانوس
الفاظ سے کام لیا ہے جس کی جگہ پر مروجہ اردو کے الفاظ آسانی سے استعمال
کئے جا سکتے تھے۔

آپ کے افسانوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں پہلے کا عنوان "—

"آئی سی ایس اور دوسرے افسانے" دوسرے کا "باسی پھول اور دوسرے افسانے" اور تیسرے کا نام "کچھ ہنسی نہیں ہے"۔

حسینی صاحب کے کردار عموماً متوسط طبقہ سے آتے ہیں اور اسی طبقے سے رسوم و عادات و خیالات کو وہ اپنے خیالات کا محور بنائے ہوئے ہیں سرکاری ملازمت ان دنوں ادبی کاوشوں میں سدراہ ہے۔ چنانچہ اب بہت کم لکھتے ہیں

اعظم کریوی

اعظم کریوی شاعر بھی ہیں افسانہ نگار بھی۔ ان کے پہلو میں ایک حساس دل ہے اس لئے وہ زندگی کے نازک واقعات اور لطیف احساسات کا ایک نظر میں جائزہ لے سکتے ہیں، کوئی واقعہ جس میں اثر کا عنصر موجود ہے ان کے افسانے کا موضوع بن سکتا ہے اکثر سچے واقعات کو رنگین اور دلکش بنا کر افسانے کے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ جن واقعات سے متاثر ہوتے ہیں انھیں کو افسانہ بنا لکھ دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے پڑھتے وقت ہم ایک حقیقی دنیا میں ہوتے ہیں

مقامی رنگ کو ایک اچھوتے انداز میں پیش کرنے کا سحر اعظم کریوی کو حاصل ہے پریم چند، علی عباس حسینی اور سدرشن نے بھی اسی راہ پر گامزنی کی ہے لیکن جو دلکش طریقہ اعظم کریوی نے اختیار کیا وہ سب سے الگ ہے، وہ دیہاتی مناظر کے حسین نقشے معاشرت کے طریقے۔ دیہاتیوں اور زمینداروں کی گفتگو کے مناظر آپس کے تعلقات اور ان کا اثر سب کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ ہم کو کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ تمام جزئیات سے واقف معلوم ہوتے ہیں لیکن انھیں کو

سامنے لاتے ہیں جو افسانے کو ایک خوبصورت تصویر بنا دیں ان کے کردار عموماً نیچے طبقے کے لوگ ہوتے ہیں لیکن اعظم کریوی کو ان سے بڑی ہمدردی ہے ہارڈی کی طرح انھوں نے بھی ان کی آپس کی بے تکلفی اور گفتگو کے نقشے کھینچے ہیں جس میں صداقت کے سوا اور کچھ بھی نہیں بوڑھوں کا طریقہ تکلم، ان کی نقل و حرکت اپنے فطری انداز میں جلوہ گر ہے۔ عورتوں کی بات چیت اور ان کے اشتعال ان کی سیرت کی خصوصیتیں سب مکمل طور پر بیاں ہوتی ہیں۔ اس سے اعظم کریوی کی قوت مشاہدہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

زمیندار اور رعایا کے تعلقات، حکام اور ان کا عام لوگوں سے برتاؤ ایک دلچسپ موضوع ہے اعظم کریوی نے ان مظالم کا احساس کیا ہے جو غریب لوگوں پر ہوتے ہیں اور بعض اوقات موجودہ رسم و رواج کے تار و پود بکھیر دینے کی کوشش کی ہے انھیں دیہات کے معمولی لوگوں سے بہت محبت ہے اور وہ ان کی صحیح حالت دکھا کر لوگوں کو ان کی طرف سے ہمدردی رکھنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں

محبت ایک پاک و مقدس جذبہ ہے اور ہر حال میں وہ کسی نیک کام کی تلقین کرتا ہے عشق کرنے والا ہمیشہ ایثار اور بنی نوع انسان کی ہمدردی سے معمور نظر آتا ہے اور جب محبت ہلاکت کی جانب لے جاتی ہے اس وقت ان کے کردار محبت کی عظمت سے سرشار نظر آتے ہیں اور کوئی بھی گھر اکر محبت کو برا بھلا نہیں کہتا

دیہات کے مناظر یوں ہی خوشنما ہوتے ہیں لیکن اعظم کریوی کے قلم سے نکلنے کے بعد ان میں جان آجاتی ہے۔ کھیتوں اور دریا کی تصویریں برسات اور جھولے کے پُرلطف مناظر ان کے افسانوں کی رنگینی اور جاذبیت کو بہت بڑھا دیتے ہیں واقعہ نگاری کے سلسلے میں جارحی اور داخلی دونوں پہلوؤں پر ان کا قلم ایک ہی انداز

میں چلتا ہے۔ وہ جذبات انسانی کے اچھے ترجمان ہیں اور اصلیت کو کسی حال میں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

ان کی زبان کا لوچ، مکالمے کا فطری انداز، جملوں کی تیزی اور گھلاوٹ سارے افسانے میں ایک خاص گداز کی کیفیت ان کی کامیابی کا راز ہے۔ دیہاتوں کی زبان لکھتے وقت انھیں کے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس وقت ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی دیہات میں ایک تماشائی کی حیثیت سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں فارسی اور ہندی کی لطیف آمیزش جو اعظم کے یہاں نظر آتی ہے اردو کے اور افسانہ نگاروں کے یہاں کم پائی جاتی ہے

اعظم کریوی عرصہ سے خاموش ہیں۔ اب نہ ان کے افسانے نظر آتے ہیں نہ کوئی اور تحریر غالباً لکھنا پڑھنا بند کر چکے ہیں۔ موجودہ افسانہ نگاری اتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ اکثر پہلے کے لکھنے والے خاموش رہنا ہی پسند کرتے ہیں

اس ایڈیشن کے چھپتے چھپتے وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے ۱۹۵۵ء میں وہ کراچی میں قتل کر دئے گئے جس کا سبب اب تک نہیں معلوم ہو سکا۔

اختر

اختر رائے پوری ملک کے اُن چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے مغرب کی فنکاری کو بڑی کامیابی سے اردو ہندی ادبیات میں منتقل کیا اور اردو میں افسانہ نگاری کے معیار کو بلند کر کے ہمارے ادب میں بعض قابل قدر جوہروں کا اضافہ کیا

اختر صاحب کے آرٹ میں موجودہ نظام کی خرابیوں اور کمزوریوں کو محسوس

کرانے کے لئے پُر درد اور پُر اثر انداز بیاں موجود ہے ان کی نظریں بیماروں بھکاریوں
فقیروں اور ہر اس چیز پر پڑتی ہیں جن کو آپ ہمارے سماج کا ناسور سمجھ سکتے ہیں
وہ ان مقامات کو بڑی پُرکاری کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں بیان میں ایک خاص متانت
و دلکشی ہے ان کے انداز بیاں میں ضبط و اثر اور اختصار، ذہنی آمیزی خاص طور پر کارفرما
ہوتی ہے ان کے افسانے پڑھنے کے بعد ہمیں ان کی ذہنی باریک بینی اور ان کے جذبات
و خیالات کے مخصوص تیور کا احساس ہوتا ہے

ایک خاص بات جو ان کو رومانی قسم کے ترقی پسند ادیبوں کی صف میں ممتاز
کرتی ہے یہ ہے کہ وہ عام ادیبوں اور شاعروں کی طرح ہماری روح میں تسکین اور
خواب کا عنصر نہیں آنے دیتے بلکہ اس کو مضطرب، بے چین اور تڑپتا ہوا چھوڑ دیتے
ہیں جس سے ہمارے دلوں میں موجودہ نظام کی خرابیوں کا صحیح احساس پیدا ہو جاتا
ہے ان کی متفکرانہ طرز تخیل افسانہ پڑھنے والوں کو خاص طور پر متاثر و مرعوب
کرتی ہے جس کے سبب سے بعض وقت روانی کا فقدان معلوم ہونے لگتا ہے
ان کے افسانوں کے مجموعہ "محبت اور نفرت" کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ
بعض اوقات افسانوں کی طرز نگارش مضمون اور مقالہ نگاری سے منسلک ہو جاتی
ہے اور ان کے افسانے اصول افسانہ نگاری سے دور ہٹتے ہوئے نظر آتے ہیں
مشکل الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن موقع و محل کا خیال کر کے، اس وجہ سے
عبارت میں دلکشی مجروح نہیں ہونے پاتی

اختر صاحب اپنے پڑھنے والوں کو ایک ایسی منزل پر لا کر چھوڑ دیتے ہیں جہاں
سے امید یا ناامیدی کا کوئی راستہ نہیں نکلتا بلکہ ایک عجیب قسم کی کش مکش ذہن
کو محسوس ہوتی ہے انھوں نے محبت و نفرت کو علیحدہ حیثیتیں دی ہیں اور ان کو علاحدہ
طور پر اپنے آرٹ میں شامل کیا ہے۔ جو بجائے خود ایک کمزوری ہے ایک عملی مسئلہ

کا فرض ہے کہ وہ ان دونوں انسانی جذبات کو ایک ساتھ پیش کرے۔ اگر
کوئی ادب ہمارے دلوں میں صرف محبت یا صرف نفرت کے رجحانات پیدا کرتا
ہے تو یقیناً یہ اس کے لحاظ سے ایک ناقص ہے۔

اختر رائے پوری اپنی تنقیدوں سے اردو ادب میں ایک ممتاز جگہ حاصل
کر چکے ہیں۔ آج کل وہ کراچی یونیورسٹی میں ملازم ہیں۔

کرشن چندر

مغربی طرز تنقید کی بنا پر ہندوستان کے بھی فن تنقید نے دو اسکول
مستقل کے قائم کر دیئے ہیں۔ ایک ترقی پسند اور دوسرا رجعت پسند لیکن یہ تقسیم
کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی کسی مصنف کو قطعی رجعت پسند یا ترقی پسند کہنا آسان
نہیں۔ کیونکہ خود یہ دونوں قسمیں اپنی جگہوں پر اتنی الگ نہیں ہیں کہ اطمینان کے
ساتھ کسی تخصیص کا فیصلہ کیا جا سکے۔ دونوں کی حدیں اتنی ملتی جلتی ہیں۔ پھر ممکن
ہے کہ مغرب میں کسی طرح سے حد فاصل قائم بھی ہو سکے مگر ہندوستان میں ناممکن سا
معلوم ہوتا ہے۔ مغرب میں سرمایہ داری، شہنشاہیت یا اشتراکیت کا پہلو اختیار
کر چکی ہے حقیقت میں ابھی ہندوستان نے سماجی یا معاشی حالات کی بنا پر کوئی
مخصوص اور مستقل حد فاصل نہیں قائم کی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی دقتیں ہیں جن
کو دیکھتے ہوئے رجعت پسند یا ترقی پسند قطعی طور پر کسی کو کہنا آسان نہیں لیکن چند
ظاہری خصوصیات کی بنا پر ہم کرشن چندر کو ترقی پسند مصنفین کی صف میں
پاتے ہیں۔

ان کا فن مجموعی حیثیت سے پورا اترا ہوا دریا ہے جو ان کے تمام افسانوں

میں نمایاں نظر آتا ہے۔ مناظر قدرت کے مقامی رنگ و بو سے وہ عموماً اپنے افسانوں کا پس منظر تعمیر کرتے ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانہ پڑھنے والوں کو چاہے تھوڑی دیر کے لئے شہر کے کاروباری مناظر میں دلکشی پیدا کردیں یا دیہات کی اونچی نیچی زمین، دریا یا جنگل کے مناظر سے دل بہلا دیں مگر بالآخر دنیا کی تلخ حقیقتوں سے دوچار کرا دینا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں اس کی ایک نمایاں مثال "گل فروش" ہے ان کا نظریہ عام نوجوان، شعراء و ادباء کی طرح صرف مزدوروں ہی تک محدود نہیں رہ جاتا وہ متوسط درجے کی المناک زندگی کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔

کرشن چندر حقیقت پسند اور زبردست حقیقت پسند ہیں اگر وہ تنگ و تاریک گلیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ تیرہ و تار مناظر سے نکال کر روشنی اور کشادہ سڑکوں کی بھی سیر کرا دیتے ہیں اب یہ پڑھنے والے کی صلاحیت پر ہے کہ وہ محض تماشائی سے کام لے اور مصنف کی حقیقی ہمدردی کا اندازہ کرلے وہ زندگی کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور کیونکر سنوارنا چاہتے ہیں اس سلسلے میں ان کا افسانہ "زندگی کے موڑ پر" بہت خوب ہے وہ عام نوجوان ادیبوں کی طرح موجودہ سماج کی کاروباری زندگی کے لے تکیے ہیں پر تشدید حملہ کرتے ہیں اور ایک برتر و بہتر مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن شدت احساس سے کبھی کبھی جذباتی طور پر چیخ اٹھتے ہیں جو فنی لحاظ سے نامناسب معلوم ہوتا ہے

مجموعی طور پر کرشن چندر کے افسانوں کی خصوصیات یہ ہیں اثر، زبان و حقیقت کا ایک دلکش امتزاج۔ مطالعہ کی باریکی اور مزاولی موجودہ سماج اور نظام معاشی سے انتہائی اور دلی نفرت کا جذبہ، طنز اور مزاح کی ایک خوشگوار آمیزش الجھا

رمزیہ نگاری ۵۔ انسانی نفسیات کا عمیق ترین مطالعہ۔

کرشن چندر موجودہ افسانہ نویسی میں ہر افسانہ لکھنے والے سے بہتر سمجھے جاتے ہیں۔ اردو کی اس صنف کو جس خوبصورتی اور فنی کمالات سے انھوں نے آگے بڑھایا ہے وہ زبان و بیان کے لحاظ سے پریم چند کے کارناموں پر اضافہ خیال کیا جاتا ہے۔

ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے ہیں لیکن وہ مجموعے جن کے افسانے کرشن چندر کے ذہنی ارتقا کا پتہ دیتے ہیں حسب ذیل ہیں۔ "زندگی کے موڑ پر" "ٹوٹے ہوئے تارے" ان افسانوں میں رومانی طرز تخیل اور طرز بیان کا مظاہرہ۔

دوسرا دور جب اشتراکیت سے وہ قریب تر ہو گئے ہیں اس وقت کے افسانوں کے مجموعہ میں "نظارے" خاص طور پر قابل قدر ہیں۔ تیسرا دور تقسیم ہند کے بعد سے شروع ہوتا ہے جس میں ان کا بہترین شاہکار "ہم وحشی ہیں" ہے جس کی تقلید آج تک ہو رہی ہے۔

سعادت حسن منٹو

ان کی سوچی تحریر نے ایک دنیا نقش فریادی ہے۔ ان کے کرداروں کا پیرہن کاغذی نہیں بلکہ گوشت پوست کا ہے وہ فرضی نہیں حقیقی ہیں ہماری طرح انسان دنیا دار ہیں۔ سماج کی خود غرضی اور نظام حکومت کی ابتری نے ان کو اس حالت میں پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنے جسم بیچنے پر مجبور ہیں اور اپنی انسانیت و خودداری کو دوسروں کی تفریح و ہوس کے لئے ذلیل کر کے پیش کرتے ہیں یہ طبقہ ہمیشہ سے موجود تھا۔ لوٹنے والے اور لٹنے والے تاریخ کے ہر دور میں یہاں رہے تھے۔

چنانچہ آج بھی ہیں مگر لٹنے والوں کی خستہ حالی اور مجبوری و بے کسی نے اقتصادی زاویہ
اور معاشرتی ارتقا کے خیال سے نظر ڈالی۔ بھیانک اور گندی دنیا سمجھ کر گیا ہو
کا مجسمہ تصور کر کے ارباب حل و عقد نے ہمیشہ اس طبقے سے چشم پوشی بہتر سمجھی حالانکہ
روزمرہ کی زندگی میں اس طبقہ کو بھی غیر ضروری کبھی نہیں سوچا گیا۔ منٹو نے
اپنے افسانوں میں ایسے ہی لوگوں کے پوست کندہ حالات پیش کئے ہیں ان کی
زندگی کے مختلف ناقابل برداشت مصائب کا ذکر کیا ہے ان کی گندی طرز
معاشرت اور ذلیل ماحول کو پیش کیا ہے خیال ہوتا ہے کہ ان کا منشا اس گنہگار
اور بدنام طبقہ کی زندگی کو دکھا کر غالباً زمانے کو یہ سمجھانا تھا کہ اس دیار کے
رہنے والے بے بس ہیں اور ایسا کرنے پر مجبور ہیں وہ لذت کے لئے یہ پیشہ نہیں
کرتے اس فضا میں وہ اس لئے سانس لے رہے ہیں کہ دنیا نے ان کو اس گڑھے
میں ڈھکیل دیا ہے۔

طوائفوں یا اسی طبقے کے دوسرے کرداروں کو وہ اس انداز سے پیش
کرتے ہیں کہ جیسے ان کی زندگی ان ہی لوگوں میں گزری ہو جنسی کیفیت اور
نفسانی خواہشات کے مظاہرے بڑی تفصیل و بیباکی سے بیان کرتے ہیں کبھی
کبھی تو ان تفصیلات میں اتنا ڈوب جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ منٹو کے پیش نظر
اصلاح نہیں بلکہ لطف اندوزی ہے ایسے ہی مقامات پر ابتذال و تکلیف دہ
شوخی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو کسی لحاظ سے قابل برداشت نہیں۔

منٹو کے دل و دماغ پر جنسیات کا غلبہ ہے وہ بہت کچھ فرائڈ کے فلسفے سے
متاثر ہیں اور دنیا کو یا کم سے کم ایک خاص طبقہ کو نفسانی خواہشات کا شکار بتاتے
ہیں مگر نہ اصلاح کا کوئی طریقہ بتلاتے ہیں اور نہ قاری کو مکروہات کے سمجھنے کا
موقع دیتے ہیں بلکہ ذہن کو مشتعل و گمراہ کر دیتے ہیں حالات سے تنفر کے بجائے

ایک لذت انگیز اکسں پیدا کردیتے ہیں جو اس مقصد کے برعکس ہے۔ جو ہم نے اوپر کی سطروں میں بیان کیا ہے اس کی طرح تحلیل نفسی غلط ہے ایسے ہی افسانہ نویسوں کے لئے غالباً اقبال نے کہا تھا۔ "آہ بیچاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار"

منٹو کی عریانی اور عریانیت کو دیکھ کر ایک زمانے کو خیال ہوا کہ وہ ترقی پسند تحریک کے تحت یہ معرکہ سرکر رہے ہیں مگر یہ سراسر غلط فہمی تھی۔ ترقی پسند تحریک کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے یہ ان کا ذاتی فعل ہے اور ان کی ذہنی اپج کا نمونہ ہے ترقی پسند تحریک ادب کو حیات سے قریب تر کرنا چاہتی ہے۔ وہ زندگی کے بھیانک پہلوؤں کو اس لئے پیش کرنا چاہتی ہے کہ ان کی اصلاح ہو جائے وہ ملکی معاشرت کے صحت مند دائرہ میں تبدیل ہوسکیں وہ طوائف یا اس قبیل کے دوسرے کرداروں کو تعیش اور ذہنی اشتعال کے لئے نہیں قلم بند کرتی اس کا منشا گرے ہوئے طبقہ کو اُبھارنے کا ہے منٹو کے یہاں یہ مقصد ہم کو بہت کم ملتا ہے۔

منٹو کے اسلوب بیان میں روانی کافی ہے سادگی بہت ہے مگر عمق بالکل نہیں۔ موضوع میں تنوع بھی کم ہے ایک ہی طرح کی بات زیادہ تر کہتے ہیں البتہ جنسیات کا مطالعہ وسیع ہے۔ متحرک کرنے والے جذبات یا محرک ہونے والے اثرات کو بڑی اچھی طرح بیان کرتے ہیں۔ نفسانی خواہشات کے دام میں پھنسے اور پھنسانے والوں کی ذہنیت کی ترجمانی پر وہ پوری طرح قادر ہیں ان کی زندگی کا نقشہ اور ان کی گلی کا خاکہ پوری وضاحت کے ساتھ اثر پذیر انداز میں بیان کرتے ہیں۔

منٹو کا انتقال ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو پاکستان میں ہوا۔

۸

مزاحیہ افسانے

گذشتہ صفحات میں اکثر اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بعض اہلِ قلم نے افسانوں اور مضامین کو اپنے اصلاحی مقاصد کا آلۂ کار بنا دیا۔ انھوں نے وہ عبرت انگیز داستانیں پیش کیں جو پڑھنے اور سننے والوں کے لئے سبق آموز ہوں۔ جن کا درد ناک اثر ہماری کمزوریوں اور برائیوں کی یاد دلاتا ہے۔ موجودہ باب میں ان اربابِ قلم کا تذکرہ ہوگا جن کے یہاں اصلاح کا انداز ظرافت میں تبدیل ہو گیا ہے۔

اودھ پنچ اور اس کے مضامین لکھنے والوں نے اکثر سیاسی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں کا مذاق اڑایا۔ خود ہنسے اور دوسروں کو ہنساتے رہے لیکن اس ہنسی ہی ہنسی میں وہ کام کی باتیں بھی بتا جاتے تھے۔ جب اردو ادب میں مزاح نگاری کا رواج ہو گیا تو انھیں لوگوں نے ناول اور مضامین کی طرف توجہ کی اور ایک تفریحی سرمایۂ ادب اپنے بعد چھوڑتے گئے۔ اودھ پنچ کے شائع ہونے سے ملک میں ظرافت نگاری کا ایک رواج سا ہو گیا اور کچھ لوگوں نے اس میدان میں بھی

قدم بڑھائے۔ لیکن ان سب میں ایک مخصوص رنگ کی جھلک تھی۔

مغربی علوم کے اثرات سے ظرافت کا ایک نیا دور شروع ہوا جس میں طنز اور مزاح لطیف کا رواج ہوا افسانے اور مضامین اکثر پلاٹ کے ذریعہ سے حدود آرٹ بنائے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی صرف زبان اور الفاظ کی دلکشی سے، یہ ضرور ہوا کہ بہت سے لکھنے والوں نے صرف ہنسانے کو اپنا مقصد سمجھ کر ادب اور زبان پر چھری چلا دی ان کے یہاں نہ صرف مزاح مفقود ہے بلکہ ہنسی ان کی ہنسانے کی ناکام کوششوں پہ آتی ہے

تھوڑے ہی دنوں کے بعد مزاح نگاری میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوئی اور مغربی ادبیات کے اثر سے مزاح کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ لکھنے والوں میں کسی نے سیرت نگاری کا کمال دکھا کر وہ کردار پیدا کئے جو ہمیں سبق دے جائیں کسی نے اپنے اسلوب بیان اور زبان کی لطافتوں سے ہنسا کر اپنا کام نکالا کسی نے پلاٹ میں وہ واقعات بیان کئے جو ہمیں ہنسنے پر مجبور کر دیں۔ اس طرح مزاح لطیف کا عام رواج ہو گیا جس نے ادب اردو میں ایک گراں بہا اضافہ کر کے اس کمی کو پورا کر دیا جس کے بغیر ہمارے یہاں رجائیت اور مزاح کی کمی تھی۔

پطرس

انگریزی ادب کے ایک اچھے ادیب ہونے کے ساتھ ہی ساتھ آپ کو اپنے ملک اور زبان سے بھی دلچسپی ہے مغربی ادبیات سے پوری طرح مستفیض ہونے کے سبب سے آپ نے اپنے مضامین میں ان تمام لطافتوں کا اظہار کیا ہے جو ہمیں مغرب میں نظر آتی ہیں، پطرس نے اردو مزاح نگاری کو ایک ایسے

راستے پر لگانے کی کوشش کی ہے جہاں فطری انداز موجود ہے وہ ہنسانے
کی کوشش نہیں کرتے بلکہ واقعات کا تسلسل اور کرداروں کے حرکات و سکنات
فطری طور پر اس طرح دکھاتے ہیں کہ خواہ مخواہ مزاح کا پہلو نکل آتا ہے۔
ان کے افسانوں کا مقصد محض ہنسنا اور ہنسانا نہیں ہوتا بلکہ ان کے ذریعے
سے وہ اصلاح کا کوئی نکتہ مد نظر رکھتے ہوئے علمی اور ادبی خدمت کرنا
چاہتے ہیں۔

پطرس کو اس کا احساس بخوبی ہے کہ ہر شخص میں کچھ نہ کچھ کمزوریاں
ہوتی ہیں اس لئے وہ کسی کی کمزوری پر اپنے افسانوں کی بنیاد رکھنا نہیں
چاہتے بلکہ نہایت بے باکی اور زندہ دلی سے اس کمزوری کا اظہار کرکے
ایک ہمدردانہ لہجے میں واقعات کے نشیب و فراز کا لطف اٹھاتے ہوئے
گزر جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں پڑھنے والوں کی ہنسی میں محبت اور
ہمدردی کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے۔

پطرس نے کردار نگاری اور سیرت طرازی میں ایک ماہر نفسیات
کا کمال دکھایا ہے ان کے کردار اپنے فطری انداز میں سب کچھ کرتے
ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کو خبر نہیں ہوتی کہ ان کی حرکتوں کا اثر دوسروں
پر کیا پڑ رہا ہے پطرس کا مشاہدہ بہت خوب ہے وہ سیرت انسانی
اور اس کی جزوی باتوں کو بھی غور سے دیکھتے ہیں، وہ یہ بھی دیکھتے ہیں
کہ جب انسان تنہا ہوتا ہے تو کیا کیا کرتا رہتا ہے انھیں یہ بھی خبر ہے
کہ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں کیا انداز پیدا ہوتے ہیں حرکات و سکنات
رفتار و گفتار ہر ایک بات کے بیان میں نفسیاتی مشاہدہ کا ثبوت دیتے ہیں
اسی لئے ان کے مضامین پڑھتے وقت ہم ان باتوں پر بھی ہنس لیتے ہیں

جو ہم میں خود موجود ہیں۔ لیکن اس وقت ہم نے انھیں کبھی غور سے دیکھا ہی نہ تھا۔ پطرس کے کردار ارتقا کے اُصول کی پابندی پر کاربند نظر آتے ہیں

پطرس نہایت ذکی الحس اور ذہین صاحب قلم ہیں ان کا پلاٹ کوئی گورکھ دھندا یا بھول بھلیاں کا منظر نہیں پیش کرتا بلکہ اس کا فطری اتار چڑھاؤ، مکالمہ اور روانی سب ایک جگہ ہو کر معمولی سے خیال کو بھی بلند کر دیتے ہیں۔ ان کا پلاٹ خاموشی کے ساتھ اپنے گرد و پیش کے مناظر سے ہم رنگ ہوتا ارتقا کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے ہم ہنستے ہیں اور خود اسی میں گم ہو جاتے ہیں کبھی کبھی وہ جملوں کی ترکیب اور الفاظ کی ترتیب سے مزاح پیدا کر دیتے ہیں برجستگی اور ندرت ایک سیدھی سی بات کو بھی شرارہ آتش بنا دیتی ہے

منظر نگاری کا موقع پطرس کو زیادہ نہیں ملا لیکن جس جگہ انھوں نے اس کی کوشش کی ہے وہاں تصویر کو اعلیٰ رنگ میں پیش کیا ہے۔ معاشرت اور عام گفتگو کے نقشے ان کے قلم سے حقیقت کا رنگ لیے نکلتے ہیں مختصر یہ کہ پلاٹ اور کردار، سیرت اور منظر نگاری میں ہر جگہ اصلیت کو پیش نظر رکھا ہے

پطرس کی زبان کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے بعض پنجابی محاورات سے قطع نظر کر لینے کے بعد ان کی زبان سادہ اور دلچسپ ہے روانی اور زور کے ساتھ ہی ساتھ ایک لوچ اور دلکشی ایسی بھی موجود ہے جو انھیں صاحب طرز ماننے میں مدد دیتی ہے ان کا اسلوب بیان بیان کی تمام لطافتوں سے بھرا ہوا ہے شگفتگی بے معنی باتوں میں بھی جان ڈال دی

ہے وہ اپنے بیان کو اس قدر خوش گوار اور پُر لطف بنا لیتے ہیں کہ جیسے پڑھنے والا ان کا راز داں ہے اور وہ اس سے ہمکلام ہیں۔

پطرس بہت کم لکھتے ہیں اب تک ان کا ایک مختصر سا مجموعۂ مضامین شائع ہوا ہے اور کچھ مضامین رسالوں میں نکلتے رہے ہیں لیکن اس کمی کے باوجود بھی انھوں نے ملک کے اچھے لکھنے والوں میں اپنے لئے ایک مقتدر جگہ پیدا کر لی ہے

عظیم بیگ چغتائی

مزاحیہ افسانہ نگاری کے ذریعے سے اصلاح رسوم کا مقصد پیش نظر رکھنے والوں میں عظیم بیگ چغتائی کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے آپ کو طالب علمی ہی کے زمانے سے مضامین لکھنے کا شوق تھا۔ چغتائی کے افسانوں کی تمام تر دلچسپی ان کے پلاٹ میں پائی جاتی ہے افسانہ پڑھتے وقت وہ واقع ہو جاتی ہے جس کی ہم کو امید نہ تھی بعض اوقات ان کے انسانوں کے کردار وہ حرکتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو ہماری روزانہ زندگی میں نظر نہیں آتیں بوڑھا بچہ عورت اور مرد ہر ایک تعزل نظر آتا ہے کوئی خاموش بیٹھا چاہتا ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر افسانوں کی زندگی دو سال ضائع ہو جاتی ہیں اور ہم ایسی موجودہ دنیا میں نہیں بلکہ چغتائی کی بنائی ہوئی دنیا میں پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

طالب علمی کی شرارتیں ان کے افسانے کے سرسری میں پائی جاتی ہیں شادی، بیاہ، نکاح و طلاق، پردہ وغیرہ کے متعلق وہ موجودہ صورت حال

میں کچھ اصلاح چاہتے ہیں اور ان کے بہت سے افسانوں کی بنیاد انہیں
خیالات پر ہے۔ ان کا اثر ان پر اس قدر زیادہ ہے کہ افسانوں کے علاوہ
انھوں نے "قرآن اور پردہ" جیسی سنجیدہ کتاب بھی لکھ کر اپنے مقصد کو
واضح کیا ہے ان کی تصویریں ہماری موجودہ سوسائٹی سے تعلق نہیں رکھتیں
بلکہ چغتائی کی ذہنی سوسائٹی کا مرقع ہیں۔ انھوں نے دردناک افسانے بھی
لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی شہرت "شریر بیوی" اور "کولتار" پر
قائم ہے۔ دوسرے افسانوں میں روانی اور وہ لطافت نہیں ہے جو
"شریر بیوی" وغیرہ میں پائی جاتی ہے زبان اور محاورے کا انھیں کوئی
خاص خیال نہیں تھا ان کے یہاں جملوں کی ایسی ترکیبیں بھی نظر آتی ہیں جو
اہل ذوق پسند نہ کریں گے۔ اگر زبان دانی اور قواعد سے ہٹ کر ہم ان
کے افسانوں پر ان کی کردارنگاری یا پلاٹ کی خوبیوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں
اس بساط پر عظیم بیگ ہی نظر آئیں گے اردو کے اور مزاح نگار اپنے
مکالمہ اور طنز سے مزاح پیدا کرتے ہیں لیکن چغتائی کا پلاٹ ہی ہمیں ہنسنے
پر مجبور کر دیتا ہے ان کی تصانیف کی فہرست طویل ہے جن میں افسانو
کے علاوہ اور کتابیں بھی شامل ہیں۔

چغتائی تپ دق کے مریض تھے اور اسی نے رفتہ رفتہ ان کی تمام
صلاحیتوں پر پانی پھیر دیا اور بالآخر اگست ۱۹۴۱ء میں جب ریاست
جودھپور کے چیف جسٹس تھے۔ انتقال کیا۔

فرحت اللہ بیگ

ہنسنے اور ہنسانے کا کوئی اُصول مقرر نہیں ہو سکتا تمام مزاح نگار اپنا انداز جداگانہ رکھتے ہیں مرزا فرحت اللہ بیگ (آپ کا فرحت یا مرزا الم نشرح) کا بھی ایک مخصوص رنگ ہے جسے عظمت اللہ بیگ نے "خوش مذاقی" کہہ کر یاد کیا ہے خوش مذاقی یا مزاحِ لطیف میں قہقہہ کا موقع کم ملتا ہے۔ ہاں تبسم کے مواقع بہت ملتے رہتے ہیں، ان سب سے زیادہ ان کے یہاں ایک طرح کا انبساط حاصل ہوتا ہے جو دیر پا کہا جا سکتا ہے۔ مرزا صاحب کی علمی اور ادبی رنگ کی شوخی نے انھیں مزاح نگاروں میں ایک خاص جگہ حاصل ہے۔ خالص مزاحیہ مضامین کے علاوہ انھوں نے ادبی مباحث پر بھی قلم اٹھایا ہے لیکن طبیعت کی شگفتگی اور مزاح کی شوخی نے وہاں بھی گل کھلائے ہیں فرحت اللہ بیگ کے یہاں سوقیانہ پن نام کو بھی نہیں ہے ان کے مضامین پڑھتے وقت ایک طرح کی دماغی ورزش ہو جاتی ہے جس کے بعد فرحت حاصل ہوتی ہے۔

مولانا نذیر احمد کی طرح قوتِ بیان کافی موجود ہے تفصیلات سے مضمون بے حد دلچسپ ہو جاتا ہے۔ مرزا صاحب کی لطیف اور پرجوش تحریر تفصیل کے موقع پر بھی اپنی لطافت کا ساتھ نہیں چھوڑتی ان کی لطیفہ پسند طبیعت" اور ان کی رنگین بیانی مضمون کے بیچ میں وہ واقعات لاتی ہے جو لطف پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ مضمون کو واضح بنانے میں مدد دیتی ہیں، کبھی کبھی خفیف سا طنز بھی نظر آتا ہے جو سمجھنے والوں کے لئے

کافی اثر رکھتا ہے

مرزا فرحت اللہ بیگ کے یہاں دلچسپی کے کئی سامان ہیں ان کی مزاح نگاری سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی دلی کی زبان اور محاورات کا کیف باقی رہ جاتا ہے وہ اکثر ایسے الفاظ اور محاورے اپنی عبارت میں لاتے ہیں جو دلی کے لوگ صرف گفتگو میں استعمال کرتے ہیں لیکن مرزا صاحب انھیں بے تکلف اپنے مضمون کو سجاتے ہیں اور تواتر میں کوئی فرق نہیں ہونے پاتا بلکہ مکالمے کا پورا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ روانی، الفاظ کی خوبصورت نشست مضمون اور خیال کا دست و گریباں ہونا، فرحت اللہ بیگ کی خصوصیات ہیں۔ پڑھنے والا ان کے مضمون سے کبھی اکتا نہیں سکتا

رشید احمد صدیقی

رشید احمد جون پور کے ایک دیہات مڑیاہو کے رہنے والے ہیں ۱۸۹۶ء سال ولادت ہے انٹرنس پاس کرنے کے بعد وہ علی گڑھ آئے مگر تعلیم جاری رکھنے کے لئے ان کو تعطیل میں کچہری کی کلرکی کرنے پر بھی مجبور ہونا پڑا اس لئے کہ مالی مشکلات زیادہ نہیں لینے دیتی تھیں علی گڑھ سے انھوں نے ایم اے کیا ۱۹۲۲ء میں وہیں ملازم بھی ہو گئے انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں اپنی انشا پردازی کا سکہ بٹھا دیا تھا ان کی مخصوص انشا پردازی ان کی انفرادیت کی ضامن ہو گئی تھی

وہ اب علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو ادب کے پروفیسر ہیں اور شعبہ اردو کے صدر رہیں پروفیسر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو محض ادیب

ساتے ہیں اور دوسرے وہ خواص سے زیادہ ادب کی خدمت کرنے کا خیال
رکھ کر خود بھی مضامین لکھتے رہتے ہیں، رشید احمد صدیقی آخر الذکر طبقہ میں
ایک ممتاز اور بلند مقام پر ہیں۔

طنز ایک مشکل صنف ادب ہے ذراسی لغزش بھی مضمون کو تباہ کرنے
کے لئے کافی ہوگی رشید احمد طنز کے واحد لکھنے والے ہیں اور نہایت
کامیابی کے ساتھ اپنا رنگ سب سے جداگانہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان
کے یہاں ایک طرح کی شستہ ظرافت ہے۔ رمز کنایہ میں تنقید کے دشوار
گذار مراحل کو طے کر لینا رشید احمد کا ہی کام ہے ان کے ذاتی جذبات
اور احساسات جو کسی واقعہ کے متعلق ہوتے ہیں ایک طنزیاتی انداز میں
اس طرح ظاہر کئے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا انھیں مذاق سمجھ کر ٹال نہیں سکتا
وہ کانٹوں کی طرح اس سے الجھ کر اپنا اثر پیدا کر ہی لیتے ہیں۔

رشید احمد کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے، ہر قدم پر وہ واقعات
کی طرف لطیف اشارے کرتے ہیں۔ صرف وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں
جو تاریخ اور سیاسیات سے اچھی طرح واقف ہیں وہ ایک بات کہہ کر گذر
جاتے ہیں اور ذہن اس کے اجزا کو جمع کر کے کوئی نتیجہ نکالنے میں مصروف
ہو جاتا ہے، ان کے خیالات کی دور رسی، گہرائی اور بزاکت عام مذاق
سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے رشید احمد کے یہاں ذہانت کا ثبوت ہر جگہ
نمایاں ہے ان کی مثالیں ان کے مضامین کی جان ہیں "ارہر کا کھیت
ہی کیوں نہ ہو، لیکن وہ اس کو اسمبلی اور پارلیمنٹ کے دوش بدوش دکھا
سکتے ہیں طائر خیال کی یہ پرواز مثال کے موقع پر وہ چیزیں لاتی ہے جن
سے ذہن کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے

ان کی زبان شکل عربی و فارسی الفاظ سے نقش و نگار حاصل کرتی ہے ان کی عبارت اپنے خیال کی بلندی اور الفاظ کی ترتیب کی وجہ سے عام فہم نہیں ہے لیکن ایک طرح کی روانی ہر جگہ پائی جاتی ہے شگفتگی مضمون کے ہر حصے میں نظر آتی ہے فلسفیانہ مباحث بھی اسی شگفتہ انداز میں بیان ہو جاتے ہیں

افسوس یہ ہے کہ رشید احمد صاحب نہیں بہت کم ایسے مضامین سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ عرصہ سے وہ خاموش ہیں ہم منتظر ہیں کہ وہ پھر جلد ہی کچھ کہتے ہوئے نظر آئیں۔ مضامین رشید اور خنداں، ان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں

سنہ ۱۹۴۲ء میں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "گنج ہائے گراں مایہ" کے نام سے شائع ہوا۔ ادھر ایک مجموعہ "خنداں" کے نام سے بھی شائع کر چکے ہیں۔ ان میں رشید احمد صاحب نے بعض اہم شخصیتوں کا ذکر کیا ہے اور اپنے طرز تحریر کے زور سے انہیں اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہنستے بولتے نظر آتے ہیں موضوع غیر دلچسپ ہونے کے باوجود عبارت میں وہ شگفتگی اور رعنائی ہے کہ جی بالکل نہیں گھبراتا ہے اس مجموعہ کی اشاعت سے ان کی بعض ایسی صلاحیتوں کا مظاہرہ ہوا ہے جو کہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہیں۔

مُلّا رموزی

مُلّا رموزی گلابی اردو اور بکاتی اردو کے موجد خیال کیے جاتے

ہیں اس بیان کو خود بھی بڑا فخر ہے اور ہر جگہ اس کا تذکرہ کر دینا بھی
ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔ "ہماری اردو جملوں میں الفاظ کو
بے ترتیب بنا دینے سے گلابی ہو جاتی ہے۔" اس طرح بالعموم فعل پہلے
فاعل اور مفعول کے قبل آجاتا ہے، اور اس کی شان ان تراجم کی ہو جاتی
ہے جو اردو کے ابتدائی زمانے میں عربی سے کئے جاتے تھے۔ ابتدا میں
ایک طرح کی ندرت تو ضرور ہے لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد سارا اثر زائل
ہو جاتا ہے اور بحیثیت غریب الفاظ کا تسلسل کھٹکنے لگتا ہے وہ محسوس ہونے لگتا ہے
جب وہ سادگی کے ساتھ لکھتے ہیں تو ان کے یہاں خاص رعنائی سی آتی ہے
اور مزاح سے فطری لگاؤ ہونے کی وجہ سے عبارت کافی دلچسپ
ہو جاتی ہے۔

ملا رموزی کے یہاں عام طور پر سیاسی واقعات کی طرف اشارے ہوتے
ہیں وہ کبھی کبھی طنزیاتی انداز میں ان پر تبصرہ بھی کر جاتے ہیں ان کے دل
میں مذہب اور قوم کا درد ہے اور وہ ان کی اصلاح چاہتے ہیں۔ اسلامی ممالک
کا تذکرہ کرتے وقت ایک جوش اور زور نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ ان میں کسی
طرح کی اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی کمزوری نہیں دیکھنا چاہتے۔ ایک
جگہ وہ خود لکھتے ہیں کہ ان کی مضمون نگاری کا دار ان کی صحافت نگاری
میں ہے اور اسی وجہ سے ان کو ہر سچی اور بے لاگ بات کہنے والے کی
طرح نقصان بھی اٹھانے پڑے لیکن انہوں نے صداقت پسندی کا دامن
کبھی نہیں چھوڑا اور اپنے لطیف اشاروں میں اپنے مزاحیہ مضامین میں
معاشی، معاشرتی اور اخلاقی حالات پر برابر تبصرہ کرتے رہے۔
ملا رموزی کا انتقال جنوری ۱۹۵۲ء میں بھوپال میں ہوا

شوکت تھانوی

اگرچہ غزلوں کا ایک مجموعہ "گہرستان" شائع کر کے شوکت نے اپنے آپ کو ایک شاعر کی حیثیت سے بھی پیش کیا ہے لیکن ان کی شہرت مزاح نگاری اور "تبسمات" کی رہین منت ہے۔ شوکت کا شمار ان لکھنے والوں میں ہے جن کو فطری طور پر مزاح نگاری کی صلاحیت ودیعت ہوئی ہے ان کے یہاں پلاٹ کی پیچیدگیاں نہیں ہوتیں۔ کیونکہ وہ افسانے کم لکھتے ہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی اور اس کی معمولی باتوں پر تنقید ہوتی ہے جس میں موجودہ رسم و رواج پر تبصرہ ہوتا ہے۔ ان کے انداز بیان کی دلکشی کا مدار ان کا بیساختہ پن ہے سادہ سادہ الفاظ میں وہ ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ پڑھنے والوں کے لب پر بھی تبسم آ ہی جاتا ہے "سودیشی ریل" ان کی شہرت کا سنگ بنیاد ہے یہ اگرچہ افسانویت اور پلاٹ کی خوبیوں سے معرا ہے لیکن مکالمہ اور انداز تحریر سے مناسب شگفتگی پیدا کر دی ہے۔ متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

ان کی پانچ مشہور کتابیں جن کے نام بجائے خود ان کی افتاد طبیعت کا پتہ دیتے ہیں۔ "دنیائے تبسم"، "موج تبسم"، "سحر تبسم"، "سیلاب تبسم" اور "طوفان تبسم" ہیں۔ یہ نام ایسے ہیں کہ اپنی جگہ خود شگفتگی اور تبسم کے مظہر معلوم ہوتے ہیں۔

اختر ہاشمی میں ان حضرات کی تمام خصوصیات ہیں جن سے شوکت بدرجہ اتم متصف ہیں۔ ان کی کتاب میں مسرت نگاری کی صلاحیت کافی نمایاں ہے

اپنے خاص انداز میں انھوں نے لوگوں کی اچھی اور بری صورت و سیرت کو پرلطف طریقے سے پیش کیا ہے
اس کے علاوہ ان کی لکھی ہوئی دس پندرہ اور کتابیں بھی ہیں

کنھیا لال کپور

اردو کے مشہور طنز نگار ہیں۔ ان کی دوربیں نگاہ زندگی کے ہر شعبے پر پڑتی ہے۔ سیاسی، معاشرتی، علمی، ادبی خرابیوں کو نہایت حسین اور مزاحیہ انداز میں منظر عام پر لاتے ہیں۔ ان کی تحریر و تخیل میں فلسفیانہ عمق نہیں وہ کسی خاص نظریے سے متاثر ہو کر نہیں لکھتے اور وہ ایسے طور پر سوچتے ہیں اور سماج یا فرد کی خرابیوں کو بے جھجک کہنے کی باتوں کی طرح پیش کر دیتے ہیں۔ ادیب ہو یا کوئی لیڈر، عورت ہو یا سینما کا ڈائرکٹر۔ ہر ایک کی بے راہ روی پر کنھیا لال کپور کی نظر پڑتی ہے۔ ان کی حماقتوں کو بڑی سنجیدگی سے متعارف کرا دیتے ہیں باوجود متانت کے واقعات اور حالات کچھ ایسے سلیقہ سے سامنے لاتے ہیں کہ پڑھنے والا زیر لب مسکراہٹ پر مجبور ہوتا ہے اور انجام سے باخبر ہو کر ایسے کرداروں سے گریز کرنے لگتا ہے پھر ان کا دل اور بھی متاثر ہو جاتی ہے جب ایسے زعم باطل میں لیڈر یا ڈائرکٹر وغیرہ اپنی، بال سے اپنی حماقت آمیز خصوصیات پر تبصرہ کرتا ہے۔

کنھیا لال کپور اپنے افسانوں میں خود ہنستے ہوئے نظر آتے بلکہ ایک طرح سے اشخاص یا رجحانات کی کمزوریوں کا ماتم کرتے ہوئے

دکھائی دیتے ہیں مگر اسلوب بیاں کی شوخی اور بے باکی مضامین ایک ایسی لہر دوڑا دیتی ہے جو سمجھنے والوں کو بار بار گدگداتی اور چھیڑتی چلی جاتی ہے۔ ان کی سطحی پن ہے ان کے افسانوں کو یکسانیت کا شکار نہیں ہونے دیا بلکہ ان میں اچھا خاصہ تنوع پیدا ہو گیا ہے معمولی باتوں میں بھی انھوں نے نکات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اکثر کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں گہرائی نہیں پیدا ہو سکی مگر دلآویزی سے یہ مقامات خالی نہیں۔

ان کی تحریر میں بڑی شگفتگی اور سادگی ہے ان کے افسانے ایسے ہیں جیسے کوئی بے تکلف باتیں کر رہا ہو۔ غور سے دیکھئے تو افسانوں کے بجائے وہ مضامین معلوم ہوتے ہیں بظاہر ان تحریر کی سنجیدگی سے متصف ہیں لیکن باطن میں طنز و مزاح اپنا کام کر رہے ہیں ان میں ایک مقصد ہے وہ محض ہنسانے یا گدگدانے کے لئے نہیں لکھے گئے غلط میلانات اور مہلک جراثیم کو آپ کے سامنے بغیر فلسفیانہ انداز اختیار کئے ہوئے روزمرہ کی باتوں میں پیش کر کے کنھیالال ان کی اصلاح پر آپ کو متوجہ کر دیتے ہیں

کنھیالال کی زبان ٹکسالی اردو کا نمونہ ہے۔ ان کی تحریر کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی ادبیت ہے۔ جملوں میں جامعیت اور روانی جہاں کہیں ہم آہنگ ہو گئی ہیں وہ مقام ادب کا بہترین حصہ ہو گیا ہے چونکہ ان کے یہاں پیچ کش مکش نہیں ہے اس لئے نہ تحریر میں الجھن پیدا ہوتی ہے نہ مفہوم سمجھنے میں دقت ہوتی ہے وہ اپنا مقصد واضح کرنے کے لئے تشبیہ و استعارے کا سہارا نہیں لیتے بلکہ جو کچھ کہنا ہوتا ہے صاف اور

برجستہ کہہ جاتے ہیں۔ اپنے کرداروں کی جزوی تفصیلات سے پوری طرح واقف ہونے کی وجہ سے وہ ان باتوں کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں جنھیں ہم بادجود روز مرہ دیکھنے کے معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں، لیکن اسی کو کپور اس رنگ سے ہمارے سامنے لاتے ہیں، کہ وہی دیکھی بھالی، سوچی سمجھی بات بڑی عجیب سی معلوم ہونے لگتی ہے اور ہم دل سے قائل ہو جاتے ہیں۔ ان کے یہاں ایسے مضامین بھی ملتے ہیں جو ضرورت سے زیادہ تشنہ اور مختصر ہیں۔

اب تک ان کے یہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں سنگ و خشت، چنگ ورباب، نوک نشتر، بستہ بدست، شیشہ و تیشہ اور بال و پر۔

اختتام

ہر زندہ زبان کی طرح اردو کا بھی یہ نمایاں جوہر دورِ اول سے رہا ہے
کہ اپنے سماج اور ماحول کی ترجمانی کرے یہ اور بات ہے کہ سماج اور ماحول اچھا
نہ رہا ہو، لیکن زبان نے ان خیالات کی عکاسی بڑی صداقت سے کی کوئی
دَور ایسا مشکل ہی سے ملے گا جس میں اردو نے اپنا یہ فرض ادا نہ کیا ہو یہاں تک
کہ آخر میں جب انگریزی حکومت کے بیجا تعصب سے ملک کو آزاد ہونے کا احساس
ہوا اور بڑی سے بڑی قربانی کی ضرورت پڑی تب بھی اردو نے آگے بڑھ کر حسبِ
حیثیت مردانہ وار قوم و ملک کی مدد کی۔ آزادی کی تحریک کی ابتدا سے انتہا
تک سیاسی رہنماؤں کے ہمدوش چلتی رہی کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا جہاں اردو
کی نظمیں دلوں کو گرمانے کے لئے نہ پڑھی جاتی رہی ہوں۔ جیل سے بھی شعرا ایسا
پیام بھیجتے رہتے۔ جیل کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رہی غالباً ہندوستان
کی کسی زبان نے قوم و ملک کا اس معرکہ میں اتنا ساتھ نہ دیا ہوگا جتنا اردو
نے وہ اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان

کو آزادی نصیب ہوگئی خیال ہوا کہ جس دن سے آنا سا تھا۔ یکہ اتنی محنت کے بعد
ہندوستان کو اس منزل مقصود پر پہنچایا ہے اس کو ہندوستان بھی، دوروں کے
ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش کرے گا یا کم سے کم ایسی خدمت گذار و وفاشعار
اور قابل قدر زبان کو آزاد ملک اگر کچھ دے گا نہیں تو اس سے کچھ چھینے گا
بھی نہیں، مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

جس آزادی کا صدیوں سے انتظار تھا اس کی شروعات عجب انداز سے
ہوئی۔ برِّ اعظم صغیر کے تقسیم ہونے پر مسلم لیگ اور کانگریس دونوں متفق تھیں۔
ان کی رضامندی سے ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوا خیال یہ تھا کہ فریقین
کی رضامندی امن و سکون کی ذمہ دار ہے، مگر نتیجہ بالکل برعکس ہوا جس آزادی
کا خیر مقدم کشت و خون سے ہوا جس کو جہاں موقع ملا مار کاٹ سے باز نہ آیا اور
فرقہ وارانہ فساد کی آگ ہر طرف لگ گئی۔ بربریت پوری فضا میں چھا گئی، وہ
دن پڑا کہ رمس سمرا گئی۔ گویا سکون دنیا سے اٹھ گیا سیاسی رہنما بھی اپنے
کو بے بس پانے لگے ایسی حالت میں ادبی رہنماؤں نے زبان و قلم سے وہ
کام لیا جو زبان تیغ سے نہ ہو سکا تھا۔ فوج اور پولیس حسب خواہش سکون قائم
نہ کر سکیں اردو کے ادیبوں نے نظم و نثر سے لوگوں کو خانہ جنگی کے نقصانات
اور صلح و سکون کے فوائد کا رازہ انداز میں اس طرح سمجھائے کہ ذہنیتیں بدلنے
لگیں۔ افسانوں اور نظموں کے ذریعے دلکش طریقے پر عوام کو متاثر کیا انسانیت
کی عظمت اور کشت و خون کی بھیانک شکلیں نظروں کے سامنے آگئیں۔ غرضیکہ
لوگ ہوش میں آئے بربریت سے ہاتھ کھینچا۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ فرقہ وارانہ
فساد تمام تر ادب سے ختم ہوا بلکہ کہنا یہ ہے کہ سماج کو راہ راست پر لانے میں
اردو شعراء و نثر نگاروں کا بڑا ہاتھ تھا۔ ادیبوں نے سمجھ لیا تھا کہ ادب کے

دو رینے سے ملک و قوم کی خدمت فرض اولیں ہے لیکن اس خدمت کا صلہ اردو زبان کو جو ملا وہ ایک تاریخی حادثہ ہے

آزادی نصیب ہوتے ہی اردو کی مخالفت ہندوستان میں شروع ہو گئی کبھی اس کو بیرونی بتایا گیا کبھی غیر آریائی کہہ کر جلا وطن کرنے کی کوشش کی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دوستی کے پردے میں اس کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی دعویٰ یہ کیا گیا کہ ہندی اور اردو الگ چیزیں نہیں گرامر کے لحاظ سے ایک ہی چیزیں ہیں صرف رسم الخط کا فرق ہے اور چونکہ رسم الخط ناگری کا مکمل اور رفتار زمانہ سے بھی ہم آہنگ ہے اس لئے اردو رسم الخط کو چھوڑ کر ہندی رسم الخط اختیار کر لینا چاہیئے اور جو الفاظ عربی کے اردو میں آ گئے ہیں ان کو نکال دینا چاہیئے اس لئے کہ وہ غیر آریائی ہیں غرضکہ اس طرح سے اردو کی بیخ کنی ہونے لگی۔ یہ توسب زبانی گفتگو تھی ان خیالات کو عمل میں اس طرح لایا گیا کہ دفتروں، عدالتوں سے بہ یک جنبش قلم اس کو نکال دیا گیا اسکول اور کالج میں جہاں جہاں اردو رائج تھی منتظمین نے موقع پا کر اردو ختم کر دی پڑھانے والے بیکار ہو گئے۔ ابتدائی مدرسوں میں اردو پڑھانے کا وہ انتظام نہ رہا جو کہ آزادی سے پہلے تھا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکوں کی تعداد بڑی تیزی سے گھٹ گئی۔ اس کے علاوہ نصاب تعلیم میں بھی کچھ ایسا التزام کیا گیا کہ جو لڑکے اردو لینے پر آمادہ ہوتے تھے ان کو آسانی سے اردو نہ مل سکی۔ مثلاً یہ شرط کہ اگر کوئی لڑکا اردو لے تو انگریزی نہیں لے سکتا اور مختلف موضوعات کے ساتھ اردو کی تعلیم اسکول اور کالجوں میں ناممکن ہو گئی غرضکہ کچھ ایسی قیود لگا دی گئیں کہ بہت کم طلبا اردو لے سکے چنانچہ اسکول اور کالجوں میں اردو پڑھنے والے طلبا کی تعداد ناگفتہ بہ ہو گئی۔

ہندوستان کے دستور العمل میں ۱۴ زبانوں کو ہندوستان کی زبان تسلیم کیا گیا ہے
منجملہ ان کے اردو بھی ایک زبان مانی گئی لیکن حیرت و افسوس یہ ہے کہ اس زبان
کو نہ عملاً علاقائی زبان کا درجہ دیا گیا اور نہ اس کا کوئی علاقہ بتایا گیا دستور العمل
کی کاغذی کارروائی اشک شوئی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اس کو علاقائی
درجہ دلانے کے لئے اردو والوں نے رات دن ایک کرکے اکیس لاکھ سے
زیادہ ایسے لوگوں کے دستخط معہ سکونت وغیرہ کے فراہم کئے جن کی مادری زبان
اردو تھی ایسے دستخط کرنے والوں میں ہندو مسلمان سبھی تھے۔ سب کاغذات
لیکر ایک وفد باقاعدہ صدر حکومت جمہوریہ ہند کی خدمت میں حاضر ہوا ان
کو واقعات سمجھائے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا مگر سال بھر سے زیادہ ہوا ابھی
تک حکومت نے کوئی جواب نہیں دیا اس طویل خاموشی کے درمیان یہاں اس
کمیشن کی بھی رپورٹ شائع ہوئی جو لسانی بنیاد پر صوبوں کو از سر نو ترتیب دینے
کے لئے حکومت ہند نے مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن نے بعض صوبوں میں دو دو زبانیں
بھی رکھنے کی سفارش کی ہے مگر اردو کے لئے اس نے بھی کوئی جگہ متعین نہیں
کی۔ گویا اردو ہندوستان میں نہ کہیں بولی جاتی ہے اور نہ کسی علاقہ کی مادری
زبان ہے۔ یہ سب قید و بند اس زبان پر ہے جس نے آزادی کی جنگ میں
اپنا تن من دھن سب کچھ لگا دیا تھا۔ ان تمام تشدد اور حق تلفیوں کا انجام
یہ ہے کہ ہندوستان میں اردو حکومت کی سرپرستی سے محروم ہے بلکہ بے اعتنائیوں
کا شکار ہے حکومت کا یہ رویہ اردو کے لئے تکلیف دہ ہے یہ اور بات ہے
کہ اردو کے لکھنے پڑھنے والے اس سے بے انتہا محبت کرتے ہیں اس کے حقوق
کا مطالبہ برابر کئے جاتے ہیں۔ اس کی اشاعت کے لئے پہلے سے زیادہ مستعد
ہیں۔ اس میں آج بھی ہونہار شعراء و نثر نگار پیدا ہو رہے ہیں لیکن مستقل خطرے

سے خالی نہیں جب ابتدائی و ثانوی تعلیمات سے وہ محروم رہیں گے تو اسفرادی حیثیت سے کب تک اس کا وقار قائم رہے گا اس کی جڑ پر کلہاڑی رکھدی گئی ہے تو اس کی سرسبزی کا خدا حافظ

باوجود ان بے عنوانیوں کے اردو ادب بھی فرض شناسی سے کام لے رہی ہے۔ اس کے ادیب ملک کی بیکاری و بدکاری سے حکومت اور سماج کو آگاہ کئے جا رہے ہیں ملک کی بہتری کے لئے راستے بنائے جاتے ہیں نثر و نظم دونوں کے ذریعے سے مختلف خرابیوں کو ارباب حل و عقد کے سامنے نمایاں سے پیش کئے جاتے ہیں انسانیت کی بلندی کی برابر فکریں کئے جاتے ہیں بلکہ اب تو ان کا ایک نمایاں رجحان یہ بھی ہو چلا ہے کہ جس کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ۔

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

حقیقی ادیب اور سچے شاعر کی طرح دنیا کے کسی گوشے میں تباہی یا ہلاکت کے آثار دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں ظالم کی مذمت اور مظلوم کی حمایت میں برابر کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں کوریا، عراق، ایران، مصر، جہاں کہیں بھی جنگ یا جارحانہ کارروائی دیکھتے ہیں ایسے طور پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ گویا ان کی محبت کا شعور بلند ہو رہا ہے۔ ہمیشہ سے زیادہ وسیع النظری بڑھ رہی ہے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی تیاری میں وہ ساری دنیا کو خطرہ میں تصور کر کے اس کی ہلاکتیں اور جنگ کی خرابیاں اور تباہ کاریوں کی روک تھام کی برابر فکر کر رہے ہیں بے شمار نظمیں اور رسالے اس بات کی تائید ہیں

پاکستان میں بھی اردو کو وہ سرپرستی نہ حاصل ہو سکی جس کی امید تھی انفرادی و ذاتی حیثیت سے جو کچھ اس سلسلے میں ہو رہا ہے وہ قابل اطمینان تو نہیں غنیمت ہے وہاں کے بھی شعراء اور نثر نگار ایسے طور پر اردو ادب کی اشاعت کی فکر کرتے

ہیں مختلف ادارے اس کو آگے بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں ادب کو دولتمند
و ہمہ گیر بنانے کا خیال ان کو بھی ہے اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی خدمات
بڑی دقیق و قابل قدر ہیں وہ اسی دھن میں رات دن ایک کئے ہوئے ہیں تن
من دھن سب کچھ اردو کی نذر کر چکے ہیں لیکن حکومت حسب خواہش امداد سے دریغ
کرتی ہے اس نے کبھی کوئی سرکاری کمیشن ایسا مقرر نہیں کیا جو تمام ملک میں دورہ
کرکے مختلف زبانوں کا جائزہ لے اردو کو مالدار بنانے کی فکر کرے کوئی انجمن
ابھی تک ایسی نہیں بنی جو غیر زبانوں کی اصطلاحات کا مترادف بنائے یا ترجمہ
کرے، نہ طریقہ تعلیم کو اردو زبان رائج کرنے کا خیال ہوا، سابق یہ سب باتیں اور
ان کے علاوہ بہت سی اور باتیں حکومت کے سامنے آئیں اردو کو ترقی دینے کے
لئے مختلف انجمنیں بنائی جائیں جو غور کریں کہ اردو کو مکمل زبان کے مراتب عطا کرنے
کے لئے کن مسائل کا حل کرنا ضروری ہے

پاکستان ایک نئی حکومت ہے اس کے مختلف حصوں میں مختلف زبانوں
کے بولنے والے بستے ہیں اب وہ ایک ہی حکومت میں ایک کئے جا رہے ہیں لیکن تہذیب
اور زبان کا فرق امتیازی حیثیت رکھتا ہے اپنی مادری زبان کے محاورے
کہاوتیں لوگ اردو میں شامل کرتے جاتے ہیں مگر اردو ابتدائے آفرینش سے
ان باتوں کی عادی ہے اس کا خمیر اپنے ہی اجزا سے بنا ہے لیکن اب چونکہ
صدیوں کے بعد اردو ادب کا سانچہ مکمل ہو چکا ہے وہ آنے والے اجزا کو اپنے
طور پر تراش خراش کر ادب میں جگہ دے گا۔ ایسے معیار سے آنے والے ذخیرے
کو دیکھے گا لیکن پھر بھی اندیشہ ہے۔ کچھ دن تک معیاری ادب کو بے راہ روی
محسوس ہوگی نئے الفاظ، نئے انداز بیان کو ایک عرصہ لگے گا کہ وہ مانوس ہوں
اور ان کو ادب میں جگہ مل سکے

دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول نے اپنے وقت میں محکمہ احتساب کا بھی کام
کیا۔ زبان کو ایک راستے پر لگانے میں ان دونوں اسکولوں نے بڑی بالغ نظری
اور دور اندیشی سے کام کیا تھا مستند ادیبوں کی رائے اور کلام کی سند کے
بغیر الفاظ و محاورات کا ادب میں جگہ پانا ناممکن تھا اس کا ایک نتیجہ یہ بھی
بہت عمدہ ہوا کہ اپنی ڈفلی اپنا راگ نہ ہونے پایا۔ ادب کے لئے ایک شاہراہ
ہو گئی قلیل عرصہ میں اردو کی ایک ایسی صورت نکل آئی جس کو ہمہ گیری حاصل
ہوئی ادبی اختلافات باعث نزاع نہ ہو سکے لیکن اب پاکستان میں کوئی اس
قسم کا اسکول نظر نہیں آتا اردو کے مزاج کے لحاظ سے حکومت کو چاہیئے کہ
مستند ادیبوں کا ایک ایسا بورڈ بنائے جو آنے والے الفاظ و محاورات کی جانچ
پر نظر رکھ کر ادب میں ان کو داخل کرے لسانی اصول و عوامی پسندیدگی
کا خاص خیال رکھے۔ ابھی تک حکومت نے اس طرف بھی توجہ نہیں کی اور
نہ دفتروں میں اردو کو وہ جگہ ملی جو ہندوستان میں ہندی کو مل گئی ہے خدا
کرے دستور العمل بن جانے کے بعد ارباب حل و عقد کو اردو زبان کی ترقی و ترویج
بھی قومی ترقی کے لئے ضروری محسوس ہو